عورت جنس کے آئینے میں

سلیم اختر

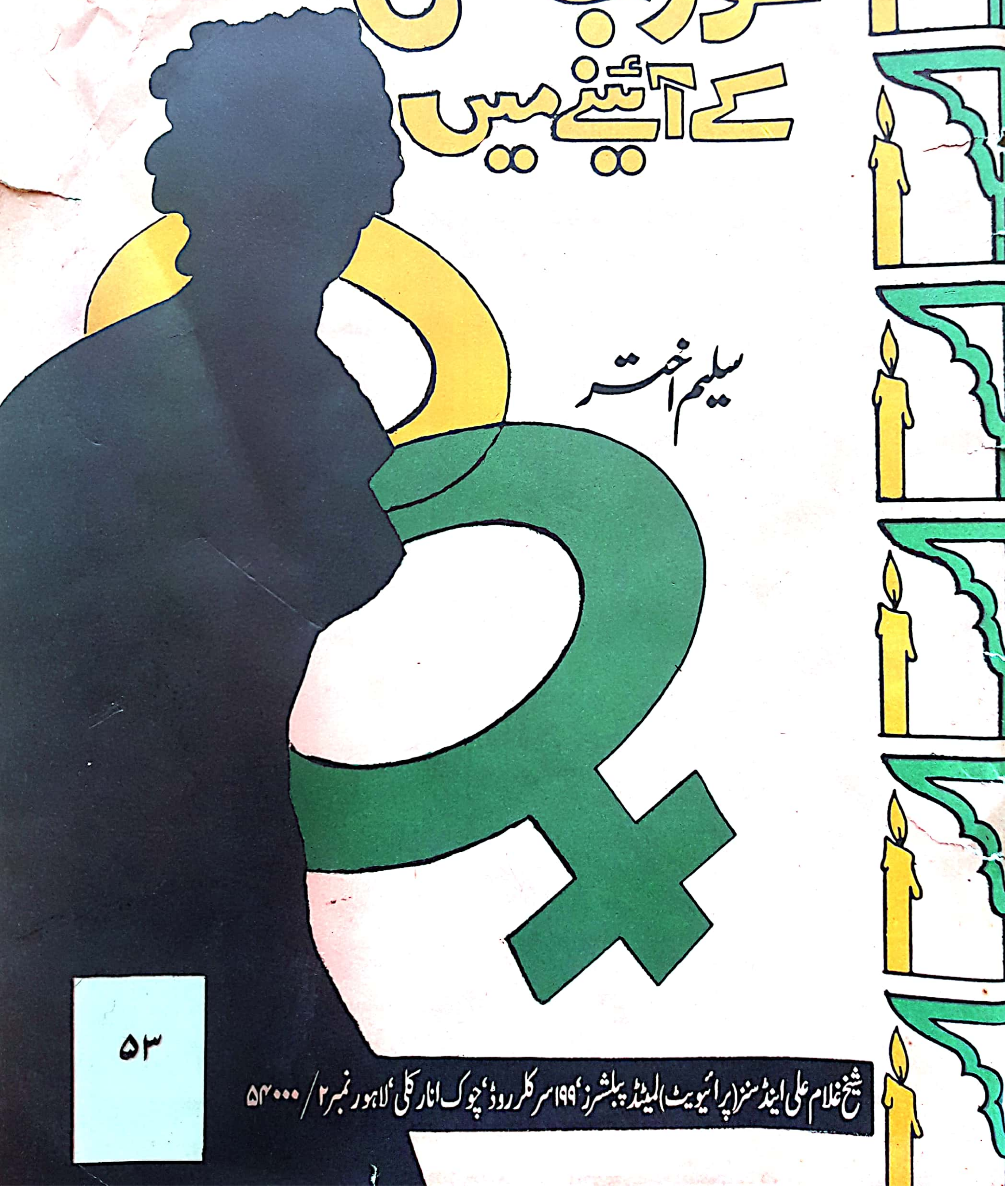

۵۳

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز، ۱۹۹ سرکلر روڈ، چوک انار کلی، لاہور نمبر ۲ / ۵۴۰۰۰

دنیا کی ہر قومی اور علاقائی زبان
کی روشن کتابوں کا انتخاب

نگران : شیخ نیاز احمد
مدیر مسئول : اسد نیاز
مدیر : محمد طاہر معراج

مجلس مشاورت :
اے حمید۔ ایم ایس نازؒ
محمد حنیف شاہد۔ عینکاف خالدؒ

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : غلام علی پرنٹرز' اشرفیہ پارک
فیروز پور روڈ' لاہور

مقام اشاعت

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز
۱۹۹۔ سرکلر روڈ' چوک انارکلی' لاہور ۵۴۰۰۰ (پاکستان)
پی او بکس نمبر 528

PHONE NO : 7352908- 7323951
FAX : 92- 42- 7583611
TELEX : 44422 ASIA PK

کتاب مین (KITABMAN) لاہور
ISBN- 969- 31- 0293- 2
CODE NO : 52- 11- 14

عورت جنس کے آئینے میں

اس سے پیشتر آپ "مرد جنس کے آئینے میں" ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ "عورت جنس کے آئینے میں" اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے جو سلیم اختر صاحب کی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ انہوں نے جنس کے موضوع پر مغربی ماہرین کے بیش قیمت مضامین کو ایک لڑی میں اس طرح پرو دیا ہے کہ انھیں داد دیتے ہی بن پڑتی ہے۔ یوں بھی ہمارے ہاں اس موضوع پر کتب تقریباً ناپید ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں ان گنت جنسی الجھنیں پائی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے سلیم اختر صاحب نے ایک بہت ہی اہم ذمے داری سنبھالی ہے۔

زیر نظر کتاب میں ہیلن ڈوئچ' مارگریٹ میڈ اور آسولڈ شواز جیسی مغربی ماہرین کے مضامین شامل ہیں اور ان مضامین میں عورت کے آغاز سے لے کر ماں بننے تک کے مسائل محیط ہو کر رہ گئے ہیں جن سے عام قارئین باسانی استفادہ کر سکتے ہیں اور اپنی الجھنوں کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین اس سلسلے کی پہلی کتاب کی طرح اسے بھی پسند فرمائیں گے۔

جہاں تک ترجمے اور زبان کا تعلق ہے' یہ بات آپ سے مخفی نہیں ہو گی کہ سلیم اختر صاحب اردو ادب کے معروف پروفیسر بھی ہیں' لہٰذا ترجمے کے معیار پر بات کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہو گا اور ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔

لاتعداد ذہنی اور جسمانی الجھنوں میں گھرے لوگوں کے لئے یہ کتاب جس اہمیت کی حامل ثابت ہو گی' اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ہم اپنے قارئین سے ملتمس ہیں کہ پڑھنے کے بعد اپنی قیمتی آراء سے بھی نوازیں تاکہ ہم آپ کی خواہشات کے آئینے میں آئندہ اقدام اٹھاتے رہیں۔

یہ تو تھی "عورت جنس کے آئینے میں" کی بات۔۔۔ اس کے ساتھ آپ اردو نثر کی داستان کی اگلی قسط بھی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

نیاز احمد

روشن کتابیں گھر پہنچانے کے عظیم منصوبے کے تحت

ایک منفرد کتاب

عورت جنس کے آئینے میں

سلیم اختر

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

ہیلن ڈوئش

عورت شباب کی دہلیز پر!

فرائیڈ نے اپنی کتاب THREE CONTRIBUTIONS TO THE THEORY OF SIX میں سب سے پہلے تحلیل نفسی کے بنیادی اصولوں کو پیش کیا تھا۔ اس نے طویل عرصہ تک بالغ نیوراتیوں کے علاج کے دوران جن متنوع نتائج اور مشاہدات سے بچپن میں جنسی نشوونما کے قواعد مستخرج کئے۔ بعد میں جب دوسرے ممالک میں بچوں کا بلاواسطہ مشاہدہ کیا گیا۔ تو اس سے نہ صرف فرائیڈ کے نظریات ہی کی توثیق ہو گئی۔ بلکہ یوں بچوں کی نفسیات کے بارے میں جو بصیرت حاصل ہوئی وہ فرائیڈ کے اصل کام سے کہیں زیادہ ہے۔

موجودہ تحقیقات کی روشنی میں اب فرائیڈ کے اس نظریے میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جنسی نشوونما کا پہلا دور جسے وہ قبل تناسلی سے تعبیر کرتا ہے لڑکے اور لڑکی میں یکساں ہوتا ہے۔ قبل تناسلی میں "دہنی اور مبرزی" ادوار آتے ہیں۔ یہ شک ہے کہ ہر دو دور میں دونوں جنسوں سے تعلق رکھنے والے بچے لذت تسکین حاصل کرتے ہیں۔ ان جبلتوں کے عضوی ماخذات اور جبلی تسکین والے گروہوں کا مرکز بھی لڑکے اور لڑکی کے لئے ایک ہستی یعنی ماں ہوتی ہے

لیکن ان ظاہری مماثلتوں کے باوجود بھی غیر جانبدارانہ مشاہدہ سے جنسی اختلافات نظر آتے ہیں۔ یہ جنسی اختلافات "مخنثی" دور میں نکتہ عروج کو پہنچ جاتے ہیں۔ گو بچے اس سے قبل بھی جنس کے عضوی اختلافات سے باخبر ہوتے ہیں۔ مگر مخنثی دور میں یہ بہت زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس وقت کم عمر کے لڑکے اپنے عضو تناسل پر فخر اور غرور کرتے ہیں۔ اپنے اس کے مستقبل کے بارے میں تشویش رہتی ہے وہ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں سے موازنہ کرتے ہیں۔ عمر کے اسی دور میں اس کی تمام دلچسپیوں کا واحد مرکز یہی ہوتا ہے۔ لڑکی کی دلچسپیاں بھی اسی مرکز کے گرد گردش کناں ہوتی ہیں۔ مگر اس کے پاس فخر اور غرور والی وہ چیز نہیں۔ اس لئے وہ حسد کرتی ہے۔ عضو مخصوص کا فقدان اور اس سے وابستہ خوف کا نئے بچے میں مماثل ردعمل پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے

دونوں جنسوں میں تناسلی اعضاء سے متعلق ردعمل کے لئے عموماً خوجگی "المجاز" کی اصطلاح لائی جاتی ہے۔

فرائیڈ کے زیر اثر اب تک نامعلوم وجوہات پر ہی تمام توجہ مرکوز کی جاتی تھی۔ لیکن اس کے مقابلے میں اب بچے کی انانی تشویشات و دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں بچوں کے جنسی اختلافات پر زور دینے کا قابل توجیہ رجحان عام ہے۔ موجودہ دور میں طفلانہ نفسیات کی علمی دلچسپی کے باعث اپنے ماحول اور گردو پیش سے بچے کی مطابقت کے انداز کا مطالعہ بھی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی ذہانت اور اس کی ذہانت اور ہیجانات کی نشوونما پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ہمیں تحلیل نفسی کا مرہون منت ہونا چاہیئے جس کے انکشافات سے نفسیاتی نشوونما میں بظاہر غیر جنسی معلوم ہونے والے مراحل کی جنسی ساخت کو سمجھا اب ممکن ہو چکا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ بچہ کا جنسی تجسس "لنگی دور" میں اپنی انتہا کو پہنچا ہوتا ہے۔ اس تجسس کا اولین اظہار جنسوں کے اختلاف سے دلچسپی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ بعد میں یہ عمومی قسم کے تجسس کی صورت میں اختیار کر لیتا ہے۔ یہ دلچسپی اور تجسس، جو بلحاظ آغاز خاص ہوتا ہے۔ دور اخفاء میں ارتقائی مدارج طے کرتا جاتا ہے۔

پختہ کار انسانوں کی بہت سی سماجی اور ذہنی قوتوں کی بنیاد بھی انہی جبلتوں پر استوار ہوتی ہے۔ حقیقت سے مطابقت کا عمل تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ جو دور اخفاء کے اختتام یا قبل بلوغت کے دور میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

ہمیں یہ معلوم ہے کہ دور اخفاء میں بچہ کا جنسی محرکات سے نجات پانا محض افسانہ ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ تسلیم کرنے میں اب کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ اس کے بیشتر دور طفلی میں صرف جنسی نشوونما ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ماحول سے زندہ مطابقت اور اسے تسخیر کرنے کا جذبہ وغیرہ بھی ملتا ہے۔ الغرض بچے میں ابتداء سے ہی جنسی محرک کے ساتھ ساتھ دیگر محرکات بھی ملتے ہیں۔ دور اخفاء میں بچہ کی جنسی دلچسپی قدرے دب سی جاتی ہے لیکن وہ بالکل ختم نہیں ہوتی۔ کمزور جنسیت کے اس دور میں بچہ کی تمام مخفی قوتیں اور محرکات بلا رکاوٹ انا کی نشوونما کے لئے استعمال کی جا سکتے ہیں۔

تعلیم و تربیت کی صورت میں بچہ کی انا کو طفلانہ جبلی قوتوں کے شکنجہ سے آزاد ہونے کی جدوجہد میں بہت بڑی امداد دی جا سکتی ہے۔ اس سے اس میں ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کر کے اسے سماجی دائرہ میں لایا جا سکتا ہے اس وقت تک کنبہ کے افراد سے بچے کے تعلقات بھی جنسیت سے آزاد ہو چکے ہوتے ہیں۔ شہوانی احتیاجات کی جگہ نرمی جذبات اور طفلانہ جارحیت کی جگہ کارکردگی لے لیتی ہے۔

اساسی لحاظ سے تحلیل نفسی ارتقائی نظریہ ہے حتیٰ کہ عمل نشوونما میں "دھچکوں" کے تذکرہ سے بھی کم و بیش اس ارتقائی عمل کی انقلابی شدت مراد ہوتی ہے۔ پس جو وقت کو نفسیاتی انقلاب سے موسوم کرنے میں ہم اس حقیقت سے باخبر ہوتے ہیں۔ کہ یہ گذشتہ ارتقائی مدارج سے آگے لے جانے والا ایک اور "دھچکا" ہوتا ہے۔ بلکہ اب تو بلوغت کو طفلانہ دور کی "طبع نو" کہنا بھی فرسودہ اور پامال ہو چکا ہے۔ بلوغت کا جائزہ نئی بات نہیں لیکن بلوغت کے لئے تیار کرنے والے دور یعنی قبل بلوغت پر خصوصی توجہ نہیں دی گئی۔

حالانکہ قبل بلوغت کی کارکردگی پر مکمل بلوغت کا انحصار ہوتا ہے۔ کیونکہ قبل بلوغت میں تمام شخصیت پر آنے والے انقلاب کی کیفیت مکمل طور سے طاری رہتی ہے۔

مجھے اس موقع پر یہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ میرا سارا مواد بلاواسطہ ذاتی مشاہدہ کا نتیجہ نہیں۔ میرے مواد کے چار ماخذات میں اول، وہ خواتین جو تحلیل نفسی کے لئے میرے زیر علاج رہیں جن میں نے ان کا مشاہدہ کیا اور ان کا طرز عمل صرف قبل بلوغت کی روشنی ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ دوم۔ بہت سی نوجوان لڑکیاں جو مختلف نفسی معالجین کے پاس اس لئے بغرض مشورہ گئیں کہ وہ اپنے مخصوص سماجی حالات سے مطابقت میں دقت محسوس کرتی تھیں۔

ایسے حالات جوان سے آزاد اور زیادہ تر ہونے کا مطالبہ کرتے تھے۔ عموماً تو یہ شعوری کشمکش اور بے چارگی کے احساس کی بناء پر نفسی معالج کی طرف رجوع کرتی تھیں۔ لیکن لیکن بسا اوقات یہ محض تشویشی رجحانات یا کام نہ کر سکنے کے باعث بھی مشورہ کی طالب ہوتی تھیں۔ مختصر نفسی معالج میں سب سے پہلے میں بلوغت اور قبل بلوغت کے بارے میں مریضہ سے مفصل معلومات حاصل کرتی

لے "جبلت" اور جنس کے بارے میں جو الجھن اور علمی تنازعات برپا ہیں۔ مجھے ان کا احساس ہے۔ لیکن جب تک ان سے بہتر اصطلاحات وضع نہ کر لی جائیں میں انہیں استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔ اسی موقع پر ان اصطلاحات کو بیچ کی تمنا یا تناسلی لذت کے لئے ایک ایسا ہی ہے تو اس کے غذائی، اخراجی اور دیگر حیاتیاتی وظائف کا مرہون منت اور یا ان سے متعلق ہوتی ہے۔

جبلت اور جبل" کے استعمال کا مطلب دیگر اہم جبلتوں کے وجود سے ہرگز انکار نہیں ہے۔

ہوں۔ سوم — ان دو کے علاوہ شفاخانوں میں کئے گئے بلاواسطہ مشاہدات کے ساتھ ساتھ ان بے شمار لڑکیوں کے مکمل حالات اور مریضانہ کوائف بھی موجود ہیں جنہوں نے قبل بلوغت میں جسمانی عوارض یا تعلیمی مشکلات محسوس کیں۔ بعض اوقات صحت مند عوامل کے مرضیاتی مظاہر سے بھی اندازہ لگایا جاتا ہے اور چہارم — گو لوگ اسے عموماً درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادب میں ایک فن کار محض اپنے وجدان کی بنا پر اس کیفیت کی مکمل اور صحیح تصویر پیش کر دیتا ہے جسے ہم لوگ غیر جانبدارانہ مشاہدات سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بڑی مشکلوں سے مکمل کر پاتے ہیں۔

قبل بلوغت سے میری مراد دورِ اخفار کا وہ آخری مرحلہ ہے۔ جس میں گو مستقبل کی جنسی تحریکات کی خبر دینے والے کچھ آثار تو دیکھے جا سکتے ہوں جو زیادہ تر طفلانہ جنسیت سے آزادی کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس وقت جنسی جبلتیں کمزور تر ہوتی ہیں۔ جب کہ انائی نشوونما شدید ترین ہوتی ہے۔ میری یہ تعریف دوسرے مصنفین کی تعریفوں کے عین مطابق نہیں۔ کیونکہ باقی سب کے نزدیک قبل بلوغت کی شدید جنسی اشتہاجات بلوغت کا نقطۂ آغاز ثابت ہوتی ہیں۔ مجھے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے اتنا ہی کہنا ہے کہ جنسیت میں اضافے کو ہم اوائل بلوغت کے ثانوی دور سے متعلق کر سکتے ہیں میرا قبل بلوغت کو قبل انقلاب اس لئے سمجھتی ہوں کہ بلوغت میں جنسی کردار سے مقابلہ کے لئے جن قوتوں کو جمع کیا جاتا ہے وہ سبھی قبل بلوغت میں تیار ہوتی ہیں۔

اس لئے میرے خیال میں یہ دور جنسی تقاضوں سے آزاد ترین دور ہوتا ہے۔ اسی معاملہ میں انسان کی نفسی شخصیت ایک سمجھ دار حکومت کی مانند ہے۔ جو حملہ آوروں سے پہلے ہی اپنے آلات حرب تیار رکھتی ہے — اور اسی امر کی وضاحت مجھے کرنی ہے!

قبل بلوغت کا اگر میری تعریف کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے۔ تو اس کا تعین خاصہ مشکل ہو جائے گا کہ عمر کے کس مخصوص دور میں قبل بلوغت کا ظہور ہوتا ہے۔ مختلف مدارج ایک دوسرے میں مدغم ہوتے جاتے ہیں۔ ارتقا کے ایک دور کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہم ایک دور کو دوسرے سے خانہ بندی کی صورت میں بالکل ممیز نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی ابھی تک اس خامی سے چھٹکارا پانے کے لئے کچھ کیا جا سکا ہے۔ میرے خیال میں قبل بلوغت کو دس اور بارہ سال کی عمر کے درمیان رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ بلوغت میں اس کے مظاہر کافی دیر تک نفوذ کرتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے خود بلوغت کے آثار جنسی پختگی تک باقی رہ سکتے ہیں۔ بلکہ ہم کبھی آخر عمر تک طفلی، قبل بلوغت اور بلوغت پر مبنی رجحانات رکھتے ہیں۔ فرق صرف ان کی شدت اور گہرائی کا ہوتا ہے۔

نقطۂ آغاز کے طور پر ہم جسمانی نشوونما کو لے سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ کو سہل کر دے گی۔ کیوں کہ اس دور کی تمام نفسیاتی نشوونما کا انحصار جسمانی نشوونما پر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم قبل بلوغت اور بلوغت کے درمیان حد فاصل کے طور پر حیض کو استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ کشمکش بلوغت کی کلید حیض ہی ثابت ہوتا ہے۔ اور نوجوان لڑکی کی نفسیات میں اسے بے حد اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ہمارا مشاہدہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جسمانی اور ذہنی وقوعات کے درمیان موزوں خط امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔ ایسی لڑکیاں ملتی ہیں۔ جو ذہنی بلوغت سے قبل ہی آغاز حیض سے جسمانی لحاظ سے بالغ ہو جاتی ہیں۔ اور پھر ایسی لڑکیوں کی بھی کمی نہیں جو جسمانی بلوغت کے شواہد کی عدم موجودگی میں ذہنی بلوغت اختیار کر لیتی ہیں۔ کچھ یہی حال جنسی پختگی کا ہے۔ پژمردہ اور مرجھائی ہوئی بوڑھی عورتوں کو حیض آتا رہتا ہے۔ اور اختتام حیض سے جنسی پختگی کو پہنچ جانے والی چاک و چوبند اور تنومند خواتین بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔

اگر ہمارے خیالات کی روشنی میں قبل بلوغت کا جائزہ لیا جائے۔ تو لڑکیوں میں کون کون سی مخصوص کیفیات ملیں گی؟

فرائڈ کی مانند ہم سب نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ نوجوان لڑکی کے عورت بننے کے عمل کا افتتاح مفعولیت میں اچانک اضافے سے ہوتا ہے۔

۱۹۲۵ء میں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ کہ مفعولیت میں اضافے سے قبل ایک ایسا وقت آتا ہے جب لڑکی میں جوش کا شدید رجحان ملتا ہے۔ اور میرے خیال میں یہ جوش ہی قبل بلوغت کی اہم خصوصیت ہے۔ اس معاملہ میں لڑکے بھی لڑکیوں ایسے ہوتے ہیں۔ لڑکے میں بھی دورِ اخفار کا آخری وقت جوش اور جارحیت سے بھرا ہوتا ہے۔ البتہ لڑکے اور لڑکی میں اس کا اظہار جداگانہ انداز سے ہوتا ہے۔ اسی لئے لڑکیوں کی قبل بلوغت ایک مخصوص صورت اختیار کر جاتی ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اس جوش سے جارحیت ہی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت سے مطابقت کے عمل میں شدت اور تیزی کے باعث ترقی پذیر لڑکی کے لئے ماحول پر قابو ممکن ہو جاتا ہے۔

ویسے اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ یہ جوش اور جارحیت لڑکی کی جنسی زندگی کے مستقبل کے لئے خطرہ کا سرخ نشان بن سکتے ہیں، کیوں کہ ان کی شدت سے اس کی مفعولیت متاثر ہوتی ہے۔

قبل بلوغت کا یہ جوش بچہ کی ذہنی اور فنکارانہ صلاحیتوں کے لئے مہمیز کا کام کرتے ہوئے اس کی آرزؤں اور مقاصد حیات میں رفعت پیدا کر کے تخلیق کے نئے نئے رجحانات کی تشکیل کا باعث بنتا ہے۔ اس تمام جوش کا ماخذ ان کا وہ خلقی رجحان ہے جس کے تحت وہ نمو اور خود مختاری کے لئے سعیٔ کناں رہتی ہے۔ عہد طفل سے ہی ہر بالک فرد میں بڑے ہو کر کچھ کر دکھانے کا جذبہ ملتا ہے۔ یہ جذبہ قبل بلوغت میں اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ جب گیارہ سالہ لڑکی ماضی اور حال کے درمیان، بچپن اور بلوغت کے مابین ایک جہان نو کی تشکیل کے لئے کوشاں ہوتی ہے۔ اسی زمانہ میں بچپن کے بندھن ایک ایک کر کے ٹوٹتے ہیں اور وہ خود کو زندگی کی نئی نئی ذمہ داریوں اور خود مختاریوں کے لئے تیار کرتی ہے۔

شاہراہ حیات پر گامزن لڑکی کے لئے طفلانہ قانونوں ... سے قطع تعلق بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے حصول میں افراد سے تعلقات کی نئی صورت کی ... ہے۔ گویا افراد کی صورت میں وہ اپنی محبت اور نفرت کے لئے نئے نئے مراکز ڈھونڈتی ہے اور یوں اسے تخلیق میں آسانی رہتی ہے۔ وہ ایک بالغ کی حیثیت سے اپنی ہستی منوانے کے لئے سرتوڑ کوشش کرتی ہے۔

اس مقصد کے لئے اس کی جدوجہد بہت شدید اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ وہ عدم تحفظ کے احساس اور حفاظت کی خواہش کے باعث لاشعوری طور سے ابھی تک بچی رہنے کی متمنی ہوتی ہے۔

پس نوجوان لڑکی ماحول اور گرد و پیش کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتی ہے۔ اس جنگ میں اس کا سب سے بڑا اور اہم ہتھیار مطابقت کے لئے سعی ہوتا ہے ... سے وہ حقیقت کے موڑ سے آشنا ہوتی ہے۔ یہ بھی قبل بلوغت کی ایک اور خصوصیت ہے اور جوش سے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔

ماحول سے جنگ آزما ہونے سے قبل کہ جن تک ان کا تعویت با ہمدردی سے لیکن یہ بھی درست ہے کہ ماحول پر حاوی ہونے کے لئے جوش اور سعی بھی ان کو ذہنی ہونے میں امداد دیتے ہیں۔ جب سے بچی ... بالغانہ انداز و اطوار کے قریب تر پہنچ جاتی ہے۔ اس نفسیاتی رشتہ کے ساتھ ساتھ جسمانی تبدیلیاں بھی ملتی ہیں۔

عضلاتی کارکردگی کے لئے ایک خاص حد تک عضلاتی نشوونما اور رفتار کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سے توانائی بڑھتی ہے اور نشوونما میں اضافہ ہوتا ہے۔

قبل بلوغت ماحول سے جنگ آزما ہونے کے لئے کئی طرح کے ذرائع بروئے کار لاتی ہے بچی کے سماجی حالات، تعلیم اور سب سے بڑھ کر نفسیاتی کیفیات کے مطابق ان ذرائع میں بھی تبدیلیاں

ہوتی رہتی ہے۔ یہ رویے جب انتہائی کمزور شخصیت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ان میں انفرادی خصوصیات کا پیدا ہونا ضروری امر ہوتا ہے۔ ابتدائی بچپن کے واقعات، اولی اثرات بالخصوص ذہنی رجحانات — بالفاظ دیگر طاقت کے جسم اور دیگر فطرت کی تشکیل کرنے والے تمام عناصر باہم متحد ہو کر لڑکی کی نشوونما کو ایک انفرادی رنگ عطا کرتے ہیں۔ اس کی نشوونما کی ہیئت کا انحصار ثقافتی اور سماجی حالات پر ہوتا ہے۔

قبل بلوغت میں شخصیت کی تشکیل کا جائزہ لیتے وقت ہمیں بار بار تطبیق کی طرف آنا پڑتا ہے۔ بچی کی ذات جتنی زیادہ کمزور ہوگی وہ بالغوں کی دنیا سے مطابقت کی خاطر اتنا ہی زیادہ تطبیق کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی۔ اور نئی زمانہ عمل تطبیق پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدگی اختیار کر چکا ہے۔

ہم اکثر اوقات اس غلط فہمی کے شکار ہو جاتے ہیں کہ بچی جب ماں کی شخصیت سے تطبیق کرے تو اس میں نسائیت پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ پدرانہ تطبیق "مردانہ پن" کی باعث ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بچپن میں والدین اور بچے کے تعلقات میں بہت وسعت ہوتی ہے۔ اور ماں یا باپ کا یگانہ یا انفرادی تصور نہیں ملتا۔ ماں قابلِ الفت اور ماں قابلِ نفرت، ماں ایک مثالی ہستی ہے۔ اور ماں جنسی کارکردگی کی گندگی کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ایک ماں نے باپ کی زندگی تلخ کر دی۔ اور ایک ماں کی زندگی کو باپ نے داغ لگا دیا، وہ جو بچوں کو پیدا کر کے ان کا بوجھ اٹھاتی ہے اور وہ جو ان کی قاتلہ بنتی ہے ایک انہیں اپنے خون سے پرورش کرتی ہے۔ تو دوسری انہیں زہر دیتی ہے کبھی وہ حریف ہے تو کبھی تحفظ کی دیوی اور سب سے بڑی پناہ گاہ! اسی طرح لاتعداد اقسام کے باپ ہیں۔ جن سے تطبیق کے امکانات میں بہت وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

قبل بلوغت میں تطبیقی مقصود کے انتخاب میں ان ابتدائی حالات کا بہت گہرا ہاتھ ہوتا ہے۔ والدین کے لئے اپنے ڈانواں ڈول احساسات کی کشمکش سے چھٹکارا پانے کے لئے بچی کے منتخب کئے گئے طریق کار کی دلچسپی کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اس امر کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بچی کے لئے پسندیدہ ہستی سے تطبیق ممکن بھی ہے کہ اس کی جارحانہ خواہشات کی شدت یا مجرمانہ احساسات اسے اذیت کوش، مسرت رساں، اور تعزیراتی بلکہ مردہ اشیاء سے تطبیق پر مجبور کر دیتے ہیں۔

قبل بلوغت کیوں کہ انائی قوت کی مضبوطی کے لئے تلاش وسائل کا دور ہوتا ہے۔ اس لئے ان تمام امکانات کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے: بچی کا قبلِ بلوغت کا کردار ان ہی سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قدیم تطبیقوں کو ختم کرنے کا رجحان بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ نوجوان لڑکی اپنے والدین خصوصاً ماں پر کڑی تنقید کرتی ہے۔ وہ بیرونی دنیا کے لئے بہت ہی حقیقت پسندانہ رویہ اپنا لیتی ہے، والدین کے بارے میں بچپن کے ساتھ اعلیٰ تصورات سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہے۔ ماں سے خود کو مختلف اور جداگانہ ثابت کرنے کے لئے وہ کسی طرح سے سعی کناں رہتی ہے۔ اس تنقیدی ناپسندیدگی کا اظہار باضابطہ یا مستقل قسم کا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس وہ لڑکی جو گھر میں ہر وقت والدین کو نشانۂ تنقید بنائے رکھتی ہے۔

بسا اوقات سکول کی ہم جولیوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ اس کے والدین، بہت اہم اور ارفع ہیں۔ وہ ان کی عظمت کے اظہار کی خاطر ایسی داستانیں وضع کرتی ہے جن پر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا۔ یہ سب کچھ اپنے اس رجحان کی تکذیب کے لئے ہوتا ہے جس کے زیر اثر وہ انہیں کمتر سمجھتی ہے۔

قبل بلوغت کے ان احساسات کی وضاحت کے لئے فیملی رومانس[1] کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ نوجوان لڑکی کیونکہ خود مختاری کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس لئے وہ تطبیق کے تمام قدیم اثرات سے چھٹکارا پانے کی سعی میں مصروف ہو جاتی ہے، اگرچہ وہ مکمل خود مختاری کے لئے پوری طرح سے تیار نہیں ہوتی۔ اس لئے اسے مفاہمت کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً وہ اپنے کنبہ کی جگہ کسی سہیلی کے کنبہ کو دے دیتی ہے، اب وہ ہر وقت ان کے گن گاتی رہے گی۔ قطع نظر اس سے کہ ان کا معیارِ زیست خود اس کے اپنے گھر سے کہیں نیچا ہو، لیکن وہ ان کے گھر کو راحتوں اور مسرتوں کا گہوارہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گی۔

بعض اوقات وہ جن خصوصیات کا اپنی ماں میں فقدان پاتی ہے۔ ان کی تلاش کے لئے اپنی کسی استانی کو انائی معیار کا درجہ دے دیتی ہے۔

بسا اوقات اس پر اظہارِ تعجب کیا جاتا ہے۔ کہ پسندیدہ استانی کو ماں پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے۔ جب کہ ماں اپنی خوبیوں کے باعث واقعی قابلِ قدر ہستی ہوتی ہے۔

دراصل یہ سب ماں پر لاشعوری انحصار کا غماز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں سے تعلق مستقل نوعیت کا ہوتا ہے، اس لئے جذباتی کشمکش سے چھٹکارا پانے کے لئے ماں اور استانی میں ایک خلیج پیدا کر لی جاتی ہے جو، ہیجانی لحاظ سے یہ زیادہ "سہولت" کا معاملہ بن جاتا ہے۔ یوں استانی کی محبت ماں پر طفلانہ انحصار سے چھٹکارا پانے کے لئے مفاہمت کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ استانی سے محبت دراصل ماں سے محبت ہے۔ صرف ذریعۂ اظہار کا فرق ہے۔

قبل بلوغت میں باپ سے محبت کی بجائے ماں سے محبت زیادہ خطرناک بن سکتی ہے۔ لڑکی کی نشوونما کے لئے یہ محبت بہت رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ جن بالغ عورتوں میں ہمیں نفسی طفلیت ملتی ہے اس کا سبب ماں سے قبل بلوغت کی ناآسودہ چاہت ہوتی ہے۔

بہرحال تطبیق کے قدیم انداز کی تبدیلی بذاتِ خود ترقی کی طرف ایک اور قدم ہے۔ جو بعض اوقات نئی سماجی اور فکری افکار کی جنم دہی کی باعث بنتی ہے۔ تطبیق کا مقصود نسبتاً زیادہ ترقی پسندانہ اور زیادہ مثالی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ دوسری مثالوں میں منتخب شدہ مقصود عموماً جنسی بے راہ رو اور بدنام عورت ہوتی ہے۔

ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس صورت میں یا تو ماں کے برعکس ہستی ڈھونڈی جاتی ہے یا پھر یہ ماں کی اس لاشعوری تصویر کی بنا پر ہوتا ہے۔ جس کا خاکہ لڑکی کا ذہن تیار کرتا ہے اور جس میں جنسیت سے رنگ آمیزی کی جاتی ہے۔ ہر دو صورتیں لڑکی کے مادرانہ انحصار کی غماز ہیں۔

حصولِ بلوغت کی اس جدوجہد میں لڑکی کے بھائی بہنوں کا ایک اہم کردار ادا کرنا بالکل فطری ہے جس زمانہ میں اس میں زیادہ جوش ہوتا ہے: اب اگر ایک لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ پلی بڑھی ہے۔ تو وہ ایک دم سے بڑھتی ہوئی ظاہر ہونے کی کوشش ہی نہ کرے گی۔ بلکہ خود کو ایک لڑکے کے روپ میں بھی پیش کرے گی۔ لڑکی کی بہن — خصوصیت سے اگر وہ اتنی بڑی ہو کہ بلوغت کی دوڑ میں وہ آگے محسوس ہوتی ہو، تو وہ مرکزِ رشک و حسد بن جاتی ہے — اور یا پھر — مگر شاذ ہی۔ ایک مثالی ہستی!

اس مقصد کے لئے عموماً بہن کی سہیلی، سہیلی کی بہن یا عمر میں ہم جماعت لڑکی مثالی شخصیت کی حیثیت سے منتخب کی جاتی ہے۔ لڑکیوں کے لئے ایسی تطبیق بہت آسان ہوتی ہے۔ اس لئے یہ انتخاب لڑکی کے نظریۂ حقیقت کا — جو قبل بلوغت کی خاص خصوصیت ہے — اظہار کرتا

---

[1] فیملی رومانس: تحلیل نفسی کے ذریعے دریافت شدہ اس طفلانہ فانتزی کو کہتے ہیں۔ جس کی رو سے بچہ اپنے والدین کو حقیقی سمجھنے کی بجائے یہ تصور کرتا ہے۔ کہ اس کے اصل والدین تو بہت مشہور اور صاحبِ اقتدار ہیں۔ اور اس کی پیدائش پر اسرار کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔

بڑی عمر کی لڑکی سے ایسے تعلقات اس بنا پر بہت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں کہ وہ کم عمر لڑکی کو ایسی حرکتوں کے لئے ورغلا سکتی ہے جن کے لئے وہ ابھی تک ناپختہ ہو۔ مگر ہم اس کا بعد میں مطالعہ کریں گے۔

تعین کے لئے اہم ترین افراد کے علاوہ، کچھ عارضی مقصود بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈراموں، فلموں اور افسانوں کے بعض کردار، ایسی بہت سی تلفیقوں کی بعد میں یعنی بلوغت میں دفاعی عمل سے مخالفت کی جا سکتی ہے۔ جب یہ مریضانہ رجحانات شدید صورت اختیار کریں۔ تو ہم اتفاقاً ـــ صحبت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ذرا گہرے مشاہدہ پر یہ قبل بلوغت کے مخصوص کردار پر تقلید نظر آتی ہے۔ انہیں دیکھ کر بچوں کے کھیل یاد آتے ہیں اور ایسے محسوس ہوتا ہے۔ گویا یہ اداکاری ـــ عارضی مگر شعوری خواہشات کا اظہار کر رہی ہوں کہ ـــ میں ایسی بننا چاہتی ہوں"۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ اس اداکاری اور فانتزی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ اول الذکر ٹھوس اور حقیقی کردار ہوتا ہے۔

ایک مصروفی خاصیت نوجوان لڑکی کو "اداکاری" پر مجبور کرتی ہے۔ اسے حقیقت کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اس عمر کے اس دور میں زندگی کے تمام معاملات کے حقیقت پسندانہ جائزہ کا رجحان نمایاں تر ملتا ہے۔ فقرات اور اشارات بالکل حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور کیوں کہ اس میں اشیاء کو بلاواسطہ محسوس کرنے کا رجحان بھی کارفرما ملتا ہے۔ اس لئے اس کی یہ اداکاری کچھ عجیب و غریب صورت اختیار کر لیتی ہے۔

بطور مثال ہمیں اس بارہ سالہ لڑکی کے طرزِ عمل کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جو پہلی مرتبہ رقص کے لئے جا رہی تھی۔ وہ تشویش اور احساس کمتری کی چکی میں پسی جا رہی تھی، اسے سب سے زیادہ یہ ڈر تھا کہ وہ مکمل طور سے بالغ نہ معلوم ہو گی۔ اس نے اپنے بالوں کی آرائش ایسے انداز سے کی کہ اس کی عمر زیادہ معلوم ہو سکے۔ آرائش گیسو والے نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ تمام لڑکے اس کے گرد پروانہ وار پھریں گے۔ اس نے کئی گھنٹوں تک آئینہ کے سامنے اپنے انداز و اطوار کا جائزہ لیا مگر جب شام آئی تو اس نے پارٹی میں جانے سے انکار کر دیا۔ وہ اس بات سے ڈر رہی تھی کہ "تمام لڑکے اس کے گرد پروانہ وار پھریں گے"۔ اور اس کا ضمیر انہیں تکلیف میں مبتلا کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس نے لاچارگی سے کہا "اب ظاہر ہے کہ جتنے لڑکے میری محبت میں گرفتار ہوں گے میں ان سب کی بیوی بننے سے رہی پھر وہ بے چارے کیا کریں گے"؟

یہ فانتزی جو خارج سے مستعار شدہ تھی، فوراً حقیقت کا جامہ پہن کر عملی کردار بن جاتی ہے مگر یہ کردار منفی ہے۔ کیونکہ وہ کام سے انکار کر دیتی ہے۔

اپنی مدد: شخصیت کے تنگ دائرہ میں محبوس نوجوان لڑکی اپنے کردار اور کوشش کو مقصد کے مطابق ہم آہنگ کرنے کے لئے ہر طرح کے طریقے آزما دیکھتی ہے۔ مثلاً وہ اپنے لئے ایک نظریات وضع کرتی ہے۔ کچھ عرصہ تک اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے بعد اسے کسی اور سے بدل لیتی ہے وہ خود کو کتابی کردار سے یا زندہ افراد کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے بلکہ اشتہارات سے بھی امداد لی جاتی ہے۔

تزئین جمال کی تشہیر شدہ مصنوعات استعمال کر کے وہ خود کو مسحور کن حسن کی حامل عورت ایسی آسودگی بہم پہنچاتی ہے

سیلی بینسن کی کتاب "جونیئر مس" میں ایک بارہ سالہ لڑکی کی تلعین کی بڑی دلچسپ اور قابل قدر

---

[1] تفصیلات کے لئے فرائیڈ کی یہ کتاب ملاحظہ ہو۔

THE EGO AND THE MECHANISM OF THE DEFENCE.

مثالیں ملتی ہیں۔ شفاخانوں کے مہیا کردہ اعداد و شمار اور مشاہدات سے ہمیں قبل بلوغت کی نفسیات کے بارے میں اتنا کچھ نہ معلوم ہو سکے۔ جتنا کچھ یہ حساس اور ذہین مصنفہ جوڈی کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کی تصویر کشی سے بتا جاتی ہے۔ اگر نوجوان جوڈی اپنی ذات کو مرکز تطبیق بنانے سے اپنی زندگی میں کوئی مؤثر ڈرامائی کردار ادا کر سکے تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتی۔

مثلاً جب اس نے ایک ڈرامہ کی سرزمین کو قربانی کرنے والی بیٹی کے روپ میں دیکھا تو وہ بھی ایک ایسی ہی بیٹی کا کردار اپنا لیتی ہے۔ جو اپنے باپ کے علاوہ دنیا کی اور کسی شے کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتی۔ لیکن جب اس کا باپ اس کی توقعات کے مطابق "ڈرامائی کردار" نہیں بنتا تو وہ سخت ناامید ہوتی ہے۔ ایک کم عمر لڑکی لے اس کھیل میں اپنے باپ کو بھی شریک کر لیا ہوتا ایک بالغ لڑکی نے جہان تصورات سے تسکین حاصل کر لی ہوتی۔ مگر جوڈی کیونکہ قبل بلوغت کے دور میں ہے اس لئے وہ "اداکاری" کا سہارا لیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد، ظہور بلوغت پر اداکاری کا رجحان اس میں اداکارہ بننے کی تمنا پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔

نوجوان لڑکی کا "ڈرامائی کردار" ایک اور صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اب وہ بالغ افراد کے معاملات میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑاتی رہتی ہے۔ اپنے بے انتہا تجسس کی بنا پر وہ سب کچھ دیکھتی ہے جو کچھ دیکھتی ہے، اس کی اپنے طور سے تشریح کرتی ہے، بلکہ اپنے ناپختہ تخیل کی امداد سے اس میں حسب منشا رنگ آمیزی بھی کرتی جاتی ہے۔ نتیجۃً وہ یا تو بالغ افراد کی پرجوش مددگار بن جاتی ہے یا انہیں پریشان کرتی رہتی ہے۔ وہ تطبیق کے لئے ان افراد کو چنتی ہے۔ جو دیوانہ وار محبت میں گرفتار ہوں یا پھر کسی ڈرامہ کے مصیبت زدہ اور ستائے ہوئے دکھی کرداروں کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ جہان تصورات کا پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ الٹی سیدھی حقیقت سے مستعار ہوتا ہے۔ اس کی حرکتیں پاگل پن سے مشابہ ہوتی ہیں۔ اس لئے جلد ہی سبھی تنگ آ جاتے ہیں۔ یہ اس وقت خصوصیت سے صحیح ہوتا ہے۔ جب یہ حرکات کسی حد تک جارحانہ رجحانات پر مبنی ہوں۔

اس ضمن میں رازداری بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بلکہ قبل بلوغت میں اسے تجسس کا ساتھی سمجھنا چاہیئے۔ بارہ سالہ برونٹ یہ محسوس کرتی ہے۔ کہ دوسروں کے کچھ راز ہیں۔ وہ دوسروں کی زندگیوں کو پراسراریت سے بے نقاب دیکھنا چاہتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ خود اپنی زندگی میں زیادہ سے زیادہ رازداری برتتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک رازدار فریق کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کمی کسی ہم عمر لڑکی یا پھر ہم جولیوں کی ٹولی سے پوری کی جاتی ہے۔ رازداری خود سے زیادہ عمر کے افراد بلکہ خصوصیت سے ماں جو اس کی قائم مقام ہستی کے خلاف برتی جاتی ہے۔

ماں نے بچی کو اپنے "رازوں" میں شریک نہ کیا تھا اس لئے اب وہ "انتقاماً" اپنے راز پا ہے۔ جب وہ پہلے یہ سوچتی تھی "اس نے مجھے اس کے بارے میں کیوں نہ بتایا؟"

تو اس کے ذہن میں وقوعہ کے بارے میں رازداری

نہیں ہوتی بلکہ وہ پراسرار وقوعہ ہوتا ہے۔

لیکن قبل بلوغت میں لڑکی پراسرار وقوعہ سے اتنا تعلق نہیں رکھتی جتنا کہ اس کے بارے برتی گئی رازداری سے وہ پریشان ہوتی ہے۔ اس کی مخصوص مثال گھر میں بھائی یا بہن کی پیدائش ہے بچہ کی پیدائش لڑکی کے لئے اتنی زیادہ پریشان کن نہیں۔ لیکن وہ اس رازداری کے لئے اپنی ماں کو کبھی معاف نہیں کرتی جو اس نے اپنے حمل کے بارے میں برتی تھی، اس کی ماں نے کئی مرتبہ آنے والے بچے کا ذکر کیا۔ اس حقیقت کو یا تو وہ بھلا دیتی ہے ـــ یہی کچھ بعد میں حیض کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔!

رازداری پر مبنی طرز عمل اکثر اوقات متناقض ہوتا ہے۔ نوجوان لڑکی اپنی تمام سہیلیوں کو

یا پیاری کی قسم کھلا کر اپنے راز بتاتی ہے۔

اللہ قسم کسی سے نہیں کہنا یہ سب کچھ تھا۔ تب بتاؤں تم قسم کھاؤ کہ کسی اور کو نہ بتاؤ گی بڑا سے راز بتاتی ہے اور اس کے بعد ملنے والی ہر سہیلی کو یہ سب کچھ قسمیں کھا کھلا کر بتایا جاتا ہے۔

اپنا کوئی راز اور پھر اس کا اخفا ایک ایسی احتیاج بن جاتا ہے جس کی خاطر حقیقی واقعات کی عدم موجودگی میں جھوٹ کا طومار باندھا جاتا ہے۔ یہ جھوٹ عموماً بے ضرر قسم کے ہوتے ہیں۔ اور فانتزی میں اتنے بھرپور نہیں رہتے۔ بلوغت کے جھوٹوں کے مقابلہ میں یہ بہت زیادہ ہلکے پھلکے ثابت ہوتے ہیں۔

خاص عورتوں میں یہ رجحان بلوغت کے بعد بھی برقرار رہتا ہے اور وہ ہر قسم کے لوگوں کو اپنا رازدار بنانے پر مجبور رہتی ہیں۔

اب ہم اس مسئلہ کا جائزہ لیتے ہیں کہ قبل بلوغت میں لڑکی کی جذباتی زندگی کس نوع کی ہوتی ہے۔ بچپن سے فرار کی خاطر وہ تمام قدیم جذباتی رشتوں کو ختم کرنے کی پرجوش کوششیں کرتی ہے۔ ان قدیم جذباتی رشتوں میں ماں کی جابرانہ پرمحبت پناہ گاہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس امر سے بھی واقف ہیں کہ ماں ہی بچی کو حصول بلوغت میں ہر ممکن امداد دینے کی پیش کش کے باوجود بھی لڑکی کے معاملہ میں کتنی مشکلات پاتی ہے۔ اب خواہ اس کی پیش کش خلوص پر ہی کیوں نہ مبنی ہو۔ مگر لڑکی اسے شک وشبہ کی نگاہ سے ہی دیکھے گی۔ ماں کی امداد سے حاصل کردہ بلوغت لڑکی کے لئے باعث کشش نہیں ہوتی۔ گو لڑکی طفلانہ بندھنوں سے خود کو آزاد کرانے کے لئے سرتوڑ کوشش کرتی ہے۔ مگر یہ بلا شک وشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی یہ سعی مشکور نہیں ہوتی۔

بیشتر لڑکیوں کا کنبہ سے ہیجانی بندھن کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ایسی ہیجانی کیفیات عموماً ان افراد پر مرکوز کر دی جاتی ہیں۔ جو یا تو افرادِ کنبہ سے بلاواسطہ تعلق رکھتے ہوں۔ اور یا ان کے نمائندہ بن سکیں۔

استانی کی مثال نمایاں ہے۔ لڑکی کی گہری اور شعوری محبت کسی لڑکی کو اپنا مرکز بنا لیتی ہے۔ یا توانائی معیار کے لئے خود سے بڑی لڑکی یا پھر اپنے ایسی لڑکی۔ ایسی لڑکی جس کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کر کے ہنستی اور خوش ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کمرہ میں پہروں بند رہتی ہے، اسے اپنے راز بتاتی ہے اور اس کے ساتھ وہ عمر کے اس دور کی بے ضرر سی جنسی آسودگی کا تجربہ حاصل کرتی ہے۔

یہ کیونکہ نسوانی اظہار ہی کا ایک ذریعہ ہے، اس لئے اس ضمن میں مرکزِ الفت کا انتخاب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس صورت میں لڑکی کی اپنی انا وسعت اختیار کرتی ہے۔ اس لئے پسندیدہ لڑکی کی عمر، خواہشات اور دلچسپیاں اس سے مشابہ ہوتی ہیں۔

عمر کے اس دور میں کیونکہ انا ابھی خارجی دنیا میں نئے نئے ہیجانی رشتے قائم کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ ادھر وہ اتنی کمزور ہوتی ہے کہ خود کو مکمل طور سے آزاد بھی نہیں محسوس کر سکتی ہے۔ اس لئے اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ نوجوان لڑکی بہت سی نسبتوں کے چکر میں مبتلا ہو کر رہ جائے۔

قبل بلوغت میں یہ تعلیمی کچھ عرصہ تک تو صرف گروہ تک فعال اور کھیل تک ہی محدود رہتی ہیں لیکن آہستہ آہستہ عمر کے ساتھ ساتھ ذہنیت کی تبدیلی کے باعث ان کی اہمیت واضح تر ہوتی جاتی ہے۔ اصولاً نوجوان لڑکی بلوغت ختم ہونے کے بعد صرف مخالف جنس سے وابستگی اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن مختلف الزرع جنسیں موجود رہتی ہیں۔

لیکن بعض صورتوں میں تو یہ لڑکی کی شخصیت پر دوررس اور سود مند اثرات کا باعث بھی بنتی ہیں

مختلف تعلیقوں کو باہمی ادغام سے بچانے کے لئے کئی طریقے وضع کئے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے آسان تو یہی ہے کہ لڑکی احساس تحفظ کی خاطر کسی اور لڑکی سے وابستگی اختیار کر لیتی ہے۔ گو وہ اپنی تسکین کی خاطر شور مچاتی رہتی ہے۔ لیکن وہ اپنی خامیوں سے آگاہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ توانائی کے لئے خود سے مشابہ کسی اور ہستی کی متلاشی ہوتی ہے۔

گویا توانائی دوگنی ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی ہستی کی خواہاں ہوتی ہے۔ جو اس کے ساتھ مل کر تجسس اور اسرار کے بوجھل سرگوشیوں میں شرکت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مانند خود کو غیر اہم سمجھنے کے تکلیف دہ احساس سے بھی واقف ہو۔ اگر اسے کسی اور ہستی کا سہارا میسر ہو تو نوجوان لڑکی راز کے بوجھ، احساس پشیمانی اور متحارب دنیا کے احساس کمی سے باآسانی نبرد آزما ہو سکتی ہے۔

لڑکی لڑکی کے اس تعلق کو ایک زوجگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے فریق سے وفاداری اور "جملہ حقوق محفوظ" ہونے کی توقع کے ساتھ ساتھ رازوں میں مکمل شرکت کی جاتی ہے۔ فریقین کے لئے ایک دوسرے کو ہر روز کی تمام باتوں سے بلاناغہ آگاہ کرتے رہنا لازمی ہے۔ وہ تمام لوگوں ـ خصوصیت سے بڑی عمر کے افراد کو اپنے حلقہ سے خارج کر دیتی ہیں۔ ان کے اہم ترین انکشافات اور دریافتیں بالعموم جنسی معاملات سے متعلق ہوتی ہیں۔

جس طرح بچپن کے پچھلے دور میں ان کی دلچسپی جسمانی اختلافات سے وابستہ تھی اسی طرح اب قبل بلوغت میں وہ عضویاتی کارکردگی کو مرکز توجہ بناتی ہیں۔

عمر کے اس دور میں تناسلی اختلافات سے اتنی دلچسپی نہیں رہ جاتی، کیونکہ اب وہ ان کے بارے میں جانتی ہیں۔ اب وہ جنسی اعضا کی کارکردگی، ان کی لمبائی چوڑائی، اپنے جسموں کے اندرونی حصوں اور چھاتیوں کے پھولنے وغیرہ کو مرکز توجہ بنا لیتی ہیں۔

اس معاملہ میں ایک دوسرے کو جھوٹ سچ سے نوازتی رہتی ہیں۔ اور پھر مل کر خارجی دنیا کا دن بھر جنسی وقوعات کی روشنی میں جائزہ لیتی ہیں۔ ان میں سے ایک، دوسری کو راز بتانے کے لئے کوئی تجربہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

جب وہ جدا ہوں تو خطوط سے ایک دوسرے کو سب کچھ بتایا جا سکتا ہے۔ ورنہ دوسری کے لئے ڈائری میں سب کوائف جمع کئے جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ سب کچھ جنسی رنگ میں رنگا ہوتا ہے۔ اور "یہ" "وہ" "بنانا" وغیرہ ایسے بے ضرر الفاظ عموماً ذومعنی ہوتے ہیں۔

اب ہم پھر دو لڑکیوں کی دوستی کی طرف آتے ہیں!

ہم نے جنسی تحقیقات اور مشترکہ رازوں کو جنسی تسکین کا باعث ٹھہرایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عمر کے اس دور میں جنسی تسکین کی صرف یہی ایک صورت ہوتی ہے۔ دو لڑکیوں کی شدید محبت لعب کی پیدا کردہ ہے۔ اسی طرح عام اور نارمل حالات میں انہیں کبھی بھی باہمی جلق کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

علاوہ ازیں شعوری جلق شاذ ہی ملتا ہے اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ کہ بلوغت کے برعکس قبل بلوغت میں لڑکی کی فانتزی ہیرو کی جنسی اور ڈرامائی کردار کی طرف مائل ہوتی ہے۔ ہر دو ادوار میں حمل کا مسئلہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

بلوغت میں نوجوان لڑکی حمل سے وابستہ فانتزیوں اور اس کی علامات کے باعث تشویش اور پریشانی میں مبتلا رہتی ہے۔ لیکن قبل بلوغت میں دونوں ہم راز سہیلیاں کمرہ بند کر کے کپڑوں میں چھوٹے تکیے چھپا کر حاملہ ہونے کا کھیل کھیلتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال طوائفانہ فانتزیوں کا ہے۔ لڑکیوں کے لئے یہ موضوع بے حد دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ ان کے بارے میں داستانیں اور واقعات بیان کرتی رہتی ہیں۔ وہ میک اپ کر کے طوائفانہ فانتزیوں کا ناٹک کھیلتی ہیں۔

بلوغت میں نوجوان لڑکی ان فانتزیوں کے باعث اچھی خاصی تاریک دنیا بن جاتی ہے ورنہ

ں میں گزر ترسی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔

لڑکیوں کی عضوی تحقیقات کے مراکز جنسی نمو، حمل اور بچوں کی پیدائش ہوتے ہیں۔ اور یہ بالکل فطری ہے۔ ان معموں کی "کیا" اور "کیسے" کے بارے میں وہ بہت سے نظریات وضع کرتی ہیں۔ ان نظریات کے لئے خام مواد حقیقت سے مستعار لیا جاتا ہے ——————

—— اس ضمن میں وہ ایسی یہ تجویز کو فوراً قبول کر لیتی ہیں جس کی رو سے یہ سب کچھ مرد کے ظلم اور بد قسمت عورت کی بے بسی اور مدارج زلیست میں نسائی اذیت کوشی (مسوکیت) کسی نہ کسی صورت سے ذریعہ اظہار پاتی رہتی ہے۔

دو لڑکیوں کی دوستی عموماً ایک حد تک باہمی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ یعنی اگر ایک لڑکی تیز طرار ہے۔ تو دوسری شرمیلی اور کمی گر اس تعلق کی شدت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے ایک ذہنی مفعولیت محض ذہنی یا تن کارانہ ہو سکتی ہے۔

بلوغت کے قریب یہ تعلقات آزار پسندانہ اور اذیت کوشانہ ذہنیت اختیار کر جاتے ہیں ایسے اثرات بہت اہم بلکہ نقصان دہ صورت بھی اختیار کر جاتے ہیں، یہ خصوصیت سے اذیت کوش رفیق کے لئے زیادہ خطرناک ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات نوجوان لڑکیاں کام یا مطالعہ میں امتناعات کے باعث اچانک یا تدریجاً کسی ایسے کام کی تکمیل کے ناقابل ہو جاتی ہیں جس کے لئے قوت ارادی یا بے آرامی برداشت کرنی پڑے اس کی وجہ لڑکی کی فانتزیوں میں ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں مجھے ایک لڑکی کے مشاہدہ کا موقع ملا جس نے ہر طرح کے کام نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا کسی کام میں اگر ذرا سی بھی مشقت یا بے آرامی نظر آتی تو وہ فوراً اس کام سے ہاتھ اٹھا لیتی۔

لیتی دراصل یہ لڑکی اذیت کوش تھی اور ایک ہم عمر آزار پسند لڑکی کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کی اذیت کوش محکومی کی بنا پر اب اس کے لئے کسی ایسے ... کام کی ... بن چکی تھی —————— جس کا انعام اسے اذیت کوشی پر مبنی لذت ... ایسے آزار پسندانہ اذیت کوشانہ تعلقات بلوغت کے بعد بھی جاری رہتے ہیں اور بعد میں مخالف جنس پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

دو لڑکیوں کے تعلقات مختلف صورتیں اختیار کر سکتے ہیں۔ تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر دلچسپی بدل جاتی ہے اور بعض صورتوں یہ تعلقات انقطاع پذیر ہو کر عمر بھر کی دوستی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

بعض اوقات ان دونوں میں سے ایک نسبتاً جلدی جنسی پختگی اختیار کر لیتی ہے اس ... تعلق کی بنا پر کم پختہ بھی دوسری کی تقلید میں مخالف جنس کے ساتھ ہم کنار ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ حالانکہ وہ ابھی تک ذہنی لحاظ سے اس کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ نفسیاتی تیاری کی بجائے بعض اوقات وہ صرف خام کاری ہی کو اپنا راہنما بنا لیتی ہے۔ یوں بڑی آسانی سے وہ الجھنوں کی دلدل میں پھنس سکتی ہے اس صورت حال کے نتائج ناخوشگوار ہو سکتے ہیں۔ نتائج کی ناخوشگواری کی نوعیت یا شدت کا لڑکی کے سماجی حالات پر انحصار ہوتا ہے۔ کم عمر امریکی لڑکیوں میں غنڈہ گردی، طوائفیت یا مجرمانہ رجحانات کا باعث یہی ہوتا ہے۔ پر قبل بلوغت کا عمل نارمل انداز سے تکمیل نہیں پا سکتا اور وہ ذہنی ناپختگی کے باوجود ... کی بجائے، مخالف جنس اپنانے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

میرے خیال میں اس دور کا اصل خطرہ غلط زمانہ میں غلط کردار ہے۔ نوجوان لڑکی ... نشوونما تعویق میں پڑ جاتی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

افراد کنبہ کی ... کے لئے مستقل تشویش اور فکر مندی خطرناک ہیجانی نبد ھنوں کی شدت احساس

جرم اور خوف یا پھر اس کے برعکس قبل از وقت کے تجربات شخصیت کی نشوونما کے عمل میں انتشار پیدا کر کے انتہائی صورتوں میں نیوراتی تجربات کا باعث بن سکتے ہیں۔

عمر کے اس دور میں عموماً لڑکے اور لڑکیوں کے مخالف جنس کے افراد سے غیر جنسی تعلقات ہوتے ہیں۔ لڑکا اس وقت اپنی مردانگی پر غیر معمولی نازاں ہوتا ہے۔ اس لئے لڑکیوں سے دوستی مردانگی کی توہین معلوم ہوتی ہے (لیکن بلوغت میں یہ طرز عمل برقرار نہیں رہتا)

لڑکی لڑکے کے طرز عمل کے جواب میں "مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں" ایسا انداز اپناتی ہے۔ لیکن اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ لڑکے کی برتری تسلیم کرتی ہے خصوصیت سے یہ رجحان وہاں بہت نمایاں ہو جاتا ہے جہاں کھیل کے میدان کے کارناموں کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

اس کے تحت ایک پرجوش قسم کی لڑکی لڑکوں کا مقابلہ کرتی ہے اور اچھی خاصی لڑکا بن جاتی ہے۔ ان صورتوں میں اور بھی تقویت ہو جاتی ہے اگر اسے یہ احساس ہو کہ اس کی ہم جولیاں بھی یہی نصب العین رکھتی ہیں۔ اس عمر میں اگر لڑکا لڑکی کسی کونے میں چھپے کانا پھوسی کر رہے ہوں تو وہ جنسی نہیں بلکہ تجسس کی بنا پر ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی جنسی کردار کے مظاہرہ کی صورت میں بھی بنیاد جنسی نہیں بلکہ تجسس ہی بنتا ہے۔

اس دور میں لڑکی میں جو لڑکا پن پیدا ہوتا ہے۔ وہ صرف نارمل ہی نہیں بلکہ نفسیاتی صحت مندی کے اعتبار سے معقول رجحانات کی بنا پر ہر وقت گھر میں گھسی رہنے والی لڑکی کے مقابلہ میں زیادہ قابل قدر بھی ہے۔ اس کی انفرادی خصوصیات نمایاں صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ بچپن کے کسی دور میں بھی کبھی اختلاف طبع اس انداز سے ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ بعض لڑکیاں نسائی انداز و اطوار اپنا کر زنانہ اشغال سے اپنی دلچسپی ظاہر کرتی ہیں۔ بلکہ بعض دفعات تو وہ حصول شفقت کے لئے خود کو احمق بھی ظاہر کرتی ہیں۔ ان کے برعکس وہ لڑکیاں ہیں جو ابتدا سے ہی مردانہ خصائل کا اظہار کرتی ہیں۔ کسی لڑکی کے کردار کے تعین میں اس کی سماجی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس کے والدین اور بھائی بہن کا طرز عمل بھی غالباً اہم کردار ادا کرتا ہے —— قبل بلوغت میں لڑکا پن اپنانے والی لڑکی میں شروع سے ہی لڑکا بننے کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ جو موقع ملنے پر فوری تیز ہو جاتی ہے اگر یہ خواہش احساس کمتری اور پژمردگی سے مملو نہ ہو تو یہ باعث تشویش نہ ہونی چاہیئے۔

جب بلوغت کی آمد آمد ہو اور لڑکی جنسی تشویش کی اولیں علامات سے دوچار ہو۔ اسے کسی محبت میں ناکامی ہو، تو ان صورتوں میں وہ اسی لڑکے پن کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے یہ ہتھیار تحفظ نسائیت کے لئے ہوتا ہے۔ ایسا خصوصیت سے اس وقت ہوتا ہے، جب اس کی فانتزیاں اذیت کوشی پر مبنی ہوں۔ اس تشویش کے باعث ایک لڑکی مفعولیت اور گھریلو پن اور دوسری مردانہ پن اور مخالف جنسیت اختیار کر سکتی ہے۔ ویسے یہ اعمال عموماً بلوغت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

میں نے قبل بلوغت کی خصوصیات کے ضمن میں کئی جگہ ماحول سے "جنگ آزما" یا "جارحیت" کا استعمال کیا ہے اور اب یہ واضح ہے کہ اس دور میں سب سے بڑا محرک انا کا یہ وراثتی جذبہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ تکمیل پا کر کچھ کر دکھانے کی متمنی ہوتی ہے۔

اس منزل تک پہنچنے کی خاطر جادہ پیما ہونے والی لڑکی کے لئے قدیم بندھنوں سے نجات ... بغاوت کی بہیں پھر گھر کے محدود ماحول سے ٹکراتی ہے۔ اکثریت خود کو دیر تک سکول کے ماحول کے مطابق بنائے رکھتی ہے۔ اس لئے کہ گھر اور سکول کے طرز عمل میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایسی بچیوں کی کمی نہیں جو گھر میں ہر وقت سب کے سر پر سوار رہتی ہیں۔ مگر جنہیں سکول میں بہت شائستہ اور ... سمجھا جاتا ہے جب کہ اس کے برعکس صورتیں ... سکول میں ... گھر ... استاد ... ملتی ہیں۔ اس کشمکش کو گھر سے سکول تک منتقل کرنے میں

پیچیدہ قسم کے کئی ہیجانی اعمال کارفرما ہوتے ہیں۔ سکول سے بھاگنا، وہاں کے ماحول سے خوفزدہ ہونا ہمیشہ گھر میں رہنے کو ترجیح دینا۔ یہ آثار بالعموم خطرناک نیوراتی علامات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں، مگر ہم تو اس موقع پر حصولِ آزادی کے لئے نسائی انا کی سیدھی سادی اور نارمل نشوونما کا جائزہ لے رہے ہیں۔ نارمل سے نارمل قبل عنفوانِ شباب کا دور بھی مشکلات سے عاری نہیں ہوتا۔ اس کا عام اور واضح ترین اظہار نافرمانبرداری، تعلیمی تقاضوں سے بغاوت اور پہلے سے تسلیم کردہ نظم وضبط کی خلاف ورزی کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بعض اوقات ان ہی کے ضمن میں جارحیت بھی اختیار کر لی جاتی ہے کبھی کبھار بچپن کی تعلیمی کارگزاریوں جو اب تک عادت بن چکی تھیں۔ پر جیسے پانی پھر جاتا ہے۔ ساتھ ہی جسمانی صفائی اور اخراجی وظائف کا تواتر غرض کہ ماں یا اس کی قائم مقام ہستی کا قائم کردہ "جسمانی نظام" باغیانہ طور سے درہم برہم کر دیا جاتا ہے۔

اصولاً یہ اب تک کے انحصار کے خلاف احتجاج کی ایک صورت اور تعلیمی اثرات کے خلاف جارحیت کا ایک انداز ہوتا ہے۔ اگر اس کا ذرا نگاہی سے جائزہ لیا جائے تو اس میں تناقض کا ایک پہلو بھی ملتا ہے۔ بچی یہ سب کچھ عہدِ طفل کی برقراری کی شدید خواہش کی بناء پر کرتی ہے۔ ایک طرف تو اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بچپن کے اثرات کے خلاف ردِّعمل کا اظہار کرتی ہے اور دوسری طرف وہ بالواسطہ طور سے ان کے حصول کی خواہاں ہوتی ہے اس خواہش سے جب زیادہ متاثر ہو تو پہلے کی مانند وہ دوبارہ اپنے جسم کی دیکھ بھال ماں کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس دور میں دہنی رجحانات۔ خصوصاً چٹورپن۔ کی شدت بھی بڑھتے ہوئے جسم کی ضروریات کی تکمیل کا جارحانہ آسودگی پر مبنی ایک انداز ہوتا ہے۔

ان تمام وظائف کی تکمیل کے سلسلے میں لڑکی ماں کی "دخل اندازی" کے خلاف جدوجہد کرتی ہے۔ اور جب کسی اور کے طور طریقے اسے اپنی ماں سے مشابہ نظر آئیں تو وہ انہیں اپنے بالغپن پر حملہ کے مترادف قرار دیتی ہے۔ ماں ماضی کے ساتھ اس کے رابطہ کا ایک مظہر اور علامت بن جاتی ہے۔

اس دور میں حصولِ آزادی کی جدوجہد کے مطالعہ سے ہمیں ڈیڑھ اور تین سال کی عمر کے درمیان والا وقفہ یاد آتا ہے۔ یہ ایڈی پس الجھاؤ سے قبل کا زمانہ ہوتا ہے۔ خارجی دنیا سے اپنا رشتہ قائم کرنے کے لئے بچہ نے جو پہلا قدم اٹھانا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ پالنے اور دودھ پلانے والی ماں پر طفل انحصار سے چھٹکارا حاصل کر لے۔

ایک طرف تو وہ ماں کے سہارا دینے والے ہاتھوں سے دور بھاگتا ہے۔ اور ساتھ ہی اسے چلانے کے لیے اگر ماں اپنے ہاتھ ہٹا لے تو وہ اس کی انگلی پکڑنے کے لئے بے اختیار چیخ اٹھتا ہے۔ اگر اسے خود نہ کھانے دیں تو وہ ناراض ہو کر غصہ میں آ جاتا ہے۔

کچھ یہی حال لڑکی کا قبل بلوغت میں ہوتا ہے۔ نفرت اور غصہ میں بھری وہ اپنی ماں کے اثرات سے بھاگنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب کہ اس کے طرزِ عمل سے مادرانہ تحفظ میں رہنے کی شدید اور بے تاب خواہش کا بھی اظہار ہو جاتا ہے۔

ماں کا ردِّعمل بھی حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ ہم نے عمر کے چند ادوار کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں ماں بچی کو اپنے آنچل میں چھپا کر رکھنا چاہتی ہے، لیکن اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں کر سکتی اور بالآخر وہ اس کے تحفظ سے ہاتھ اٹھا لیتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کتنی لڑکیوں کے خارجی دنیا سے وابستہ خوف اور ڈر ان کی ماؤں پر بھی اسی شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں، اکثر لڑکیوں کے ذہن میں یہ اندیشہ گھر کر جاتا ہے کہ خارجی تقاضوں کی بنا پر ماں سے جدائی کی صورت میں ان پر یا ماں پر کوئی "خطرناک" افتاد آ پڑے گی۔ بعض مریضانہ مثالوں میں ہم اس خوف سے دوچار ہوتے ہیں۔ نسبتاً زیادہ نارمل لڑکیوں میں یہ خوف اتنا شدید نہیں ہوتا۔

قبل بلوغت میں بھی لڑکی کا چلنا سیکھنے والے دور کی تمام حرکات اور افعال کا اعادہ کرتی ہے ایسا صرف نفسیاتی زندگی کی مرکز یعنی ماں سے حصولِ آزادی ہی کے لئے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اور بھی کئی مقاصد پیشِ نگاہ ہوتے ہیں۔

اس مقصد کے لئے محبت یا نفرت کے باوجود باپ ایک قوی یا کمزور شخصیت کے روپ میں پس منظر میں رہتا ہے۔ عمر کے اس دور میں وہ بچی کی نفسیاتی نشوونما پر بالعموم کسی خاص طریقہ سے اثر انداز نہیں ہوتا۔

بچی کے لئے ماں واحد مقصودِ الفت ہوتی ہے۔

بعد ازاں یہ محبت باپ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

فرائڈ نے عملِ انتقال کا مطالعہ کر کے اس مسئلہ کی طرف توجہ دلائی تھی۔

بعض ماہرینِ نفسیات کے بقول یہ منتقلی بچپن ہی میں مکمل ہو جاتی ہے۔ مگر مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میرے خیال میں عملِ انتقال کبھی بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ نسائی نشوونما کے مختلف ادوار اور تجربات زیست کے جائزہ سے اس کی نفسیاتی زندگی میں مادرانہ اثرات کے نفوذ کا بآسانی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

نسائی زندگی کے اکثر وقوعات محض خود کو مادرانہ اثرات سے نجات دلانے کیلئے کی سعی کے انداز ہوتے ہیں۔ لڑکی میں نفسیاتی توازن بلکہ اس کے مستقبل کا بھی اس سعی کی کامیابی یا ناکامی پر انحصار ہوتا ہے۔

قبل بلوغت میں سعی کی شدت نمایاں تر ہو جاتی ہے۔ نشوونما کا یہ دور بلوغت اور انداز نشوونما کے متعین میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

قبل بلوغت میں ماں سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش اگر خام یا ناکام رہی ہو تو وہ مزید نفسیاتی نشوونما کے لئے رکاوٹ ثابت ہو کر مستقلاً تمام شخصیت پر طفلیت کی چھاپ لگا جاتی ہے۔ ایسی لڑکیوں کی بلوغت میں ہمیں خود مختاری کی وہ نارمل مگر شخصیت کی شدید انقلابی خواہش نہیں ملتی۔ ہم جنسوں سے ان کے تعلقات کی بناء انحصار اور حصولِ معاونت ہوتے ہیں۔ دوستی اور محبت کی جگہ معقول انحصار حسد اور لڑائی پر مبنی محبت کی وہ طلب لے لیتی ہے۔ جس کی آسودگی مشکل ہوتی ہے۔

اگر قبل بلوغت کے بعد ایسی طفلانہ لڑکیاں نسبتاً زیادہ آزاد خود اعتماد اور پرجوش معلوم ہوں۔ تو اس کی وجہ لوا کاری کا وہ رجحان ہوتا ہے۔ جو قبل بلوغت کی اہم خصوصیت ہے۔ ایسی لڑکیاں مشکلات کے سامنے تمام اعلیٰ مقاصد کو تج دیتی ہیں۔ جو کچھ کرتی ہیں خود ہی اس میں کیڑے ڈالتی رہتی ہیں۔ عموماً یہ ذہنی یا فنکارانہ لحاظ سے اچھے نتائج کا اظہار کرتی ہیں۔ لیکن یہ ان کی اپنی شخصیت کا عکس نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لئے وہ خارجی اثرات کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔

ایسی عورتیں جلد ہی شدید محبت کر بیٹھتی ہیں۔ لیکن یہ ہیجانی کارکردگی زیادہ تر خانتزی تک محدود ہوتی ہے اور باعتبار خصوصیت محض ایک کھیل ہوتی ہے۔ اگر انہیں ہمدردی، محبت اور مادرانہ توجہ نہ ملے تو ان کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ احتیاج خاوند لیوری کتا ہے۔

قبل بلوغت کے جائزے میں اب تک ہم نے اپنی بحث صرف نسبتاً نارمل حالتوں تک محدود رکھی تھی۔ لیکن اس میں نیوراتی مشکلات بھی ملتی ہیں۔ جو طفلانہ اعصابی خلل کی بناء پر ہوتی ہیں۔ وہ دور کے ذہنی دھچکے اس کا باعث بنتے ہیں: ان میں سے نئے بہن بھائی کی پیدائش، والدین کی علیحدگی یا موت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا اظہار زیادہ تر تشویشی رجحان اور احساسِ کمتری کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایسی لڑکیاں خود میں بلوغت کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کی سکت نہیں پاتیں۔ حلقۂ احباب کی تبدیلی یا نیا سماجی مقام حاصل کر لینے سے احساس کمتری ختم ہو جاتا ہے۔ ویسے

ان احساسات کی تہ میں زیادہ گہرے مقاصد کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً احساسِ جرم — جو نیوراتی پیچیدگیوں کا نقطۂ آغاز بنتا ہے۔

میں نے جارحیت، بغاوت یا انقلاب وغیرہ کے الفاظ جان بوجھ کر استعمال کئے ہیں۔ میں اس امر پر زور دینا چاہتی ہوں کہ ذہنی نشوونما کے بعض انداز اس لئے قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ کہ وہ جنسی محرکات کی پیدا کردہ ہنگامی صورت حالات کے خطرہ سے بچانے کے لئے کامیاب دفاعی عمل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتی کہ ایسے دفاعی اعمال محض جبلی خطرات کے دباؤ کے باعث۔ ان سے مقابلہ کے لئے۔ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ میرے خیال میرے خیال میں یہ دفاعی اعمال بلوغت سے قبل تسخیرِ حقیقت کیلئے جارحانہ اقدام کی صورت میں نشوونما کا آغاز کر دیتے

ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے شخصیت کا ہر پہلو ہی دفاعی عمل کر سکتا ہے۔ ذہانت ہو یا حماقت، حقیقت گریزی ہو یا حقیقت جوئی! معقولیت کے خلاف دفاع کے لئے جارحیت اپنائی جا سکتی ہے۔ اور معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے اسی طرح نسائی اذیت کوشی سے بچنے کے لئے مردانہ پن اختیار کیا جا سکتا ہے۔ طفلانہ خطرات سے مقابلہ کے لئے خواہشِ بلوغت ایک ہتھیار کا کام کرتی ہے۔ اور یا پھر بالغانہ زندگی کے تقاضوں سے فرار کی صورت میں وہ نئے سرے سے بچی بن جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

طبعیات اور علم کیمیا کی ایجادات بالعموم جنگ میں استعمال ہوتی ہیں۔ حالانکہ بنیادی لحاظ سے وہ جنگی مقاصد کے لئے ایجاد نہ ہوئی تھیں۔ جنگ کے بعد انہیں زیادہ بہتر مقاصد کے لئے بروئے کار لایا جا سکتا ہے کچھ یہی حال بعض اہم ذہنی وظائف کا ہے، گو وہ نارمل نشوونما کے مرہونِ منت ہوتے ہیں لیکن

خطرہ کے مواقع پر وہ دفاعی اعمال کی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کے اصل جوہر تو ذہنی میں کھلتے ہیں۔ جب یہ تسخیرِ ماحول کے لئے استعمال ہوں۔

مارگریٹ میڈ

مرد اور عورت ترازو کے دو پلڑے

انسانی کنبہ کی بقا کا ان سماجی اختراعات پر انحصار ہے۔ جن کے ذریعہ ہر دور اور ہر نسل کے مرد اپنی عورتوں اور پیدا ہونے والے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کرتے رہے ہیں یہ اختراعات اپنے وجود کے لئے جنسیت پر مبنی ان جسمانی تعلقات کی مرہونِ منت ہیں۔ جن کی بنیاد حیاتیات پر استوار ہے۔ انسان حیوانوں کی مانند جنسی ملاپ کے لئے کسی مخصوص موسم کا تابع نہیں اس لئے عورت میں حیوانی مادہ بظاہر قبولیت کے باوجود بھی انسان جنس پر مبنی مستقل نوعیت کے تعلقات استوار کر سکتا ہے۔

اعلیٰ ذوات الثدی اور دودھ پلانے حیوانات میں ابھی تک جنسی کارکردگی کا مادہ کی وقتی پر مبنی جنسی بیداری پر انحصار ہے۔ اس لئے مادہ میں نر کی جنسی دلچسپی صرف قبولیت کے دور تک ہی محدود رہتی ہے۔

ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں۔ جن سے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ انسانی مادہ میں بھی جنسی تیاری کی گردش ہوتی ہے لیکن مباشرت اور بچوں کی پیدائش پر یہ اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ جب بچوں کی پیدائش پر علم الانسان کے ماہرین نے قدیم اور غیر متمدن معاشروں کا علمی مطالعہ شروع کیا تو انہیں یہ معلوم ہوا۔ کہ اکثر معاشروں میں شادی سے پہلے آزاد جنسی زندگی کے باوجود بھی وہاں ناجائز بچے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن شادی سے پہلے ہر طرح سے کھل کھیلنے والی یہی آزاد

لڑکیاں شادی کے بعد حاملہ ہو کر ماں ہی نہیں بنتیں بلکہ بہت زیادہ بچے پیدا کرتی ہیں۔ ایسی رنگین اور قبل از ازدواج آزاد جنسی زندگی کے وسیع اور تفصیلی مطالعہ کے لحاظ سے سموا اور برینڈ رزنگ کی مثالیں بہت نمایاں ہیں۔ اور دونوں علاقوں کے افراد ہی میں بار آوری بہت زیادہ ہے۔

شادی سے پہلے بچوں کا نہ ہونا اور شادی کے بعد بچوں کی پیدائش کی اولین توجیہ یہ کی گئی۔ کہ شاید بعض انسانی نسلوں، مخصوص جغرافیائی حالات کے باعث یا آبادی کے کچھ حصوں میں حیض اور بیض اکٹھے شروع نہ ہونے کی بنا پر لڑکیاں عمر سے ایک دو سال پہلے ہی پختہ معلوم ہونے لگتی ہیں [1]

جزوی لحاظ سے ٹھیک ہونے کے باوجود بھی کلی طور سے یہ درست نہیں۔ غالباً اس سے زیادہ اہمیت اختلاط کے وقت کو دی جا سکتی ہے۔ جو شادی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے شادی سے قبل جنسی تعلقات کی صورت میں وقت کا انحصار عورت پر ہوتا ہے۔ لیکن شادی کے بعد اس کا تعین مرد کی مرضی سے ہوتا ہے۔ بلکہ انسانی تاریخ میں بھی علاماتی لحاظ سے کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ان غیر متمدن معاشروں میں شادی سے پہلے لڑکی نے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ کھجور کے درخت تلے اپنے محبوب سے ملاقات کرے یا ضروری احتیاط کے بعد اسے گھر ہی میں بلایا جا سکتا ہے یا نوجوانوں کے مشترکہ مکان میں اپنے بستر پر بلانا مفید رہے گا؟ وہ اس کی منتیں یا خوشامد ہی کرے اسے خوبصورت تحائف دے یا کسی دوسرے کی زبانی شاعرانہ انداز میں اظہارِ تمنا

کرے۔ الغرض مرد خواہ کتنی ہی منتیں کیوں نہ کرے آخری فیصلہ لڑکی ہی کرتی تھی۔ اگر لڑکی پسند نہیں کرتی تو وہ باہر نہیں آتی، اپنی چٹائی کا کونا نہیں اٹھاتی۔ یا کھجور کے درخت تلے اس کا انتظار نہیں کرتی۔ لڑکی کے خیالات کی گڑبڑی رہ اور مزاج کی برہمی لڑکے کو کرنا امید کرنے کا بہانہ بن جاتی۔ لیکن شادی کے بعد صورت حالات بدل ہوتی ہے اب میاں بیوی کھانے ہی کے شریک نہیں۔ بلکہ بستر میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ یہ فرش پر بچھی چٹائی ہو یا جنگل میں جھولا نما بستر۔ دریا کے کنارے مچھیروں والی ٹوکری ہو۔ یا کنبہ کے سونے والے جھونپڑے کا دوسرا حصہ۔ غرض بستر کی نوعیت بدل سکتی ہے۔ لیکن خاوند اس معاشرے کے مخصوص قواعد اور تحریمات سے قطع نظر ہر وقت اپنی بیوی کے ساتھ اختلاط کا حق رکھتا ہے۔

قیامِ حمل کے لئے عورت کی جذباتی یا ذہنی ترنگ کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ مختلف عورتوں میں یہ وقوعات مختلف وقفوں اور واقعات پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں کسی اصول کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ مرد کی مسلسل اور غیر دَوری خواہشات عورت کو حمل کیلئے تیار

کرتی ہیں جنس اور انسانی کنبہ پر لکھنے والے کئی مصنفین نے اس امر پر زور دیا ہے۔ کہ مرد زنانہ بالجبر کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ایک اہم حقیقت کو چونکا دینے والے انداز سے پیش کرنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ انسانی نوع میں لاتعلق اور کم بیدار مادہ کے ساتھ ہم بستری کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ہمارے پاس ایسے شواہد نہیں جن کی بنا پر یہ تسلیم کیا جا سکے کہ زنا بالجبر — کلی طور سے عورت

---

[1] اول اینجل نے مجھ سے جب اس مفروضہ کے بارے میں استفسار کیا۔ تو میں نے سب سے پہلے سموا کے بارے میں اپنے پاس موجود مواد سے اس کی توضیح چاہی۔ یہاں میں نے اس مفروضہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس مفروضہ کی بنا پر قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ مختلف مردوں کی مختلف النوع منی ان لڑکیوں کو حاملہ نہیں ہونے دیتی۔

میرے خیال میں غیر متمدن معاشروں کے جنسی حالات سے اس مفروضہ کی توثیق نہیں ہوتی۔

کی رضامندی کے بغیر جنسی اختلاط ۔۔ کبھی معاشرتی لحاظ سے تسلیم شدہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ بالا یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مخصوص سماجی حالات کے باعث یہ جنسی انحراف کی ایک صورت اختیار کرلے۔

جب مرد اور عورت یوں ایک دوسرے سے علیحدہ رکھے جائیں کہ معاندانہ جذبات ردعمل کی صورت اختیار کرلیں، جب نسلی امتیازات ان سماجی یا عقلی بنیادوں پر استوار نہ ہوں۔ جن کی وجہ سے انسان انہیں گوارا کرسکتا ہو یا جب زنا بالجبر کا مجرم ہو یا شک کیا فاتر العقل ہو۔

لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ ایک عورت کے ساتھ واقعی زنا بالجبر ہوا یعنی اس کی شعوری اور لاشعوری مرضی کے بغیر ایک صحیح الدماغ مرد نے غیر مسلح حالت میں اس کے ساتھ جنسی فعل کیا تو اس کے لئے مخصوص قسم کے حالات کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً دونوں کے قد میں غیر معمولی فرق، تمدن کی علیحدگی جس کے باعث لڑکی گویا مفلوج سی ہو جاتی ہے۔ یا مرد بھی صورت حال کو غلط سمجھ کر غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن یکساں سماجی حالات میں رہنے والا ایک عام اور قوی مرد، ایک عام اور قوی صحتمند عورت کے ساتھ زنا بالجبر نہیں کرسکتا۔

ایسے بہت سے غیر متمدن معاشرے ہیں جہاں کے مرد یا عورت یا دونوں ہی خواب بیداری میں تو زنا بالجبر کر لیتے ہوں۔ لیکن معاشرہ نے جہاں حقیقت میں اس کی وقوع پذیری کے لئے کافی سے زیادہ روک تھام کر رکھی ہوتی ہے۔

ہمارے اپنے معاشرہ میں بھی جس زمانہ میں رات گئے تنہا پھرنے والی عورت مجسم دعوت نظر آتی تھی یعنی اس سے نارضامندی کی بجائے رضامندی کی توقع رکھی جاتی تھی تو بھی بچاؤ کرنے والی عورتیں بالوں میں لگانے والی پنوں سے بھی اپنا دفاع کر لیتی تھیں۔

ڈربگو مرد زنا بالجبر کے خواب دیکھا کرتے ہیں اور وہاں کی عورتیں ان کے مقابلہ کے لئے ہر طرح سے تیار رہتی ہیں۔ کچھ یہی حال دیت نل مردوں کا ہے۔ جو ہمیشہ زنا بالجبر کے موضوع سے گرمیٔ محفل بپا کرتے ہیں۔ جو خواب بیداری میں دیکھتے ہیں۔ کہ ایک عورت بے بسی سے یوں مغلوب پڑی ہے کہ اس کے ساتھ زنا بالجبر میں کوئی دشواری نہ ہو۔ لیکن حقیقت کی دنیا میں ان کا یہ دستور ہے کہ جب خاوند اپنی بیویوں کو راہ راست پر نہ لا سکتے ہوں تو وہ تمام ہم عمر مردوں کو اکٹھا کر کے انہیں ٹھیک کرنے کے لئے زنا بالجبر کرتے تھے۔ جدید اور مہذب معاشرہ میں بھی زنا بالجبر ملتا ہے

جب کسی معاشرہ میں جداگانہ ضوابط والے مختلف النوع طبقات ہوں، تو دوسرے معاشروں سے متعلق اجنبی افراد کا طرزِ عمل بعض لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے یا ایسی جگہ جہاں پر دیوانے مجرموں کی تشخیص یا بہبود کے لئے ادارے نہ ہوں۔ لیکن یہ انسان نما حیوانوں پر مبنی اس اقلیت کے طرزِ عمل سے بالکل جداگانہ نوعیت کا فعل ہے جو ابتدائے تاریخ میں ابھی سماجی طریقِ کار ہی وضع کر رہے تھے۔

لیکن یہ اعلیٰ ذوات الثدی سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں جنسی فعل ایک سیدھا سادا اور وراثت پر مبنی طرزِ عمل ہے۔ تمام نروں کو مادہ کی نظروں میں ممتاز حیثیت حاصل کرنے کے لئے آپس میں مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ عین اس موقع پر ہوتا ہے۔ جب کہ مادہ جسمانی لحاظ سے قبولیت کے لئے بھی تیار ہو۔

بعض انسانوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کیوں کہ ایک کنبہ کا مرد اپنی بیوی کی عدم دلچسپی، لبوریت، تھکن، کراہت، حقارت، ملکہ ٹھکرانے پر اپنی خواہشات کا اظہار اور ان کی آسودگی کرسکتا ہے۔

بالفاظِ دیگر حیوانات میں مادہ پہلے تیار ہوتی ہے۔ لیکن انسانوں میں نر پہلے تیار ہوتا ہے اور پھر مادہ کو جنسی فعل کے لئے تیار کرتا ہے۔

لیکن جب انسان حیوانی سطح پر تھا تو نر کی ایسی حالت نہ تھی۔ اعلیٰ ذوات الثدی میں نیز اپنے مخصوص ادوار پہ مادہ جنسی قبولیت کا اظہار کرتے ہوئے جس نر کو ترجیح دیتی وہی اسے حاصل کر لیتا۔ جو نر مادہ سے متاثر یا بیدار نہ ہوتا اسے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس دن وہ دوسروں کے ساتھ جنگ آزمائی نہیں کرتا، بلکہ وہ بے امن اور سکون سے اپنی زیبائش میں مصروف رہتا۔ بلکہ جنسی عیاشیوں کی دوسری جگہ مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر وہ خوراک میں سے بھی زیادہ اچھا حصہ پا سکتا ہے۔ اسے کسی بیوی کی ضرورت نہیں۔ جنسی کارکردگی سے قطع نظر وہ ہر معاملہ میں غیر معمولی طور سے خود کفیل ہے۔ وہ خود ہی خوراک کی تلاش کرتا اور اسے خود ہی ہضم کرتا ہے۔ اپنے جسم کی میل کچیل بھی خود ہی صاف کرسکتا ہے۔ اسے ایسکیمو مرد کی مانند ایک بیوی کی اس لئے ضرورت نہیں کہ وہ اس کے بوٹ چبا کر انہیں نرم کرسکے یا پانی مردوں کی مانند وہ ایک بیوی کی اس لئے حاجت محسوس نہیں کرتا کہ وہ اس کے سوروں کی دیکھ بھال کرے یا بعض دیگر معاشرہ کے نروں کی مانند وہ معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام کے لئے بیوی کو ذریعہ نہیں بناتا یا اس نے جرابیں مرمت نہیں کرانی ہیں یا شکار کے جانوروں کی کھالیں نہیں درست کرانی۔ نہ ہی اسے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے کسی بیوی کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ بچے مادہ کے ہیں وہی ان کی نگہداشت کرتی ہیں۔ اس لئے جب زیادہ جوشیلے نر مادہ کے حصول کے لئے آپس میں سر پھٹول کرتے تو عارضی یا کلی طور سے کم جوش والا نر آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔ اسے کوئی بھی ملامت نہ کرتا اور نہ ہی کوئی مادہ اسے تنگ کرتی۔ وہ غالباً اپنے گرد کے زیادہ پرجوش ساتھیوں کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک زندہ رہ سکے گا۔ اسے نامردی کا خطرہ بھی نہیں۔

لیکن انسانوں کا معاملہ ایسا سیدھا سادا نہیں۔ اب نر اور مادہ کا مستقل ساتھ ہے۔ اور یوں ہم بستری کا عمل بہت طوالت اختیار کر جاتا ہے۔

اب عورت کی قبولیت مردانہ خواہشات کا مستقل ساتھ دے سکتی ہے۔ اب انسانوں کو بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اب کامیاب محبوب کے کردار کی ادائیگی اتنی سہل نہیں رہی۔ کیوں کہ اب مرد کو ایک جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔ اسے اپنے بچوں سے محبت ہے۔ جن کی پرورش وہ سیکھ چکا ہے اور ساتھ ہی اپنے طبقہ میں وہ ایک مخصوص مقام اور مرتبہ حاصل کرنے کا بھی خواہاں ہے۔

اعلیٰ ذوات الثدی کے لئے مادہ محض فوری جسمانی۔ احتیاجات کی بجا آوری کا ذریعہ ہے۔ اور بس! لیکن انسانی نر ۔ ادنیٰ سے ادنیٰ تمدن سے متعلق ہونے کے باوجود بھی ۔ بیوی کا طلب گار رہتا ہے اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ تمام معاشروں میں ہی بیوی کو صرف جسمانی خواہشات کی آسودگی کا ایک ذریعہ نہیں، بلکہ اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر سمجھا جاتا ہے۔

اس لئے انسانی نر جب عورت کے لئے ایک طرزِ عمل اپناتا ہے تو اس کی اساس مختلف النوع کشمکش کرنے والوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس سے طرزِ عمل میں انفرادیت اور پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اگر ہم عورت سے وابستہ تمام سماجی تصورات کو باطل قرار دیں۔ یا ایسے اور قوانین وضع کریں جن کی رو سے عورت محض ایک جنسی معقود ہو کر رہ جائے اور بس۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مادہ کی قبولیت کے جواب میں انسانی نروں کی اکثریت اعلیٰ ذوات الثدی ایسے رد عمل ہی کا مظاہرہ کرے گی۔ جنسی جوش کا حامل نر زیادہ تیزی اور جوش و خروش کا اظہار کرے گا۔ جب کہ سست اور کاہل الوجود اس معاملہ میں بھی ڈھیلا رہے گا۔ یا ہو سکتا ہے کہ وہ سرے سے اسے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھے۔ نر سفید چوہوں میں بھی پرجوش نر اور سست الوجود نر ملتے ہیں۔ لیکن جب انسانوں کے تعلقات میں کورٹ شپ، شادی کی رسم، رشتہ داریاں یا عزت، علاقہ میں رہائش اور اسی قبیل کے دیگر عوامل دخل انداز ہو کر پیچیدگیاں پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ تو انسانی نر اپنے اصل جنسی مطالبہ میں دیگر خواہشات کے موجب کمی بیشی کر لیتا ہے۔

وہ اپنی بیوی کو چھوڑنا نہیں چاہتا ۔۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو وہ اس کے ساتھ کم سوئے اور یا زیادہ لیتا ہے بیوی ازیت ل خاوند مشتعل ہو کر ملا اٹھتا ہے۔" کیا تم نے مجھے لوہے کا سمجھ رکھا ہے کیا میں تمہاری مرضی مطابق ہر وقت تم سے ہم بستری کرتا رہوں؟

"ہم بستری قابلِ نفرت ہے۔" عورت کہتی ہے "صرف اسی خاوند کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ جس کی دراز دستی محسوس بھی نہ ہو۔"

مرد یا عورت جب بیوی، خاوند یا محبوب کی صورت میں کسی کا چناؤ کرتے ہیں۔ تو ان کی ترجیح پر اپنے مخصوص تمدن کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ لیکن کسی تمدن میں انفرادی رجحانات کی طبع آزمائی کے مواقع میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

ایک ہی تمدن سے تعلق رکھنے والے مرد اور عورت کے جنسی تصورات میں یکسانیت ملتی ہے۔ نر جانتا ہے کہ کیسے مرد کو اچھا محبوب سمجھا جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کن حالات میں اس کی بیوی اس پر ہنڈ یا الٹ دے گی، بچہ کی پٹائی کرے گی کتے کو مارے گی اور سیڑھی گرا دے گی تا کہ وہ اس کی جھونپڑی میں چڑھ کر نہ آ سکے۔ یا یہ ظاہر کر دے گی کہ آج وہ اس کے کمرہ میں نہیں۔ بلکہ باہر صرفہ پر شب باش ہو گا۔

اسی لحاظ سے اعلیٰ ذوات الثدی کہیں بہتر ہیں۔ کہ مادہ کی جنسی دوریت کے تابع ہے۔ اور یوں اس کی تسکین میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں پیدا ہوتی۔ لیکن اس کے برعکس انسانی نر کی خواہش کو تکمیل سے قبل کئی پر پیچ مراحل طے کرنا ہوتے ہیں۔ لیکن دیکھا تو یہ گیا ہے کہ جب جنسی وظائف خود کار ہوں تو کارکردگی میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ مثلاً نر کا واسطہ جنسی اشتعال کا ذریعہ سمجھے جانے والے سیدھے سادھے اشارات سے ہو۔

اب یہ خواہ جسم کی عریانی ہو، مخصوص قسم کی خوشبو، ایک عورت کی جنسی بدنامی یا ایک تنہا عورت خواہ وہ جھاڑیوں والی سڑک پر ہو یا کسی خالی مکان میں! لیکن جب جذباتی محبت، اخلاقی پابندیوں، جنسی کارکردگی اور کھیلوں یا مذہبیت کے باہمی تعلق پر نظریات، مردانہ قوت اور تخلیق کے باہمی رشتہ وغیرہ سے وابستہ تصورات جب مردانہ جنسیت سے مملو ہو جائیں۔ تو پھر اس کے وظائف اتنے خود کار، سہل یا قابل اعتماد نہیں رہتے۔ اسے محض اتفاق نہ سمجھا جائے کہ ہر معاشرہ میں لمبڑا دانش وروں، فن کاروں یا ایسے ہی اعلیٰ طبقات میں ضمنی اور ثانوی نوعیت کے کچھ ایسے افعال بھی مروج ملتے ہیں۔ جن سے مردانہ خواہشات کے لئے سامان تہیج ہم پہنچا رہتا ہے۔ یہ خواہ جنسی گڑیاں ہوں، سہرات کے لئے ایک داشتہ ہم جنسیت یا مبہم سے خواب ہائے بیداری کی تجسیم۔ یہ حصہ جسے جنسی انتخاب کی اتنی سہولتیں میسر نہیں رہیں۔ جہاں جنس کے بارے میں الجھے تصورات کا فقدان ہے اور ـــ ظ

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے۔

والی بات نہیں تو وہاں ہم بستری ایک سیدھی سادی سی چیز بن جاتی ہے۔

اگر ذوات الثدی کے پس منظر میں ان کی جنسیت کا مطالعہ کیا جائے تو سہل کرنے کے لحاظ سے مرد عورت اور اعلیٰ ذوات الثدی دونوں پر سبقت لے جاتا ہے۔ جاندار اشیاء کی تاریخ میں جہاں ادھر کنواں ادھر کھائی ایسے حالات پر مبنی انتخابات ملتے ہیں۔ چنانچہ شادی بھی مرد کے لئے ایک ایسا ہی پیناڈ ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ شادی اس کی تمام مردانہ قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے ان کی توانائی میں اضافہ کا موجب بنتی۔

لیکن اس کے برعکس یہ نت نئی الجھنیں جنم دینے کا باعث بن جاتی ہے۔

المختصر۔ وہ سوچ بچار کا جتنا عادی ہے اس کے لئے ہم بستری اتنی ہی مشکل بن جائے گی۔ ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ ہر موقع پر سوچ ہم بستری کا ایک عنصر ہے۔[1]

تمام اشیاء کو محدود سمجھنے والے معاشروں میں یعنی غالباً "توانائی" کا جنس پر خرچ نقصان تصور کیا جائے گا۔ نہ ہی اسے زندگی کے کسی اور شعبہ میں کامیابی کے لئے رکاوٹ! بلکہ اس کے برعکس جنگ آزمائی یا محبت کے لئے کیونکہ خالص مردانہ قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی قوت کا معیار نسبتاً بلند ہو گا۔

اس ساری بحث کو عمومی طور سے ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کہ جب جنسی تعلقات شخصی بنیادوں پر استوار ہوں تو جنسی فریق کی شخصیت، ذہنی کیفیت، زندگی اور افراد کے بارے میں جذبات اور خیالات، تھکن کی حالت وغیرہ سب مل کر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اس سے اصل جنسی کارکردگی میں کچھ کمی ہونے کا امکان بہت قوی ہو جاتا ہے۔

امریکی میدانوں میں بسنے والے بعض "انڈینز" کا جب مطالعہ کیا گیا تو یہ معلوم ہوا۔ کہ ان میں میاں بیوی کا شخصی بنیادوں پر استوار ایک واضح قسم کا رشتہ ہوتا تھا۔ اور اب تک جتنے بھی غیر متمدن معاشروں کا مطالعہ کیا گیا ہے اس معاملہ میں انہیں ان سب پر فوقیت حاصل ہے۔

بعض اوقات ان کا "کورٹ شپ" برسوں چلتا اور شادی کے بعد ہفتوں کی منتوں، اور خوشامدوں کے بعد کہیں جا کر وصل نصیب ہوتا۔ بوڑھے جنگجو بڑی رومانی مسرت سے عمر رفتہ کے ان ایام کو یاد کرتے۔ جب شادی کی ابتدائی راتوں میں وہ جوان بیوی کے ساتھ تمام رات محبت بھری سرگوشیوں میں گزار دیتے تھے۔

عصمت کے کمبل والی عجیب و غریب رسم بھی انہی امریکی "انڈینز" میں ملتی ہے۔ جب بھی کوئی شادی شدہ جوڑا اختلاط کا خواہاں ہوتا۔ تو وہ قبیلے کے بڑے سے سوراخ والا کمبل حاصل کرتا وہاں بھی میاں بیوی اپنے بچوں کے درمیان بڑے بڑے وقفوں پر فخر و انبساط کا اظہار کرتے تھے۔

جن شادیوں کی بنیاد شخصی تقاضوں پر استوار ہوتی ہے۔ وہاں دوسرے فریق کی ذہنی حالت پر مبنی سوچ بچار کی تعبیر ہمیں ان تمدنوں میں ملتی ہے۔ جو اپنے رسم و رواج کے باعث افراد کو فکر کے بوجھ سے آزاد کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں فرد کو خود پر قابو پانے یا اپنی کارکردگی کو موسموں کے تابع کرنے کے لئے شعوری کاوش کی ضرورت نہیں رہتی۔

بالی کو چھوڑتے ہوئے بحر الکاہل کے تمام تمدنوں میں حاملہ بیوی کے ساتھ اختلاط ممنوع ہے اس لئے خاوند کے لئے اپنی بیوی کی پسند و خواہش کا لحاظ رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تحریم ہے اور ممنوع انداز میں قابل تعزیر! اگر اہل قبیلہ کے مرد شکار کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ تو وہ ترغیب سے خود کو بچانے کے لئے عورتوں سے دور اور علیحدہ مل کر سوتے ہیں۔

آرلیش میں حائضہ عورتیں تمام گاؤں والوں سے علیحدہ رہتی ہیں۔ اور اگر انہیں وہاں سے کسی کام کے لئے باہر آنا ہی پڑے تو کم آمد و رفت والے راستے اختیار کرتی ہیں۔ امیروں کے ہاں بیوی اپنی حرمت کی خاطر وقفہ حیض زنان خانہ میں گزارتی ہے۔ ان تمدنوں میں مقابلے کی کارگزاریاں، بچوں کو دودھ پلانا، ان کی پرورش اور شکار، مچھلیاں پکڑنا، جنگ، عبادات اور فنی تخلیق وغیرہ سبھی ایسے کام ہیں جو میاں بیوی کی علیحدگی والے زمانہ میں کئے جاتے ہیں۔

یوں معاشرہ کی رسوم اور تحریمات دیگر کارکردگیوں کے مقابلہ میں جنسی کارکردگی کے عارضی تعطل کے لئے سوچ اور فیصلہ کے بوجھ سے فرد کو آزاد کر دیتی ہیں۔

اب یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ تمدنی قواعد و ضوابط اور تحریمات سے مردانہ طرزِ عمل پر پابندیاں لگا کر انہیں کسی مخصوص سانچہ میں ڈھالنا کتنا آسان ہے۔ اس طرح اس کے جنسی کردار کو بعض اوقات یا

---

[1] قدیم یہودیوں کے قواعد سے اس کا موازنہ سود مند ہے گا۔ ان کے بقول جو مرد سوچ بچار کا عادی نہیں اسے ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ اپنی بیوی کے ساتھ سونا چاہیئے نا سی طرح نہ۔ مزید فکر کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ ہر شب کی ہم بستری لازمی ہے تاکہ اس کا ذہن علمی کاموں اور مطالعہ کے لئے صاف رہ سکے۔ اس صورت میں جنسی فعل خود کار نہیں رہتا بلکہ "موزش" پر مبنی کردار کی صورت اختیار کر کے تمام کرداری سانچہ کے ساتھ یوں ہم آہنگ ہو جاتا ہے کہ اس کی کارکردگی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

مقامات کے لحاظ سے جداگانہ یا علیحدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام امور سے اس جنسی کارکردگی میں کمی پیدا ہوتی ہے۔

جنسی کارکردگی کو معاشرتی اور تمدنی بندھنوں میں جکڑنے سے اس کی خودداری جس طرح مجروح ہوتی ہے اس کا ازالہ ایسا آسان نہیں ہوتا۔ اس لئے لازماً عمل کے لئے کوئی اور سانچہ متعین ہو جاتا ہے۔ ہر معاشرے کا مرد اپنی جنسی قوت پر قابو پا کر اختلاط کے درمیانی وقفوں میں کمی ... سے ایسے جنسی کردار کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کی توقع وہاں کے مرد اور عورت سے رکھی جاتی ہے اور جن پر اس مخصوص معاشرہ کے جنسی تعلقات کی نوعیت کا انحصار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کسی معاشرہ میں مردوں کے لئے مخصوص مواقع اور جگہ پر کسی خاص عورت سے جنسی فعل کی توقع رکھی جائے تو اس کے خلاف باغیانہ رجحانات کی ترویج کا امکان ... ہو سکتا ہے۔ اگر شادی کے بارے میں یہ دستور ہو کہ سب لوگ شب زفاف میں دولہا کی کارروائی دیکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کریں۔ اور اگر اس سے دولہا کی خود کاری اور خودداری پر زیادہ بوجھ پڑتا ہو تو یہ رسم ختم ہو جائے گی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جنسی خودداری پر بوجھ کی صورت میں یہ مرد ہی ہے جو مخصوص تمدنی تقاضوں کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے یا ان کے خلاف بغاوت سے اور ان ہی سے فرد اور معاشرہ کی بہبود وابستہ ہے۔ اس لئے مرد صدق دل سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔ کہ جس تمدن میں مردانہ جنسی خودداری کا تحفظ نہیں ہے۔ وہ شاخ نازک پر آشیانہ ثابت ہوگا۔ کیوں کہ اس صورت میں بچے پیدا کرنے کے لئے کوئی عورت حاملہ نہ ہوگی۔ اس لئے وہ پورے جوش اور سماجی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ جنسی تحریکات پر بے جا پابندیاں بھی عائد کرنے والے اور ان سے زاید از ضرورت تقاضے وابستہ کرنے والی تمام سماجی روایات میں ترمیم و تنسیخ کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

انسانی معاشرہ میں ان سماجی روایات کو جانچ کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ جن سے جنسی تحریک کی خودداری کا بطریق احسن اظہار ... ہو سکے۔ شاید یہ ان وجوہات میں سے ایک ہے۔ جن کی بنا پر انسانی تاریخ میں مردوں کو نر کی پسند عنصر سمجھا جاتا ہے۔

اعلیٰ ذوات الثدی مادہ کے ساتھ انسانی مادہ کے موازنہ سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اس نے اپنی جنسیت پر قابو پانے کے بعد جنس کی سیدھی سادی تحریک کو دیگر ... طریقوں سے تبدیل کر لیا ہے۔

اعلیٰ ذوات الثدی میں مادہ صرف شہوانی مستی کی گردش کے تابع ہے۔ جب دوریت پر مبنی جنسی قبولیت ظہور پذیر ہو تو وہ جنسی فعل کے لئے تیار ہے ورنہ نہیں۔

بعض اوقات وہ کسی نوجوان لڑکی کی مانند تحفظ یا خوراک کی خاطر اپنے آپ کو پیش کر دیتی ہے۔ لیکن یہ بدترین قسم کی طوائفانہ حرکت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انسانی مادہ نے بچپن کی تعلیم کے باعث کئی طرح کے انعامات اور تعزیرات کو اقدار کا روپ دے رکھا ہے۔ اس لئے ... قدرے دوریت کے باوجود ... اس کی جنسی قبولیت معاشرہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے جہاں تک قبولیت کے تقاضوں کا تعلق ہے۔ تو ان کی بجا آوری کے لئے اسے صرف اپنے جسم کو خود سپردگی کے انداز ... میں چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ اسے حیوانی مادہ کی مانند قبولیت کے لئے کسی مستقل خواہش ... کی ... ضرورت نہیں۔ بلکہ ... اس نے حیوانی مادہ کی مانند اپنے آپ کو نر کے حضور پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے انسانی مادہ کے لئے یہ سیدھا سا معاملہ بہت سی پیچیدگیوں کا باعث بنتا ہے۔

وہ محبوب یا خاوند کے حصول کے بعد اسے اپنے بس میں رکھنے کے لئے ہزار جتن کرتی ہے۔ آنے والی کلفت مطابقت کے لئے وہ لمحاتی کیفیات کو برقرار رکھتی ہے۔ الغرض وہ اپنی قبولیت سے تمام انسانی تعلقات کے وسیع پس منظر میں مطابقت پیدا کرتی ہے۔ اب اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے بہت کم شک و شبہ رہ گیا ہے کہ اگر مرد کسی ناپسندیدہ عورت سے ہم بستری کی خاطر اپنی خواہش کی بیداری کے لئے جب میکانکی طور سے کچھ افعال و حرکات کرتا ہے تو وہ اس عورت کے مقابلہ میں اپنے آپ اور اپنی فطرت پر کہیں زیادہ ظلم کرتا ہے۔ جو نوبی خواہش کے بغیر بھی ناپسندیدہ مرد سے اختلاط کرتے ہوئے اس کی خواہش کو کئی طریقوں سے ابھار سکتی ہے۔

تہذیب و تمدن مرد اور عورت پر پابندی کی صورت میں تناؤ کا جو بوجھ لادتے ہیں۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہر معاشرہ میں شادی کا طریقہ سود مند ہو سکتا ہے۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد معاشرتی جنسی تقاضوں سے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔ مرد کئی طرح کی نوازشوں اور انعامات کی خاطر جنسی ... طریقے اختیار کرتا ہے۔ ادھر عورت بھی ہر ممکن طریقوں سے ہی جنسی قبولیت پر قابو پانے کی سعی کرتی ہے۔

اگر یک زوجگی کی صورت میں ایک ہی عورت کے ساتھ مستقلاً سونے سے مرد جنسی تجربہ کی یک رنگی سے اکتا جاتا ہے اور بے کیفی کا شکار رہتا ہے تو کثرت ازدواج میں کئی بیویوں کے جنسی مطالبات پورے کرتے کرتے اسکی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ عورتیں بھی کوئی خوش نہیں ملتیں کیونکہ یک زوجگی کی صورت میں ... بیوی خاوند کے مسلسل جنسی تقاضوں سے تنگ آ جاتی ہے۔ ادھر کثرتِ ازدواج کی صورت میں ہر بیوی اپنے خاوند کے جنسی قرب کے لئے ترغیب کہاں ملتی ہے۔ اس لئے اگر تغیر پذیر معاشروں کے ہمدرد افراد اس جنسی توازن پر داستان یا فلسفہ طرازی شروع کر دیں۔ تو جلد ہی وہ یہ دریافت کر لیں گے کہ تہذیب نے جنسی تعلقات کی جو اساس مقرر کی تھی وہ ویسی ہی ہے یعنی مرد کو ہر صورت میں جنسی فریق میسر آئے۔ جب کہ عورت کو اپنی قبولیت پر قابو پانا چاہیئے۔

تاریخ کے بعض ادوار اور بعض معاشروں میں مرد پر پڑنے والے بوجھ پر بہت زور دیا جاتا رہا ہے۔ بعض معاشروں جیسے بالی کے مرد اس حد تک غیر شخصی اور ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے ہیں۔ کہ ایک کھیل سے لطف اندوزی کے باوجود بھی سامعین ایک دوسرے سے یا رقص کا مظاہرہ کرنے والوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتے۔ اب ایسے حالات میں نامردی ... بے تعلقی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

> ہر مرد اس لئے ہراساں رہتا ہے۔ کہ بیوی حاصل کرنے کے لئے جن سماجی ضوابط کی پابندی لازمی ہے۔ اگر اس کا جسم اور اس کی ہر دم منعقد کیفیات ان کی بطریق احسن بجا آوری نہ کر پائیں اور بچے پیدا نہ ہوتے۔ تو کیا بنے گا۔

اور کمال تو یہ ہے کہ جس طرح شادی پر مجبور کرنے کے لئے بعض پابندیاں ہیں اسی طرح بچے پیدا کرنے والوں کے لئے سماجی تعزیرات موجود ہیں۔

بالی میں مردانہ قوت کو مرد کے ہر دم تغیر پذیر جنسی ردعمل کا نام دیا جاتا ہے۔ کیونکہ عورت کے خوف کے باعث بالآخر ہتھیار پھینک دیتا ہے۔ وہ ابتدا میں اس کے حسن سے متاثر ہونے کے باوجود بھی ان تعلقات کو دائمی صورت نہیں دے پاتا۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کسی خوبصورت لڑکی کی بدصورت بہن ۔ جو تھیٹر میں ماں اور ساس ہی کی مانند ملبوس تھی ۔ اس کے پلے باندھ دی جاتی ہے۔

آرالیش کے مردوں کے نزدیک اصل مسئلہ قوت کی برقراری نہیں بلکہ جنسی لحاظ سے قوی عورتوں کے دام تزویر سے خود کو بچا لے رکھنا۔ "وہ تمہارے گال اپنے ہاتھوں میں تھام لے گی. اور تم اس کی چھاتیاں اپنے ہاتھوں میں لے لوگے۔ تمہاری کھال تک کپکپا اٹھے گی، تم دونوں اکٹھے سو جاؤ گے۔ تب وہ تمہاری جسمانی رطوبت کا کچھ حصہ چرا لے گی۔ بعد ازاں وہ یہ ایک ساحر کے حوالے کر دے گی اور تم ختم ہو جاؤ گے۔" ان دونوں مردوں کے لئے اپنے گھر کی محفوظ چار دیواری یا سفر میں ایسے پڑاؤ ۔ جہاں پر خالہ کی، رشتہ کی بہن یا بھابی وغیرہ ہوں ۔ کو چھوڑتے ہوئے باقی تمام دنیا ان پر اسرار عورتوں سے بھری پڑی تھی جو

بڑی آسانی سے انہیں دام حسن میں پھنسا کر انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتی تھیں۔ ان مردوں میں سے معالج کے پاس اسی کھوئی ہوئی قوت کی بحالی کی دوا کے لئے کبھی بھی کوئی نہیں آیا۔ بلکہ ہمیشہ کسی عورت کے جنگل میں پھنس جانے کے بعد مضر (ہر) اثرات سے نجات پانے کے لئے وہ کسی نئے آورشے کے طالب ہوتے ہیں۔ اس ذہنی فضا کا اثر یہ ہوا کہ عام حالات میں بھی ان کے جنسی تعلقات کوئی ایسے خاص آسودگی بخش نہیں ثابت ہوتے۔ وجہ یہ ہے کہ ان معاشرتی عقاید اور ذہنی فضا کے وجود میں اگر کوئی عورت تیز جنس کی حامل ہوتی تو وہ مشکوک ذہن اسے بھی ایسی عورت تصور کرتے جو انہیں لقمۂ اجل بنانے کی خاطر درغلا رہی ہو۔

میلس میں ہم بستری (جسے ڈاکٹر کرنزے "اخراج" کے نام سے پکارنا پسند کریں گے) کیوں کہ بول وبراز کے ساتھ ملالی کی گئی وہاں کے دستور کے مطابق جنسی تعلقات مسرت سے عاری ہیں۔ اس معاشرہ کے میاں بیوی کے نقطۂ نظر سے وہ گھر مثالی ہے جہاں صرف دو بچے ہوں۔ ایک بچہ آگ کی ایک طرف اپنے باپ کے ساتھ سوتا ہے۔ اور دوسرا اپنی ماں کے ساتھ آگ کی دوسری طرف۔ جب میاں بیوی کی عمر کچھ بڑھ جائے۔ اور بچے بھی کچھ بڑے ہو چکے ہوں تو اب وہ قدرے اطمینان کا سانس لے کر ایک دوسرے کے ساتھ بے جھجک گفتگو کرتے اور اکٹھے کھا پی لیتے ہیں۔ اب وہ خود کو اس رشتہ کے باوجود آزاد محسوس کرتے ہیں جو ان کے لئے شرم وکراہت کا باعث تھا۔ اس لئے وہاں شرح پیدائش بہت ہی کم ہے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں مردانہ کمزوری بھی کوئی مسئلہ نہیں رہ جاتی۔ مردوں کو اپنے بارے میں کوئی خاص خوش فہمی نہیں اور عورتیں کیونکہ جنس کی طرف قطعاً مائل نہیں ہوتیں اس لئے غالباً ان کا انکار ہی جنس سے وابستہ شرم پر قابو پانے کے لئے تہیج کا کام کرتا ہوگا۔ ان مردوں کے لئے وہ جنس باعث تسکین ہوگی جس میں بہت سے مرد کسی طوائف سے زبردستی ہی لطف اندوز ہوں۔

میرے مطالعہ کردہ تمام معاشروں میں سموا کے لوگوں کا جنس کے بارے میں طرز عمل بالکل فطری اور روشن ترین ہے۔ وہ جنسی فعل میں شخصیات کے باہمی رشتہ پر بہت زور دیتے ہیں۔ اس معاشرہ میں ایسے مرد کو کامیاب محبوب سمجھا جاتا ہے جو ایک عورت کو جنسی لحاظ سے مطمئن کرنے کے ساتھ ساتھ آسودگی پالے۔ اس لئے ایک ہی رات میں اگر ایک لڑکی ایک کے بعد کسی دوسرے عاشق کو بھی بلا لے تو پہلے کے مردانہ وقار کو سخت ٹھیس لگتی ہے۔ ایسا ناکام عاشق اپنی ناکامی کا باعث مردانہ کمزوری کی بجائے اپنے اناڑی پن کو ٹھہرائے گا۔

سموا کے لوگ جلد باز نہیں اس لئے یہاں کار الفت تدریج مراحل تکمیل طے کرتا ہے لڑکی کے جسم کو آہستہ آہستہ لطف اندوزی کے لئے بیدار کیا جاتا ہے۔ مرد کو مطابقت کی آزمائش نہیں بلکہ وہ اس تعلق کو خوشگوار سے خوشگوار تر بنانے کی سعی کرتا ہے۔ سموا میں جنسی عدم مطابقت والے مردوں کو "لوٹے تونولو" کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مرد ہیں جو راتوں کو چوری چھپے غنچۂ شباب سے لطف اندوزی کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں ہم جنسی چور کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ یہ خود حاصل نہیں کر سکتے۔ اسے یہ دھوکہ سے رات کی تاریکی میں انتظار کرنے والی لڑکی کی تنہائی اور قبولیت سے فائدہ اٹھا کر دغا اور فریب سے حاصل کر لیتے ہیں۔ سموا میں جنسی سہل پسندی کا باعث بچوں کی پرورش کا طریقہ ہے۔

بچے کے ذاتی تعلقات کا حلقہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس ماحول میں پرورش پانے والے بچے کے ہیجانات میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ ماں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کیوں کہ وہ لوگ بچے کے ہیجانات کی نشوونما کا سلسلہ منقطع کر دیتے ہیں۔

اس معاشرہ میں باہمی مقابلہ خاموش قسم کا ہوتا ہے اور یہ مسابقت بعض حدود کے اندر رہتی ہے۔ ذاتی کامیابی کے لئے مرد اور عورت کو کوئی خاص پاپڑ نہیں بیلنے پڑتے۔ دونوں جنسوں کی باہمی محبت ایک ہلکا پھلکا اور خوشگوار رقص ہے جس رقص میں اگر مرد ماہر اور پرکشش نہ ہو تو پھر اسے رفیق نہ ملیں گے۔ بعد میں یہ اچھے کھانے کی ایک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسا کھانا جسے دونوں عموماً اکٹھے کھاتے ہوں۔ اور وہ بھی بہت سہل پسندی اور خوش مزاجی سے۔ اس نوجوان کے تعلقات شرم کی پیدا کردہ الجھنوں سے مبرا ہوتے ہیں۔

اس مقصد کے لئے دوسرے کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھنا یا اس کی روح کی گہرائیوں میں جھانکنا ضروری نہیں ہال میں فضا ہمیشہ نغمات سے گونجتی رہتی ہے۔ اور ہر گاؤں میں قربانیاں اور مذہبی رسومات لوگوں کا خاصہ وقت لے لیتی ہیں۔ نامکمل معبد گاہ پر مجسموں کی تکمیل اور سوزی کا معیار ہفتوں کی محنت کے بعد کھجور کے درختوں سے بھی اونچا بنایا جاتا ہے۔ ان سب پر ان کا کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ سموا کے رقص بہت سادہ ہیں۔ اور وہاں کے لوگ بھی ان سے کبھی نہیں اکتاتے۔ ان کے رقص میں کسی داستان کی بجائے رقص کرنے والوں کی جسمانی حرکات حسن کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے اس لئے ملبوسات کی بجائے جوان جسموں کی چمک دمک زیادہ پسند کی جاتی ہے۔

سموری تمدن میں ہر بچہ سیدھی سادی خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس کی تسکین کے لئے تمام ذرائع بہم پہنچائے جاتے ہیں۔

میں نے انسانی تمدن میں بسنے والے نر اور مادہ کو پیش آنے والی مشکلات کی اخلاقی نوعیت پر زور دینے کے لئے اس مضمون کا عنوان "مردانگی اور نسائی قبولیت" رکھا ہے۔ متمدن نر کے لئے ہمیشہ اس کا خطرہ ہے کہ کہیں تہذیب و تمدن کے تقاضوں اور پابندیوں سے اس کی جنسی خودداری میں کمی واقع نہ ہو جائے۔ اس کے برعکس تہذیبی تقاضے نسائی قبولیت میں اضافہ کا موجب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ منصوبہ بندی کی صلاحیت اپنے گھر کی تمنا، ازدواج، بچے، غذا، رفاقت یا تعلقات کی ایسی نوعیت جو اس کی جسمانی خواہشات سے خصوصی تعلق نہ رکھتی ہو — وہ ان سب سے اپنی قبولیت میں اضافہ کر سکتی ہے۔

یہ درست ہے کہ بعض حالات میں نسائی جوش میں کمی خاصی خطرناک ہو سکتی ہے۔ بعض غیر معمولی حالات کے تحت یا معاشرتی اقدار میں عارضی تعطل کے باعث صحیح ہم بستری ممکن نہیں رہتی۔ بلکہ نر اور مادہ میں عارضی نوعیت کا ملاپ ہوتا ہے۔ اس کی نمایاں مثال جنگ میں مغلوب شہر کی عورتوں سے تعلقات یا بیاہتا افراد کی وہ بے وفائیاں ہیں۔ جن کی اساس ہی جنسی جوش پر استوار ہوتی ہے۔

ایسے حالات میں عورت کا فعال جوش محض اس لئے قابل ذکر ہو جاتا ہے کہ مرد کی زندگی کی چھوٹی موٹی ہزار باتوں سے بھی غیر پیچیدگی نہیں اختیار کرتی۔

مرد اگر جنسی لحاظ سے عورت کو سرد مزاج پائے تو وہ اسے چھوڑ کر نسبتاً کم مردانہ قابل حصول کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ گرم مزاج مرد سرد مزاج داشتہ سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ انسانی تہذیب کے تقاضے مرد کو ایک مستقبل پسند انسان یا خاوند بناتے ہیں۔ اس لئے جب ہم مرد کا اس روپ میں جائزہ لیتے ہیں۔ تو اس کے ذہن میں اور بھی بہت سے تقاضے ہیں۔ وہ صرف بعض جسمانی تقاضوں کی تکمیل کے لئے کسی مادہ کی جستجو نہیں کرتا۔ کیوں کہ اس جب تو ان کا ملاپ اعلیٰ ذوات التدی کی مادہ کی جنسی گرمی پر نر کے ردعمل والی بات ہو جائے گی۔ اسے تو ایک بیوی کی تلاش ہے۔ ایسی بیوی جو ایک حد تک اپنی قبولیت سے اس کی غیر مردی مردانہ قوت کے ضمن میں یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ غیر ضروری اور غیر اہم باتوں سے مردانہ قوت کی شدت میں کمی بیشی بھی ہوتی رہتی ہے۔ شرم، امید، خوف، کامیابی، بچت، عزت، اقتدار، ادنیٰ شکار، جنگ یا دفتر میں اپنی بات منواتا ہے — ان سب امور کا اس کی قوت سے ...

تعلق ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ اس پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔

ایسے کئی غیر متمدن معاشرے ملتے ہیں۔ جہاں کی عورتوں سے صرف قبولیت کی ہی توقع رکھی جاتی ہے۔ چھوٹی لڑکیاں اپنی ماؤں یا باپوں کے دستِ شفقت پھیرنے یا بے جھجک جسم کے ساتھ چمٹانے سے یہ سمجھ جاتی ہیں۔ کہ عورتوں کے لئے خصوصی طور سے جنسی یا فعال ہوئے بغیر۔ صرف قبولیت ہی کافی ہے۔ ایسے تمام معاشروں میں عورت کے جنسی نقطۂ عروج کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حیاتیاتی لحاظ سے انہیں اس کی اتنی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہو گی۔

یہ درست ہے کہ انسانی معاشرہ اپنے لئے ایسے تمدنی سانچے وضع کر سکتا ہے جو حیاتیاتی بنیادوں پر قطعاً استوار نہ ہونے کے باوجود بھی رہن سہن کے قابل ہو سکتے ہیں۔ ہمارا کسی کردار مثلاً چلنا پھرنا وغیرہ اس وقت ہی مکمل ہوتا ہے جب اس کی بنیاد یعنی رجعی حرکات ختم کر دی جاتی ہیں۔ [1] گیسل انسانی پختگی کو مختلف ادوار اور مدارج میں تقسیم کرتا ہے اس نے جب بھیڑیوں میں چلنے والے ایسے بچے کی داستان سنی جو دو بھیڑیوں کے ساتھ ہاتھ پاؤں سے چل رہا تھا۔ تو اس نے اس پر یقین کر لیا تھا [2] کچھ یہی حال ہمارے طعامی کردار کا ہے۔ ہمارا کھانا اور اس کے تمام لوازمات کا جسمانی تقاضوں کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اس لئے یہ اب سماجی آموزش کا معاملہ ہے۔

غذا کے لئے بعض اصول اور عادات وضع کر گئے جن کی رو سے مختلف کھانے مخصوص طریقوں سے پکانے کے بعد مقررہ اوقات میں ہی کھائے جاتے ہیں۔ یہ تجربات سے واضح ہے کہ بچوں کے سامنے غذائیت سے بھرپور ہر طرح کے کھانے موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا انتخاب متوازن ہونے کے باوجود بھی انفرادی پسند کے تابع ہو گا۔ کل انہوں نے جس کھانے میں بے اعتدالی کی تھی آج اس میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے وہ کسی اور کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ حالانکہ صرف غذا کا ماہر ہی مخصوص کھانے کے معائنہ سے کسی بے اعتدالی کے بارے میں جان سکتا ہے۔

اگر چوہوں کو تقویت دینے والی مصنوعی چیزیں ـــ حیاتین اور معدنی اجزاء ـــ شیشے کی نلی میں رکھ کر دی جائیں تو وہ غذا مہیا کرنے والے حیاتی کیمیا دان کے مقابلہ میں بہتر چناؤ کا ثبوت دیتے ہیں۔ اب یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اگر چوہوں کو بھوکا پیاسا رکھنے کے بعد چھوڑا جائے اور ان کے سامنے خوراک اور پانی نہ ہو اور نہ ہی وہ سونگھ کر ان کی موجودگی کا پتہ لگا سکتے ہوں۔ تو ان حالات میں غذا کی بجائے پانی کی طرف جائیں گے۔ لیکن اگر ان دونوں کو پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے تو وہ پانی کی ضرورت اور اس کے معتدل اثرات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے من پسند کھانے کو ترجیح دیں گے۔ اب تو خواہ اس سے ان کی پیاس بڑھ کر باعث تکلیف ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ہمارے پاس جو تھوڑے بہت شواہد موجود ہیں ان کی بناء پر یہ مفروضہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ انسان حیاتیاتی لحاظ سے غذائیت کا ایک موزوں اور سود مند ڈھانچہ تعمیر کرنے کی خاطر غذائیت بخش طور کھانوں کے انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس صلاحیت سے سوائے غیر معمولی حالات کے کبھی بھی کام لینے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

موجودہ صدی میں ایسے ہی حالات ملتے ہیں۔ اب غذائی تجزیہ سے غذا بخش عناصر کی علیٰحدگی ممکن ہو چکی ہے۔ انسانی بچہ اپنے معاشرہ کی پسند اور اس کے معیار پر پوری اترنے والی غذا کھانی سیکھ جاتا ہے۔ بچہ خوراک کی امر و نہی سیکھتا ہے۔ یہ غذائی آموزش کسی مخصوص حیاتین کی احتیاج پر مبنی حیاتی کیمیائی تقاضوں کی مرہونِ منت نہیں ہوتی۔ بلکہ والدین کی پسند، کراہت سزا اور جزا، وغیرہ اس کا باعث بنتی ہیں۔ ہو سکتا ہے جب وہ کھانے کے لئے کوئی چیز دریافت کرتا ہے تو وہ داخلی یا حیاتیاتی تقاضوں ہی کے باعث ہو۔ لیکن خوراک کے بارے میں اس کی پسند و ناپسند آموزش سے وابستہ طریق کار پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ کہ بچہ ایک دن میں سمجھ جاتا ہے "یہ میرے کھانے والی غذا ہے، یہ دوسروں کی غذا، تو ہو سکتی ہے لیکن میری نہیں ہے۔" "اور اسے تو کھایا ہی نہیں جا سکتا"۔ اس لئے دانتوں پیڑو کی بناوٹ، بعض امراض کی مدافعت اور زخموں سے صحت مندی کی استعداد ـــ ان سب کا انحصار دراصل غذا کے بارے میں اس ذرف نگاہی پر ہوتا ہے جو موروثی رجحانات کی بجائے آموزش پر مبنی ہوتی ہے انسانی تمدن کے بارے میں اپنی معلومات کی روشنی میں جب اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ تولید کا حیاتیاتی تقاضوں کی بجائے آموزش پر مبنی کردار پر کیوں انحصار ہوتا ہے۔

انسانی مادہ میں جنسی تہیج کی استعداد ملتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں کم عمر لڑکیوں میں جلق کم ملتا ہے یہی حال بحرالکاہل کے ان تمام معاشروں کا ہے۔ جن کا کہ میں نے مطالعہ کیا ہے ـــ لیکن یہ محض ساخت کا معاملہ ہے۔ کیونکہ بچپن میں نسائی تناسلی اعضاء لڑکوں کی مانند عموماً کھلے نہیں رہتے اس لئے ماں یا بچی انہیں زیادہ ہاتھ نہیں لگاتی۔

جلق اگر معاشرہ میں تسلیم شدہ نہ ہو اور والدین یا بڑے بچے چھوٹے بچوں کو نہ سکھاتے ہوں تو پھر لڑکی کے اسے خود بخود سیکھنے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن دلیل کے اس پہلو سے قطع نظر ـــ ہمارے پاس ابھی ایسا مواد موجود نہیں جس کی بناء پر یہ کہا جا سکے کہ جس طرح مرد کے انزال سے عورت حاملہ ہوتی ہے کچھ اسی طرح عورت کے ہیجان شہوت کا بھی قیام حمل سے بلا واسطہ تعلق ہے۔

مرد محض اپنی جنسی قوت سے عورت کو حاملہ کرتا ہے خواہ وہ خود اس فعل سے کتنا ہی لاتعلق کیوں نہ ہو۔ یا اس نے جنسی تہیج کے لئے مصنوعی سے مصنوعی طریقے ہی کیوں نہ اپنائے ہوں۔ اگر ایک معاشرہ بچوں کی نشو و نما کے لئے ایسے طریقے نافذ کر دے جن سے مردوں کی ابتدائی اور انزالی صلاحیتوں پر پابندی عائد ہوتی ہو تو وہ معاشرہ اپنی موت آپ ہی مر جائے گا۔

اس لئے یہ تسلیم کر لینے کی کوئی وجہ نہیں کہ قیام حمل کے لئے نسائی ہیجان شہوت کی بھی ـــ عورتوں کی اکثریت کی صورت میں ـــ ایسی ہی اہمیت ہے۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ نکالتے میں حق بجانب ہیں۔ کہ انسانی مادہ میں ہیجان شہوت کی صلاحیت اپنی نشو و نما کے لئے معاشرہ کی مرہونِ منت ہے۔ یا پھر یہ ایک ایسی استعداد ہے جسے کسی فرد کی زندگی میں نشو و نما پانے کا موقع ملے نہ ملے ـــ اسے نسائیت کا لازمی اور موروثی عنصر نہ سمجھنا چاہیئے۔ جس طرح حاملہ کرنے کے لئے لڑکا کا ٹھیک ہونا لازمی ہے۔ نہ ہی دخول کی صلاحیت کا ـــ مادہ میں مفروضہ ہیجان شہوت سے مقابلہ کرنے کی بجائے تمام تولیدی مراحل ـــ قیام حمل، پیٹ میں نو ماہ تک بچہ رکھنا اور پھر پیدائش سے مقابلہ زیادہ موزوں اور سود مند ہے۔

چوہوں پر کئے گئے بعض دلچسپ تجربات سے جنس اور آموزش کے باہمی تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ تجربہ کرنے والے ماہر نے نر اور مادہ کی کارکردگی کے لئے جنسی فعل کو اکائی تصور کرتے ہوئے جب ان کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ چوہے کی آموزش کا جنسی فعل کے ساتھ مثبت قسم کا تعلق ہے جب کہ چوہیا اس سے عاری پائی گئی۔

---

1. MCGRAW, MYRTLE B. GROWTH A STUDY OF THE JOHNN AND JIMMY.

2. GESEEL, ARNOLD. WOLFCHILD AND HUMAIN CHILD.

اس ضمن میں بعض تشریحات اس امر پر زور دیتی ہیں کہ جنسی فعل پر مادہ کے مقابلہ میں نر کا کردار زیادہ پیچیدہ اور تھکان پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ لیکن جب ان ہی تجربات کو مزید وسعت دیتے ہوئے چوہیا کی آموزی استعداد کا جنسی عمل کی بجائے مادرانہ کردار کے ساتھ موازنہ کیا گیا تو وہ چوہے سے بڑھ گئی۔

دراصل مادہ کے حیاتیاتی تقاضوں کی تکمیل صرف جنسی فعل سے نہیں ہوتی کیونکہ اس میں تو صرف ساکت رہنا ہی کافی ہوتا ہے۔ بلکہ اس مقصد کے لئے اس کے مادرانہ کردار کو بحیثیت ایک کل دیکھنا ہوگا۔

دراصل یہ مسئلہ متناقض صورت اختیار کر چکا ہے۔ ایسے معاشرے موجود ہیں جن میں عورتیں جنسی لحاظ سے فعال ہیں یہ ہیجان شہوت تسلیم ہی نہیں کیا جاتا بلکہ مردوں ایسے آزاد طریقہ سے اس کا حصول بھی کیا جاتا ہے۔ جو عورت جنسی لحاظ سے فعال نہ ہو اسے سزا دی جاتی ہے۔ میرے مطالعہ کے لحاظ سے منڈوگر ہی ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں عورتوں سے بھی مردوں کی جنسی آسودگی کی توقع رکھی جاتی ہے۔ اگر ایسے معاشرہ میں بھی بعض عورتیں جنسی آسودگی سے محروم رہتی ہیں تو اس کی وجوہات کی تلاش ایسی مشکل نہیں، کیونکہ جسمانی کمزوری، جنسی عدم آموزش یا ایسی ہی اور وجوہات کی بنا پر ایسا ہو سکتا ہے۔

اس کے برعکس جب ہم آراپش معاشرہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں کی عورتوں کے بقول انہوں نے نہ تو کبھی ہیجان شہوت محسوس کیا نہ معاشرہ نے تسلیم کر کے انہیں کوئی نام ہی دیا۔ پھر بھی آٹے میں نمک کے برابر کچھ ایسی عورتیں بھی مل جاتی ہیں جن کی شدید جنسی خواہشات صرف ہیجان شہوت سے ہی آسودگی پا سکتی ہیں۔ اگر ہم تمام نسائی دنیا کے لئے اس پیدائشی خواہش کو جھٹلا دیں تو پھر ان چند عورتوں کا کیا ہوگیا ہے۔ کیا۔ بعض عورتوں کے نظریات کے مطابق — یہ عورتیں زیادہ مردانہ ہیں یعنی ان کے حمائی اوصاف کی نوعیت کچھ اور طرح کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ شدید جنسی خواہشات کی حامل ایسی عورتوں کا جب دیگر عورتوں سے موازنہ کیا گیا تو ان میں مردانہ پن کی جھلک ملتی تھی۔ کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ انہوں نے بچپن کے کسی تجربہ سے یہ سیکھنے کے بعد کہ ہیجان شہوت بھی انسانی جسم کا خاصہ ہے۔ اس کے لئے اشتہا پیدا کر لی؟ یہ بالکل غذا کی مانند ہے۔ دونوں جنسوں کے افراد ہی بعض مخصوص غذاؤں کو مرغوب سمجھ کر ان کے لئے زیادہ اشتہا محسوس کرتے ہیں۔ دراصل اشتہا کا حیاتیات کے بھاری تقاضوں پر استوار ہونا کوئی ضروری نہیں اس کا امکان ہے۔ اس سے ہمارے ذہن میں بعض پاک باطنوں کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں جن سے وہ اچھی (جو بیدار نہ ہو) اور بری (جو بیدار ہو) عورتوں کی تخصیص کیا کرتے تھے۔ عورت کے لئے ہیجان شہوت لازمی قرار دینے والے نظریہ کے حامی حضرات بیدار نہ ہونے والی اچھی عورت کو ایک کٹر تہذیب کی مسخ شدہ صورت سمجھ سکتے ہیں۔

اس کے متبادل نظریہ کی رو سے ہیجان شہوت کی استعداد تمام عورتوں میں موجود ہوتی ہے صرف مدارج کا فرق ہے اور ان میں بھی بہت کم اور برائے نام سا فرق ملتا ہے۔ ان کا اخراجات شہوانیت کی حساسیت میں کمی بیشی پر انحصار کرتا ہے۔ اور اسی کا امکان ہے کیونکہ عورت کے لئے جنسی لذت صرف جسم کے کسی ایک مخصوص عضو سے وابستہ نہیں ہوتی۔ بلکہ مختلف عورتوں میں مختلف اعضا — لب چھاتیاں وغیرہ — جنسی لذت کے لئے باقیوں کی نسبت زیادہ نشوونما یافتہ ہو جاتے ہیں۔

سموا ایسے معاشرے میں جنسی فعل سے قبل متنوع اور طویل جسمانی کھیل لازمی سمجھا جاتا ہے اس لئے وہاں کے مرد ایسے گر جانتے ہیں کہ وہ ہر طرح کی جسمانی ساخت والی عورت کو بھی بیدار کر سکتے ہیں۔

لیکن جن معاشروں میں جنسی فعل سے قبل ایسے جسمانی کھیل ممنوع ہوں یا بعض معاشرتی قواعد — کپڑے پہنے رہیں، تاریکی ہو، خوشبویات سے جسمانی بو ختم کی جائے — کی وجہ سے عورتوں کی یہ استعداد جو موزوں اور مناسب حالات میں نشوونما پا سکتی تھی۔ اکثریت یا سب ہی کے لئے نظر انداز کر دی جاتی ہے۔

یہ اہم نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ اسے جنسی سرد مہری نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ ایسے معاشرہ میں اس کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔

آئیے! اس موقع پر نسائی تولیدی گردش کے ان مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں۔ جو معاشرتی تقاضوں کی وجہ سے یا تو نشوونما پا جاتے ہیں اور یا نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً حمل میں مرض سحر (متلی اور سر چکرانا) یا تو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور یا پھر اسے ہر ایک کے لئے لازم سمجھ لیا جاتا ہے۔ اب جس عورت کا سر نہ چکراتے یا اسے متلی نہ ہو تو وہ استثنائی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے صرف پہلے بچے کے لئے لازمی سمجھ لیا ہے۔ جن معاشروں میں اسے تسلیم کیا جاتا۔ یا صرف پہلے بچے کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ ان میں بھی دل متلانے اور قے کرنے والی کچھ عورتیں مل جاتی ہیں۔ بعض قے کو بچہ کی ناپسندیدگی کے اظہار پر محمول کرتے ہیں لیکن ہمارے معاشرہ میں تو حمل سے وابستہ تمام سلسلہ کا مرکزی نقطہ ہی مرض سحر بنتا ہے۔ اور اس کی اولیں علامت پر ہی حاملہ عورت کی سہیلیاں اس کی تکلیف پر مبنی احساسات کا ایک سلسلہ شروع کر دیتی ہیں۔ اس لئے اس لئے مفروضہ کو تسلیم کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کہ یہ قے اور متلی بچہ کی لاشعوری ناپسندیدگی ہے۔

بسا اوقات حیض کے عارضی تعطل کے ساتھ مرض سحر حاملہ ہونے کی شدید خواہش کا غماز بن جاتا ہے۔ اس صورت میں قے اور متلی کو حمل کی تسلیم شدہ سماجی نشانی سمجھتے ہوئے آرزومند سوچ کی بنا پر جسم کو ان میں مبتلا کیا جاتا ہے جن معاشروں میں یہ حمل کی نشانی نہیں یا انہیں صرف پہلے حمل سے ہی مخصوص سمجھا جاتا ہو تو وہاں انہیں بچے کی ناپسندیدگی کے اظہار پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نفسیاتی عوامل کی پیدا کردہ قے کی صورت میں بھی یہ نارمل کی حدود میں آجاتی ہے۔ البتہ شماریاتی لحاظ سے یہ غیر معمولی ہے۔ اور تمدنی توقعات کے باوجود بھی مرض سحر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ دگر برائے نام مرد جنسی کہن سالی کے وقت جنسی اشتعال اور سرگرمی محسوس کرتے ہیں۔ جہاں کہیں ایسا ہو تو اسے نسائی اختناق الرحم کے ساتھ تطبیق کا ایک انداز بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ عضویت کے توازن میں بے اعتدالی سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ البس ہم مرض سحر کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہاں معاشرتی لحاظ سے علامات حمل میں اس کا شمار ہوتا ہو۔ پہلے حمل میں اس کا وجود تسلیم کیا جاتا ہو تو عورتوں کی اکثریت اس کی شکار ملے گی لیکن جن معاشروں میں ایسا نہیں وہاں معدودے چند اس میں مبتلا ملیں گی۔

ہر انسانی عضویت میں قے کرنے کی صلاحیت ملتی ہے اور اس میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ حالات کے تحت اسے نظر انداز یا ممنوع بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہی کچھ تکلیف دہ حیض کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ سموا میں حیض کے ساتھ ہلکی سی درد نارمل اور لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اور وہاں لڑکیوں کی کثیر تعداد نے اس پر صاد کیا۔

آراپش لوگ حیض کے ساتھ کسی درد کو تسلیم نہیں کرتے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ پہاڑ کے پہلو میں بنی ہوئی ہر دم ٹپکنے والی کٹیا میں جب تمام دن مرطوب زمین پر ایک معمولی سی چٹائی پر بے آرامی سے بیٹھے گزار دیا جائے اور جب آتے جاتے انہوں نے خار دار جھاڑیوں سے الجھنا ہو تو حیض کی معمولی سی درد کا احساس بھی نہ ہوتا ہوگا۔ اس کے مقابلہ میں جب امریکی عورتوں

---

[1] تفصیلات کے لئے مصنفہ کی یہ کتاب ملاحظہ ہو۔
COMING OF AGE IN SAMOA.

ہیں اس وتیرہ کا جائزہ لیا گیا۔ تو مستقل نوعیت کے عوامل دریافت نہ کئے جا سکے!

ایک بات تھی کہ بعض ایسی عورتیں بچپن میں ان عورتوں کے سینے چڑھ گئی جنہیں خود بھی حیض درد کے ساتھ آتے تھے۔ ایسے وقوعات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے تمدنی توقعات بہت سود مند ہو سکتی ہیں۔ یہ اسی طرح جیسے یوگا سے انسان ان جسمانی اعمال سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے جن سے عام حالات میں وہ بے خبر ہی رہتا ہے

بعض معاشرے اپنی عورتوں میں متحرک اور فعال قسم کی ایسی مخصوص جنسیت کی نشو نما کرتے ہیں جو ہیجان شہوت پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ جب کہ بعض معاشروں میں عورتوں کا جنسی رد عمل واضح اور مخصوص ہونے کی بجائے مبہم سا ہوتا ہے ظاہر ہے معاشرہ اس کے لئے کوئی اساس وضع کرتا ہے اس کے مطالعہ کے لئے یہاں ایک اور مفروضہ پیش کیا جاتا ہے۔ عورتوں میں جسمانی اختلافات کے باعث ایسا ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ ایسے اختلافات جن کے ساتھ بعض اعضاء کی ساخت لازم و ملزوم ہو جاتی ہے جیسے بظر کا بڑا ہونا، نظر آتے رہنا یا مہبل کے دہانہ کے زیادہ قریب واقع ہونا، چھاتیوں کا جلد سخت ہونا وغیرہ یا پھر اس کا باعث بنتا ہے۔

دیگر معاملات کی طرح یہاں بھی یہ ہوتا ہے کہ تمدن کہیں سے مخصوص نوعیت کے کچھ کرداری پہلو مستعار لے کر انہیں اپنے افراد پر مسلط کر دیتا ہے۔ حالانکہ افراد کے لئے یہ وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتا ہے اور اس لئے ان کے لئے یہ اتنا سہل نہیں ہوتا۔ مثلاً بالی میں بچہ کو دودھ پلانے کے طریقہ ہی کو لیں ماں بچہ کو اپنے کولہے پر اٹھا لیتی ہے۔ اس سے بچہ جب بھی چاہے بڑی آسانی سے جھک کر ماں کی چھوٹی مگر اونچی چھاتیوں سے دودھ پی سکتا ہے۔ یہ بالی عورتوں کی جسمانی ساخت کے لحاظ سے موزوں ہے۔ لیکن یہ طریقہ ان عورتوں کے لئے تکلیف دہ بن جائے گا۔ لیکن یہ طریقہ ان عورتوں کے لئے نقصان دہ بن جائے گا۔ جن کی چھاتیاں نیچے کو لٹکی رہتی ہوں۔ اب ان علاقوں کو جہاں عورتیں کھینچ کھینچ کر چھاتیوں کو اس حد تک لٹکا لیتی ہیں۔ کہ بعض عورتیں انہیں کندھوں پر لٹکا لیتی ہیں۔ اب یہاں بالی عورت — جس کی سخت چھاتیاں اونچی ہوتی ہیں — کے طریقے کو اپنانے والیاں کسی طرح کا آرام نہ پائیں گی۔ جہاں تھوڑی سی آبادی ہو۔ اور ایک نسل کا دوسری کے ساتھ مستقلاً ملاپ رہتا ہو تو پھر جسمانی ساخت میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ جس سے تمدنی آموزش کے انداز بھی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرہ میں ایسے انتخاب کی بہت کم گنجائش اور امکان رہ جاتا ہے۔ اس لئے جسم نہ تو جلدی سے خارجی اثرات کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی اسے آموزش کی اتنی ضرورت رہ جاتی ہے ہاں! بعض انتہائی صورتوں میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جیسے عورتیں پلاسٹک سرجری سے اپنی چھاتیاں ٹھیک کراتی ہیں۔ یا امریکہ میں نسائی پسند کے معیار پر پورا اترنے کی خاطر مخصوص نظام غذا اپنا کر جسم دبلا کرتی ہیں۔ اگر ہیجان شہوت کی استعداد کا ساخت کے تغیرات پر انحصار ہے تو پھر اس کی روشنی میں ہم مختلف معاشروں میں ان مختلف عورتوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ جن میں سے بعض کی جنسیت غیر واضح اور مبہم ہے جب کہ بعض کے تقاضے مخصوص نوعیت کے ہیں — اور یہ سبھی مطمئن او مسرور ملتی ہیں، اور ان ہی میں ایسی عورتیں ملتی ہیں جو اپنی جنس معاشرہ کے مروجہ نظریات کے مطابق نہیں پاتیں۔

مختلف تمدنوں اور معاشروں کے تقابلی مطالعہ سے یہ کہیں بھی واضح نہیں ہوتا کہ مردانہ جنسی رد عمل کی مانند عورت کا ہیجان شہوت بھی خلقی اور غیر آموز ہوتا ہے۔ بلکہ مطالعہ اور موازنہ سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ جنسی فعل میں نسائی کردار کا بیشتر حصہ آموزش پر مبنی ہوتا ہے۔ جو نظریات عورت کے جنسی تقاضوں کی مخصوص مبہم نوعیت کو "نارمل اور فطری" قرار دیتے ہیں۔ وہ آموزش کی اہمیت کو فراموش کر دیتے ہیں۔

ایسے نظریات علمی مرتبہ ہی سے نہ گریں گے۔ بلکہ ایسے سماجی طرز عمل کی ترویج کے باعث بھی بنیں گے جو نسائی جنسیت پر ظلم و ستم کرنے کے ساتھ ساتھ دونوں جنسوں کو بے جا بوجھ تلے بھی دبا دیں گے۔

آسولڈ شواف

"شاید اسی کا نام محبت ہے۔۔"

محبت کے بارے میں استفسار پر بہت سے لوگ اسے ایک ہیجان سے تعبیر کریں گے لیکن دوبارہ غور پر کچھ لوگ اس جواب میں اس بنا پر کچھ ہچکچاہٹ محسوس کریں گے کہ یہ کس نوع کا ہیجان ہو سکتا ہے؟ قبول عامہ کے باوجود بھی یہ عقیدہ صحیح نہیں۔ یہ درست ہے کہ محبت میں ہیجان کا خاصہ عمل دخل ہے۔ اور اسے جھٹلانا احمقانہ ہو گا۔ لیکن ہیجان اس وسیع کل کا محض ایک جزو ہے اور یہ جزو بھی اساسی اہمیت کا حامل نہیں۔ جبلت کی مانند ہیجانات بھی اطلاع دہندہ ہیں۔ یہ وجود کی گہرائیوں میں وقوع پذیر ہونے والے تغیرات سے ہمیں آشنا کراتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جبلتوں کا عمل حیاتیاتی دائرہ تک محدود ہے۔ جب کہ ہیجانات کا ذات سے تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً طمانیت ہمارے شعور کو اس امر کی اطلاع دیتی ہے کہ کام مکمل ہو چکا ہے۔ وہ برا بھلا جیسا بھی ہوا ہو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ فرض یا کام کی تکمیل ہی محسوس کئے جانے والے تناؤ سے چھٹکارا مل چکا ہے۔

اسی طرح خلط محبت اور غلط تعریفات کا شکار ہیجان خوشی بھی ہمارے تمام وجود پر چھا جانے والی طمانیت کی ایک اعلیٰ اور ارفع صورت ہے۔ یہ اس حقیقت کی مظہر ہے کہ ہم اپنے مادی، انسانی اور روحانی ماحول سے ہم آہنگ ہیں۔

خوف اور اسی نوع کے دیگر ہیجانات جیسے کمتری یا عدم تحفظ اس امر کے غماز ہیں۔ کہ ہم زندگی میں بعض مواقع یا کاموں کے لئے ناموزوں ہیں۔ اور یہی عدم مطابقت ہے۔ جس طرح خوشی طمانیت کی اکمل صورت ہے اسی طرح کرب — جو کلی فنا اور ہلاکت کے احساس پر استوار ہے — خوف کی انتہائی صورت ہے۔ اس احساس کے بھنور میں گھری ہوئی شخصیت کو حال تباہ کن معلوم ہوتا ہے اور مستقبل کے لئے اس کے دل میں سوائے یاس کی تاریکی کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ آخر ہماری زندگی کس حالت میں محبت کے ہیجان کا روپ دھار کر اظہار ذات کرتی ہے اس کا مختصر ترین جواب یوں دیا جا سکتا ہے۔ محبت کرب کی متضاد ہے کسی سے محبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دل کی دنیا طوفانی تھپیڑوں سے دور محفوظ ساحل پر ہے۔ یہ دوسرے انسان سے کلی ہم آہنگی ہے۔ یہ آفاق میں لے مرکزیت کا باعث ہے۔ اور یوں جب انسانی شخصیت اپنی حدود سے بڑھ کر پھیلاؤ اور وسعت اختیار کرتی ہے۔ تو زندگی میں تکمیل خود سے گہرائی اور لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ محبت میں ہیجانی شدت جسے عموماً وفور شوق یا شاعری میں عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے — کا پیمانہ خود سپردگی کے مدارج ہیں۔

میرے خیال میں اس بنیادی نظریہ کی وضاحت کے لئے ایک دور کی مثال کافی رہے گی۔ اکثر لوگ مذہب کو "احساس" یا ہیجان سے مترادف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہیجان کا مذہبی واردات کے ساتھ کم و بیش وہی تعلق ہے جو مرد عورت کی محبت سے ہو سکتا ہے۔ مذہبی بلکہ تمام روحانی واردات کا مقصد حقیقت مطلق اور حسن ازلی سے رابطہ اور اتصال ہے اس اتصال کا اظہار مذہبی شادمانی اور روحانی سر جوشی سے ہوتا ہے۔

انسانی محبت اور روحانی واردات میں کسی نوع کی بھی باہمی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ لیکن مقاصد اور ان سے وابستہ ہیجانات میں مشابہت ضرور ملتی ہے۔ "خدا کی محبت" صرف اسی بنا پر کہی جا سکتی ہے اور یہی اس کا جواز ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دو افراد میں قرب اور اتصال کی انتہائی صورت

صورت جنسی ہے اور کیوں کہ اس قرب اور اتصال کے اظہار کے لئے انسانی زبان جنسی اصطلاحات کی مرہونِ منت ہے اس لئے بعض صوفیاء نے اپنی مستی اور سرخوشی کے ابلاغ کے لئے جنسی الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ اس سے بعض ذہین مگر لاپرواہ نفسیات دانوں نے یہ ظنانہ نظریہ پیش کردیا کہ مذہبی واردات جنسی تجربات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہیں۔

مرد اور عورت کے وجودی اتصال کے مقاصد کی روشنی میں بظاہر آسان معلوم ہونے والا محبت کا یہ نظریہ درحقیقت بے حد پیچیدگی اور طویل تاریخ کا حامل ہے۔ محبت کی اس تاریخ کے پہلے باب کا آغاز افلاطون کی عظیم شخصیت سے ہوتا ہے۔ جس نے آج کے یورپی تفکر کے لئے بنیادی سانچے وضع کئے اس نے محبت کے بارے میں بھی اساسی اصول مرتب کئے اور اس وقت سے لے کر آج تک لاتعداد مفکرین نے اپنے اپنے انداز اور اپنے عصر کی مخصوص علمی اصطلاحات میں دراصل اسی کے خیالات کا اعادہ کیا ہے۔

سمپوزیم میں افلاطون نے اس خیال کا اظہار کیا کہ شہوانی جذبہ حسن کی تصور پذیری اور اس سے اکتساب لذت کا نام ہے۔ یعنی حسن کا تصور اعلیٰ حقیقت ہے۔ جب کہ خوبصورت اشیاء محض اس کا پرتو ہیں۔ حسن کی یہ تصور پذیری اعلیٰ اور عالمی حقیقت سے مکمل اتصال اور رابطہ کا باعث ہی نہیں بنتی بلکہ اتحاد مقاصد بھی پیدا کرتی ہے۔

"عدم وجود سے وجود تک آنے کا نام محبت ہے"۔ محبت کے اس پر تقدس نظریہ کی رو سے "انفرادیت" "بدبختی" اور ایسی شدید غلطی ہے جس کا ازالہ صرف کل میں جزو کے ملنے اور ان کے باہمی اتحاد اور اتصال سے ہی ہوسکتا ہے اور محبت اس ارفع منزل تک پہنچانے والے راستہ کا نام ہے[1]

مدارج تہذیب طے کرنے کے دوران میں محبت کی جو جو خصوصیات ہم تک پہنچی ہیں۔ افلاطون ان سب سے واقف تھا۔ اس میں سب سے پہلے مقدر کا وہ ناگزیر احساس ہے جس کی قوت دو محبت بھرے دلوں کو ایک دوسرے کے بازوں میں سکون عطا کرتی ہے۔ افلاطون نے اس کی تشریح دو زوجیت کی روشنی میں کی ہے۔ "اگر ان میں سے ایک اپنی ذات کے حقیقی نصف حصہ سے مل چکا ہے تو وہ اس سے جدائی گوارا نہ کرے گا۔ حتیٰ کہ مختصر سے وقفہ کی علیٰحدگی بھی ناقابل برداشت ہوگی۔

زندگی بھر کے لئے یوں مل جانے والے افراد بھی بالتصریح یہ نہیں بتاسکیں گے کہ درحقیقت وہ ایک دوسرے سے کس چیز کے خواہاں ہیں۔" اور یوں سرخوشی اور گرم جوشی کے عالم میں وہ ایک دوسرے میں مدغم ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ناگزیر وقوعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جسے ہم موت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اب سچی محبت کرنے والوں کو محبت جدا کرتی ہے۔ وہ کیوں کہ کل میں مل کر حیات کے اعلیٰ مقصد کی تکمیل کرلیتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے انفرادی حیثیت سے اس جہان میں دوبارہ آکر زندگی بسر کرنے کے تمام امکانات ختم ہوجاتے ہیں۔

عیسائیت کی تعلیمات نے محبت کو کچھ اور ہی معانی اور خصوصیات عطا کیں۔ اب یہ وحدت کل کے ساتھ سرخوشی پر مبنی اتصال سے انفرادیت کو بھسم کردینے والے آتشیں جذبہ کی بجائے یکساں خصوصیات رکھنے والے افراد میں باہمی رابطہ اور ہم آہنگی کا نام تھا۔ اس کی مثال حضرت عیسیٰ اور کلیسا کی شادی ہے۔

یورپی نظریات و تصورات کی تاریخ میں محبت کے اس مسیحی اور قدیم شہوانی نظریہ میں جو بعد ملتا ہے اس کی بازگشت مختلف اور متنوع صورتوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ بلکہ اس سلسلہ میں ایک خاصی تکرار بھی ملتی ہے۔

ہمیں اس موقعہ پر تاریخی تفصیلات اور جزئیات میں جانے کی ضرورت نہیں پھر بھی عام دلچسپی کے بعض امور کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ ماہرین نفسیات تک مابعد الطبیعات کے راستہ سے پہنچے ہیں۔ قدیم دور میں جن محرکات کا ماخذ خارج میں تلاش کئے جاتے تھے۔ اب تحت الشعور کو ان کا باعث گردانا جاتا ہے۔

دیوتاؤں کی بدفطرتی یا غضب کو اندھی محبت کا باعث گردانا جاتا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یہ محبت جادو ٹونے اور کچھ "گھول کر پلا دینے سے ہوتی تھی۔ خواہ محبت کرنے والے یہ جان بوجھ کر پی لیں یا انجان پن کی وجہ سے پئیں۔ محبت کرنے والے یہ جان لیں کہ محبت جادوگری کا کرشمہ سمجھی جاتی تھی۔

موجودہ زمانہ میں یہ امر طے شدہ ہے کہ انسانی ذہن کی مختلف النوع استعدادوں میں سے محبت کرنا بھی ایک استعداد ہے اگر اس کا درجہ بہت زیادہ گھٹ یا تو یہ کسی مریضانہ الجھاؤ کی علامت بنا دی گئی۔ سارا رومانس ختم ہوگیا اور اس کی جگہ محض مریضانہ اشتعال نے لے لی۔

یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ہم نے محبت سے جو مفہوم وابستہ کر رکھا ہے۔ ہمارے ادب میں جس محبت کے گیت گائے جاتے ہیں اور جس کے سوتے جاگتے میں ہم خواب دیکھتے ہیں۔ تو محبت کا یہ مفہوم نسبتاً جدید ہے۔ قدماء اس سے بے گانہ تھے اور یہی حال اہل مشرق کا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ لوگ محبت کے فطرتی پہلو یعنی اس کی حیاتی خواہشات اور مسرتوں سے واقف تھے۔ لیکن انہیں وہ جنون اور وحشیانہ حماقت قرار دیتے تھے۔

اس ضمن میں ایک عمومی اصول ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ اصول آشکار ہوتا ہے کہ تمام تاریخی ادوار میں ہر انسانی استعداد اور اس کے اظہار کی تمام ممکنہ صورتوں سے کسی نہ کسی صورت میں کام لیا جاتا رہا ہے۔ البتہ ہر دور کی انفرادی خصوصیات کی بنا پر ان میں افراط و تفریط ہوتی رہی ہے۔ یعنی ایک دور میں جسے عصری تقاضا سمجھا جاتا رہا وہی کسی اور زمانہ میں مردود و مقہور تصور کی گئی۔

قدماء میں روحانی محبت کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ مثلاً ہیرو اور لینڈر، دیدو اور اینیس اور سیفو اور فینی اگر قدماء اور اہل مشرق میں شدید رومانی محبت عنقا تھی۔ تو اسے باعث تعجب نہ ہونا چاہیئے کیوں کہ شدید رومانی محبت کے لئے جس انفرادیت کی ضرورت ہوتی ہے اس کا تصور ہی ناپید تھا۔ شدید اور جذباتی محبت کسی تصور سے کی جاتی تھی اور گو فرد کی روح کی یکتائی عیسائیت میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے لیکن مسیحی محبت بھی دو افراد میں جذبات سے عاری رابطہ کا نام تھی۔

بارہویں صدی میں ایک بالکل ہی نئی انوکھی اور غیر متوقع صورت حال نے جنم لیا۔ یہ ایبلرڈ اور ہیلائس کی والہانہ اور گرم محبت تھی۔ اور تھوڑے سے وقفہ کے بعد محبت کے اس عظیم رزمیہ کی تخلیق ہوئی جسے دنیا ROMAMCE OF TRISTRAM AND ISEULT کے نام سے جانتی ہے۔

ڈینس ڈی روژمنٹ کے بہترین تجزیہ کی رو سے اس نظم میں جدید محبت کی دو خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ درباری محبت اور سافتی محبت میں کشمکش اور محبت اور موت کا اتصال۔ نفسیاتی لحاظ سے اس نظم کی اہم خوبی یہ ہے کہ یہ اس عبوری معاشرہ کی خصوصیات کی تصویر کشی کرتی ہے۔

ٹرسٹرم کا محبت پیدا کرنے والے محلول کا پینا قدماء کے اس خیال کا مظہر ہے کہ محبت کرنے والے اور ان کی محبت مقدر کے تابع ہوتی ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ابھی ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں اس وقت وہ "محبت" سے محبت کرتے ہوئے محبت میں مبتلا ہونے کی تمام کیفیات محسوس کرتے ہیں۔ آئسیلٹ میں محبت کی گرم جوشی ایک مدھ بھرے خواب سے

---

[1] جدید فلاسفروں میں ہیگل اپنے ایسے انکار کے لئے نمایاں تر ہے۔ اس نے جب انفرادیت کو "ناگزیر عارضہ" قرار دیا۔ تو اس کے ذہن میں بھی یہی مفہوم تھا۔

پیدا ہوتی ہے جبکہ تر سطرم چراغ کی لو بجھنے نہیں دیتا ۔۔ یہ افلاطونی تصورات ہیں!

محبت کے جدید تصور کی تکمیل کے لئے جس تیسرے عنصر کی ضرورت تھی۔ وہ نشاۃ ثانیہ نے فرد میں انفرادیت کی دریافت سے مہیا کر دیا۔ اب انفرادیت مذہبی پیچیدگیوں سے ملند اور جداگانہ تھی اور یوں جدید رومانی شاعری کے لئے ذہنی فضا تیار ہو گئی۔ چنانچہ چودھویں صدی کے وسط میں سب سے پہلے ہمیں پیٹرارچ کے لارا کے نام لکھے ہوئے سانیٹ ملتے ہیں۔ اور یوں روز کے الفاظ میں آخر کار زبان الفت زبان دل کی ترجمان بن گئی۔ اس کے بعد ایلبرڈ اور ہیلائس اور پھر پاڈلو اور رسنی اور رومیو اور جیولیٹ کی صورت میں محبت نکتۂ عروج کو پہنچ جاتی ہے اس کے بعد تو حقیقی عاشقوں کا ایک تانتا سا باندھ جاتا ہے۔

شاعروں کے تخیل نے لاتعداد عشقیہ داستانوں اور کرداروں کو جنم دیا۔ محبت نے مذہب سے علیحدہ ہو کر اپنی انفرادیت حاصل کر لی اور اس دور میں محبت کے المیے تو روزانہ اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔

یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ پیشہ دارانہ نفسیات ۔طبی یا درسی نفسیات کی تخصیص نہیں۔ نے محبت اور اس کے خصائص اور ماہیت کے بارے میں ہماری معلومات میں ذرا سا بھی اضافہ نہیں کیا۔

تعجب خیز امر تو یہ ہے کہ اس کام کے لئے فلاسفروں پر انحصار کر لیا گیا۔ حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہمیں اس کام کی توقع ہی نہ رکھنی چاہیئے۔ اور اس سے بھی زیادہ تعجب تو اس بات پر ہے کہ انہوں نے یہ کام بطریق احسن سر انجام دیا۔ محبت کے بارے میں تمام نفسیاتی توجیہات و تشریحات دراصل افلاطونی فلسفہ ہی ہیں۔ حسن اور تکمیل کے تصورات کو مابعد الطبیعاتی رفعتوں سے اتار کر فرد کی وقعت اور قدر کے خیال کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اب فرد کسی ارفع تصور کی تجسیم نہیں بلکہ وہ خود ہی اپنی وقعت اور قدر بنتا ہے۔

جدید فلسفۂ مظہریت کے اہم نمائندہ میکس شیلر کے نظریہ کی رو سے واحد ادراک میں شخصیت کی مرکزی قدر کے تعین کرنے کی استعداد ہی میں محبت کا جوہر پوشیدہ ہے۔ یہ قدر حسابی نہیں ہوتی نہ ہی کسی شخص کے حسن و قبح کو میزان میں رکھ کر جمع تفریق کا عمل ہوتا ہے۔ محبت ۔ سطحی خصوصیات سے قطع نظر کرتے ہوئے شخصیت کی مرکزی قدر کا تعین کر لیتی ہے۔ بلکہ محبت تو خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے محبوب کی قدر اور اہمیت میں اضافہ کا باعث بھی بنتی ہے۔

عظیم روسی فلاسفر والڈی مرسولونیف کا بھی یہی عقیدہ ہے: "ہم ذہنی لحاظ سے اور ذہن کے ذریعہ سے تو اس الہی تصور سے واقف ہوتے ہیں جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے جب کہ صرف محبت ہی سے یہ قدر زندگی میں ٹھوس صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ محبت سے کسی شخصیت کی غیر مشروط اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ لیکن یہ کہہ دینا احمقانہ اور شرک کے مترادف ہے کہ فرد اپنی انفرادی حیثیت میں کسی اہمیت کا مالک ہے۔ تصوراتی مواد (محبوب) اور اس کا تجربہ کرنے والا دو جداگانہ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی ذات کے دو پہلو ہیں اور صرف یقین محکم اور محبت کی عطا کردہ بصیرت سے ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ تصوراتی مواد جداگانہ وجود نہیں رکھتا بلکہ یہ ذہنی صداقت ہے جس کی کرنیں اس مظہر سے پھوٹ رہی ہیں۔"

یہ محبت کے تقدس آمیز نظریہ کی مسیحی توجیہ ہے اس فلاسفر نے اپنی تعلیمات میں ایک اور نظریہ کو بھی مرکزی حیثیت دی ہے۔ جرمن فلاسفروں نے اس نظریہ پر اتنا زور نہیں دیا۔ اس کے خیال میں محبت کو ترک انا کا ذریعہ بنانا درست ہی نہیں بلکہ انفرادیت کی نجات کا موجب بھی ہے۔ "عمومی طور پر اگر دیکھا جائے تو محبت کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ انانی تباہی کو انفرادیت کی نجات کا باعث بنا یا جائے اور یہی اس کا مقصود ہے ..... صرف نام نہاد روحانیت اور مریضانہ اخلاق ہی جنس محبت کا درجہ گھٹا کر اس طرح کی محبت کو دبانے کی کوشش کریں گے۔ یہ صرف جنسی محبت ہی ہے۔ جو افراد میں سے انا کو ختم کر کے باہمی تعاون، مساوات اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ شخصیت کے ارفع تصورات کی تکمیل کے لئے صرف مرد اور عورت کا اتصال ضروری ہے۔"

قدیم یونانی، جدید جرمن اور مسیحی روسی کے ساتھ ساتھ ایک اسپینی کے نظریہ پر بھی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں ۔۔ یہ ہے جوس آرٹیگا گیسٹ۔ خیالات کے اعتبار سے یہ بالکل یورپی ہے "محبت پر" اپنے ایک مضمون میں وہ رقم طراز ہے۔

"محبت ہماری شخصیت کی گہرائیوں سے پھوٹنے والا طوفان ہے۔ یہ جامد نہیں ۔ بلکہ محبوب کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ محبت ایک ہیجانی فعل ہے۔ دوسرے فرد سے اس کی ذات کی بنا پر گرم جوشی پر مبنی ہم آہنگی جنم لیتی ہے۔ فرد اپنی روح کی گہرائیوں سے یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی محبت کی بندھن میں جکڑا ہے۔ یہ دو وجودوں کا وہ پر حیات اتصال ہے کہ ۔۔۔

"من تو شدی تو من شدم"

والی حالت ہو جاتی ہے۔ محبت اکمل کے حصول کی تمنا ہے۔ محبت کے جذبہ کی شیرینی اس میں مضمر ہے کہ "مابعد الطبیعاتی معنوں" میں محبوب "تحلیل" ہو کر مرکز محبت کے وجود میں مدغم ہو کر ہی صحیح اور مکمل تسکین پاتا ہے۔ اس "برکت کی حالت" میں اپنی زندگی کی شافتوں کو جھٹک کر اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے جہاں خدا ایسی کریم النفسی سے کام لیتے ہوئے تمام انسانوں کے لئے محبت اور مسکراہٹ رکھتا ہے۔"

ICORINTHIANS کے تیرہویں باب میں محبت کی جو مدح سرائی کی گئی ہے اس کے تذکرہ کے بغیر یہ مضمون نامکمل رہے گا۔

"محبت کبھی ناکام نہیں رہتی ۔" ہماری معلومات جزوی ہیں اور حقائق کے بارے میں ہماری پیش گوئی جزوی ہوتی ہے لیکن جب کل کی آمد ہو تو جزو اس میں مدغم ہو جاتا ہے۔"

اس مختصر جائزہ سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے ان تمام عظیم مفکروں نے جو باتیں مختلف الفاظ میں کی ہیں۔ ان سب میں افلاطون کے خیالات کی بازگشت ملتی ہے۔ ان سب کے نظریات کا مجموعی خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

"محبت خواہش یا ہیجان نہیں ۔ یہ ایک ایسا ادراک کی
فعل ہے جس سے ہم دوسرے فرد کی شخصیت کی گہرائیوں
میں جھانک کر اس کی قدر سے واقف ہو جاتے ہیں۔"

سائنسی حقائق کے بارے میں ہماری واقفیت "ذاتی" ہونے کی بجائے "مجرد" اور غیر شخصی ہوتی ہے لیکن محبت کے زیر اثر محبوب سے واقفیت اس نوع کی نہیں ہوتی ہم اس کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم اپنی ذات اس کی شخصیت میں مدغم کر دیتے ہیں۔ مدغم ہونے کا یہ عمل "حیات اور وجود" کے مترادف ہے اسی کو جدید فلسفہ کی اصطلاح میں ہم "وجودیت" پر مبنی شناسائی اور ادراک کہہ سکتے ہیں۔

یہ اجمال تفصیل طلب ہے اور میں اس مشکل نظریہ کو پورے طور سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے یہ وضاحت بھی اصل کی نقل والی بات ہوگی۔

محبت کرنے والا جہان الفت کی کیفیات میں مست رہتا ہے جہاں صرف محبوب کے وجود اس کی شخصیت ہی کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ کسی ایسے ملک میں داخل ہونے کے مترادف ہے جہاں صرف اس ملک کا مخصوص سکہ چلتا ہو اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کرنے والا دیگر علائق دنیا سے قطع تعلق کر لیتا ہے یا وہ دیگر اقدار کو خاموشی اور معقولیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔ اس کے لئے تو محبوب کی ذات کے علاوہ باقی سب کچھ عدم وجود کے مترادف ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک دھن کا پکا سائنس دان مالی منفعت سے بے نیاز ہوتا ہے یا ایک نفع خور تاجر جمالیاتی قدلے

کو نفع نقصان کی ترازو میں تولتا ہے۔ محبوب کی شخصیت کے مرکز پر نگاہ رکھنے سے دیگر فروعی خصوصیات اور ثانوی استعدادیں اپنی اہمیت گنوا بیٹھتی ہیں۔ ایک عورت کے خوبصورت بال ساحر آواز یا جسم کے دلکش خطوط اس کا مطالعہ یا موسیقی میں مہارت ۔ یہ سب خصوصیات اپنی جگہ اہم ہوتے ہوئے بھی محبت کرنے والے کے لئے غیر اہم ہیں۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ شادی کی منڈی میں اس کی قیمت میں اضافہ کا باعث بن سکتی ہیں۔ محبت کی دنیا کے قوانین ان خصوصیات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اسی طرح عام جن باتوں کو ناپسند کرتے ہوں وہ بھی محبت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔ محبت کرنے والا محبوب کے حسن و قبح دونوں ہی سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اگر ایک آدمی یہ کہے کہ میں فلاں عورت سے اس کی ان خصوصیات اور استعدادوں کی بنا پر محبت کرتا ہوں تو وہ مختلف زاویوں سے پسندیدگی کے باوجود بھی اس سے سچی محبت نہیں کر رہا۔ لیکن اگر وہ اس عورت کی "خرابیوں" اور "خامیوں" سے چشم پوشی کرتے ہوئے اور دوسروں کی نکتہ چینی کا اثر لئے بغیر اسے چاہے جاتا ہے تو وہ محبت کر رہا ہے۔ وہ محبت جسے ہماری عقل نہ سمجھ سکے جو مشاہدات سے اخذ شدہ اصولوں کی تکذیب کرے اسے باآسانی سچی محبت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

"محبت اندھی ہے!"

اس مقولہ میں ذرا بھی صداقت نہیں حقیقت تو یہ ہے کہ محبت صرف ان چیزوں کے لئے اندھی ہے جو محبت کے دائرہ سے خارج ہوں لیکن محبت ہی آنکھوں کو وہ بصیرت عطا کرتی ہے جس سے محبوب کی شخصیت کے تمام قابلِ الفت پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔

یہاں اس امر پر بہت زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا کہ محبت کے زیر اثر محبت کرنے والوں میں بھی کوئی ایسی استعداد پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ محبوب کی شخصیت میں ان خصوصیات کو بھی دیکھ لیتے ہیں جن کے معاملہ میں محبت نہ کرنے والے محض اندھے ہی ثابت ہوتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ خصوصیات "ایجاد" نہیں کی جاتیں۔ یعنی محبت کرنے والے انہیں فرض نہیں کر لیتے۔ محبت خود فریبی کا نام نہیں۔ اس خود فریبی میں مبتلا ہونے کے بعد جو خطرناک صورت حال جنم لیتی ہے اس کا اندازہ محبت پر سٹینڈہل کی مشہور کتاب (DE LA MOR) کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے اس میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس مقصد کیلئے اس نے تعلیم کی تشبیہ استعمال کی ہے۔ اپنے نظریات کے باوجود بھی ہم اسے جدید دور کا وہ نفسیات دان سمجھنے پر مجبور ہیں جو زندگی کے تاریک پہلوؤں کی تلاش میں رہتا ہو جو خوبیوں کو فطرت کی تمام قباحتوں کی پردہ پوشی قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود محبت کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا اور اس نے محبت کی تکذیب محض اس بنا پر کی کہ وہ خود میں اس کی اہلیت نہ پاتا تھا محبت کرنے والے کی مثال پانی میں جھانک کر اس پیش گوئی کرنے والے شخص ایسی ہے۔ جس کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی گھوم جاتی ہے۔ حالانکہ اس مقام پر اور لوگ بھی اپنی اپنی چھڑیاں لے کر کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ انداز فکر ہماری سوچ کے لئے وسیع آفاق پیش کرتا ہے۔ عقیدہ ۔ نفسیاتی اصطلاح میں۔ مرکزِ عقیدہ کے ساتھ مکمل اتصال کا نام ہے۔ خواہ یہ خدا کوئی فرد یا کوئی تصور ہو، کسی پر اعتقاد رکھنا یا کسی پر یقین کرنا اسے حاصل کرنے کا ایک انوکھا اور ناقابل تشبیہ طریقہ ہے۔ ادراک حقیقت کے اور طریقوں کی امداد بھی یہاں بے سود رہتی ہے۔

یہ استدلال اور اس سے مستخرج نتائج سے ماورا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے طریق کار میں بُعد قطبین ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ استدلال (یعنی عقل و خرد) نے گزشتہ تین صدیوں میں جو عروج حاصل کیا۔ اس نے اعتقاد کو بالکل ختم کر دیا ۔ درست نہیں اور تاریخ کی غلط تشریح ہے۔ بلکہ سولھویں اور سترھویں صدی کے عظیم مفکروں اور سائنسدانوں نے تو یہ ثابت کر دیا کہ استدلال اور اعتقاد میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اعتقاد اور اس کے پیدا کردہ یقین محکم سے پہاڑ سمٹ کر رائی بن جاتے ہیں۔ یہ استدلال سے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح استدلال تجزیہ سے جو تفصیلات اور قوانین دریافت کرتا ہے۔ وہ اعتقاد کے بس کا روگ نہیں۔ سائنسی پہلوؤں اور حقائق سے نہ تو اعتقاد کی تکذیب ہوتی ہے اور نہ ہی اسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے طالب علم کے لئے افراد ان کے اقوال اور دستاویزات کی جانچ پڑتال اور چھان پھٹک بہت ضروری ہے جب کہ کسی اعتقاد رکھنے والے کے لئے یہ سب دفتر بے معنی ہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس اپنا دنہیں بلکہ ان کی مطلق سچائی ہے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اعتقادات تنزل پذیر ہے۔ اس کے نتیجہ میں انسانی اخوت میں بھی کمی پیدا ہو گئی۔ اس کا مساوات شکم سے کوئی تعلق نہیں۔ انفرادی لحاظ سے محبت کرنے والوں کا ایک دوسرے پر اندھا یقین اور اعتماد اب انسان کے شاندار ماضی کی یاد کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ ورنہ دلکشی سے عاری اس بھوک ننگی دنیا میں اور رہا بھی کیا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں کہا گیا تھا کہ محبت محبوب کی ذات کے حسن و قبح سے بلند اور ارفع ہوتی ہے۔ محبت خوبیوں سے نہیں کی جاتی اور نہ ہی خامیاں اس میں کمی پیدا کر سکتی ہیں۔ وہ اپنی محبوبہ کی ذات کا والا و شیدا ہے۔ اسے اس کے نظریات اور کارگزاریوں سے کوئی دلچسپی نہیں اگر "نکتہ چینی" اس میں خامیاں تلاش کرتے رہیں۔ تو اس کے خیال میں یہ چاند پر تھوکنے والی بات ہو گی اس کی محبت ان سب سے بے نیاز، بلند اور ارفع ہے۔ اس کے لئے تو اس کی محبوبہ کا وجود ایک معجزہ سے کم نہیں۔ ایسا معجزہ جو ہر نئے دن ایک نئے انداز میں جلوہ گر ہوتا ہو اور یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ محبت اور اعتقاد کے جہان میں رہنے والوں کے لئے معجزہ خارقِ عادت نہیں بلکہ فطرتی ہوتا ہے۔

کارڈینل نیومین کے بقول ہزار ہا مشکلات شک کا باعث نہیں بن سکتیں۔ اور سبھی سچی محبت کرنے والے اس کی تائید کریں گے۔ کہ محبت ہمیشہ اچانک ہوتی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ پہلی نظر میں ڈرامائی طور سے محبت ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر غیر محسوس کن طریق سے مدتوں کے جانے پہچانے شخص سے محبت ہو جائے تو یہ بھی اچانک ہی کہلائے گی۔ یہ ان معنوں میں اچانک ہے کہ محبت کے بعد وہی شخص ایک نئی روشنی اور نئے انداز سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ گویا اس کی ماہیت قلب ہو چکی ہے۔ یہ وہ عورت نہیں جسے میں کافی عرصہ سے جانتا تھا۔ جسے میں ملتا رہا۔ اور جس سے گفتگو ہوتی رہی اب یہ اس منفرد ہستی کا روپ دھار چکی ہے۔ جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ اب میں خود بھی تو تبدیل ہو چکا ہوں۔ میرا وجود اور روح تک ایک نئی تبدیلی سے آشنا ہو چکے ہیں۔

اب ہم صحیح معنوں میں ایک دوسرے سے "واقف" ہوئے ہیں اب ہم سحر زدہ سے جہانِ الفت میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس جہان کے باسیوں میں وہ لوگ ہیں جنہیں دنیا والے مثالی محبوب اور پرجوش عاشقوں کے نام دیتے ہیں۔

اب ان کے لئے اس دنیا کے ہنگاموں اور الجھنوں میں آکر شامل ہونا بہت مشکل ہے نہ ہی وہ جہان الفت کی سرمستیوں اور سرخوشیوں کی تاب لا سکتے ہیں۔ اور یوں ان کے لئے موت ناگزیر ہو جاتی ہے اس لئے تو تاریخ میں زندہ محبت کرنے والے غیر طبعی موت مرے لیکن یہ تو ہمارے لئے غیر طبعی ہے ان کے لئے وہی عین فطرت تھی۔

وہ اس سے آشنا ہوتے ہیں اور جانتے بوجھتے اور دیکھتے بھالتے وہ اپنے مقدر کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لئے تو

عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی

والا معاملہ ہوتا ہے۔ یہی ان کے مقدر کا المیہ ہے۔ اس پر جوش اتصال میں جرم کا عنصر بھی شامل ملتا ہے یہ حقیقت ہے کہ تمام عظیم محبت کرنے والے اپنے دور کے مروجہ رسوم و قواعد کے مجرم بھی تھے

ہیرو را ہبہ، آئسلٹ، شہنشاہ مارک کی بیوی، ایسے لرڈ یا دری، وینس عاشق معشوق نے اپنے جنگ آزما گھرانوں سے وفاداری کا قانون توڑا۔ فرانسکا اپنے محبوب کے بھائی کی منگیتر بننے والی تھی اور میریا ابلکوفورڈا ایک نن تھی۔ گویا المناک جرائم پرجوش محبت کی قیمت ہیں۔

محبت کرنے والوں کی اکثریت محبت کی ان رفعتوں کو چھونے سے محروم رہتی ہے۔ ان کا انعام تو اولیں مسحورکن کیفیت ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ جذبات کی انتہائی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے جلد ہی وہ اس جہان آب و گل میں واپس آپہنچے ہیں۔ اور یوں جذبات کی قوت باہمی محبت اور اس کی حرارت کی صورت میں تعمیر شخصیت کا کام سرانجام دیتی ہے محبت سے محبوبہ کی خوابیدہ صلاحیتیں ہی اجاگر نہیں ہوتیں۔ بلکہ چاہنے والا بھی ایک حد تک تبدیل ہوجاتا ہے۔ الغرض باہمی محبت سے دو شخصیات تعمیری اور ارتقائی مراحل طے کرتی ہیں یہ ارتقا فطرت کی ودیعت کردہ انتہاؤں کو چھو لیتا ہے اس صورت میں محبت دوسرے کو غلام نہیں بناتی نہ ہی اس میں جوشِ حیات کی مشعل بجھائی جاتی ہے بلکہ اسکے برعکس یہ محبت شخصیت کے لئے بندھن توڑنے اور دامن بھرنے کا باعث بنتی ہے۔

خود شناسی اور خود نگری کے لئے اس سے بہتر تیج اور طریقہ اور کوئی نہیں۔

/ بعدازاں دو انفرادی شخصیتوں کے اتحاد اور اتصال کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ محبوب اپنی محبوبہ سے کہتا ہے مجھے اپنے سحر سے آزاد کرکے مجھ میں وہ ہمت پیدا کرو کہ میں اپنا آزاد دل تمہارے حضور نذر کرسکوں۔"

محبت کا یہ جدلیاتی عمل ہر طرح کی روحانی واردات میں ملتا ہے خواہ وہ کوئی مذہبی راہنما ہو یا کوئی صوفی فن کار!

بقول کاڈویل "(غنایہ شاعر) فن کے تناقض کا اظہار کرتا ہے۔ وہ افراد سے کٹ کر اپنے فن کی دنیا میں کھو جاتا ہے یوں انسانیت سے اس کا رابطہ اور بھی گہرا ہوجاتا ہے۔"

اکثر زبانوں میں لفظ "محبت" اشیاء اور افراد سے دلچسپی پر مبنی ہر طرح کے تعلقات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور یوں آئس کریم سے خدا تک سبھی اس میں آجاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ محبت صرف ایک ہی طرح کی ہے جب کہ مختلف اشیاء اس کا مرکز بنتی رہتی ہیں جیسے غذا، کتابیں، وطن، عورت اور خدا وغیرہ جیسے سرچ لائٹ تاریکی میں کسی چیز کو روشن کردے مگر یہ نظریہ نفسیاتی حقائق کا ساتھ نہیں دیتا۔

اشیاء سے ایسی محبت ہر انفرادی شے کے لحاظ سے ایک جداگانہ قسم کا فعل بن جاتی ہے اشیاء کی ماہیت کے مطابق اس فعل کی صورتوں میں بھی اختلاف ملتا ہے۔ کچھ لوگ جینے کے لئے کھاتے ہیں اور بعض کھانے کے لئے جیتے ہیں۔

لڑکے کئی طرح کی فضول اور بے مقصد چیزیں جمع کرتے ہیں۔ یہ صرف اپنے جذبۂ ملکیت کی تسکین کے لئے ہوتا ہے۔ کتابوں کا عاشق بھی کتابیں جمع کرتا ہے۔ لیکن وہ ان کے مواد کو اپنی شخصیت میں سمونے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

مسائلِ حیات کے بارے میں ایک فلاسفر اور تحقیق کی مرکزی شے کی صورت میں ان دونوں کا انداز محبت کے قریب قریب آجاتا ہے۔ ان کا انہماک سچے عاشق کی خود سپردگی اور نفی ذات سے ملتا جلتا ہے۔ تمام عظیم شخصیات نے اس امر کی گواہی دی ہے۔ نطشے کے بقول صرف محبت سے ہی چشم بصیرت وا ہوتی ہے۔" جب کہ ہیگل کے خیال میں "صرف محبت کرنے سے ہی اپنے مقصود سے ہم آہنگی حاصل ہوسکتی ہے" اور "ہم جس سے محبت کرتے ہیں۔ اسے ہی ہم جانتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے مورخ آئی دی طوا کہنا ہے کہ دانش مند دوست کے بازوؤں میں خیالات و تصورات جنم لیتے ہیں۔ محبت کے وسیلہ سے کی گئی دریافتیں صرف دریافت کرنے والے کی جاگیر نہیں بلکہ یہ تمام دنیا کی ملکیت ہوتی ہیں۔ نفسیاتی لحاظ سے سرقہ کا تصور احمقانہ ہے ایسا کو صرف تاجروں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ہم جیسے جیسے محبت کی بلندیوں سے روشناس ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے ہی محبوب کے بارے میں ملکیت کا احساس ختم ہوتا جاتا ہے۔

اب احساس ملکیت کی جگہ دو طرفہ جذبات اور جوابی عمل لے لیتا ہے۔ عورت کی محبت میں محبت کے اس تصور کی کارفرمائیاں ملتی ہیں۔ محبت میں دو طرفہ جذبات کی بہت اہمیت ہے۔ احساس ملکیت — دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی — کے تصور کے لئے تباہ کن ثابت ہوتا ہے کیوں کہ ملکیت یک طرفہ فعل ہے۔ جماع کے گریزاں لمحات میں عورت کا جسم عارضی طور پر اپنے بازوؤں میں لیا جاسکتا ہے۔ لیکن محبت کا تقاضہ جسم تک محدود نہیں بلکہ وہ تو عورت کی شخصیت اور اس کی روح کی بھی طلب گار ہوتی ہے اور یہ سب غیر مرئی اور ہاتھ نہ آنے والی چیزیں ہیں۔

اس امر کا اعادہ بار بار کیا جاتا ہے کہ جنسی محبت کا مطلب محبوبہ کی زندگی میں ناتسکین پذیر شراکت سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ محبت کوئی ایسی منزل نہیں جسے سر کرلینے سے ہماری خواہشات مستقل تسکین پاسکتی ہوں۔ بلکہ محبت تو جستجو مسلسل، لامتناہی غیر یقینی کیفیت اور عدم تحفظ اور تخلیق مسلسل کا نام ہے[1]

خدا کی محبت کے ضمن میں محبت کا جوابی عمل بہت اہم اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے مذہبی فعل: دراصل خدا سے وصل کی تمنا کا ایک انداز ہے۔ اور اس فعل کے لئے کی گئی دعا خدا سے اختلاط کے مترادف ہے۔ ایک وجودی مکالمہ جس کے لئے جوابی فعل کی ضرورت ہوتی ہے یہ عجب اتفاق ہے کہ صرف انگریزی زبان ہی میں دعا کے لئے "جواب" دینے کا لفظ ہے۔

جب کہ باقی زبانوں میں دعا قبول ہوتی ہے۔ دعا کا جواب آنا واردات مذہبیہ کے تجزیہ پر مبنی ہے۔ اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر خدا سے رابطہ کے برعکس مذہب کی کوئی اور تعریف کی جائے تو وہ ناقابل قبول ہوگی۔ ہم کسی اخلاقی اصول یا وحدت الوجودی ہستی سے اپنی دعاؤں کا جواب نہیں لے سکتے۔ اور نہ ہی اس سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کیا ہمیں خدا کی محبت کے بارے میں گفتگو کرنی چاہیئے؟

یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے یہ "روحانی محبت" ہے۔ لیکن محبت کا اصل مفہوم اور اس کی تکمیل تو جسمانی رابطہ کا تقاضا کرتی ہے۔ اور صرف جنسی محبت ہی یہ شرط پوری کرسکتی ہے۔ اس لئے جنس کے علاوہ محبت کی دیگر اقسام کمتر ہیں۔ یا پھر ہم انہیں محض استعارہ قرار دے سکتے ہیں۔

آخر میں رابطہ کی ایک اور قسم بھی نظر آتی ہے۔ جس کے لئے میرے پاس "کسی سے متعلق ہونا" سے زیادہ بہتر اور کوئی فقرہ نہیں۔ ہم اس کیفیت کو احاطہ الفاظ میں نہیں لا سکتے۔ جو جزو کل سے وابستگی کی صورت میں محسوس کرتا ہے۔ لیکن ہم سب اس سے ایک حد تک آشنا

---

[1] ایک ہندوستانی روایت سے اس اصول کی بڑی دلکش انداز سے وضاحت ہوئی ہے جب کام دیو! — محبت کے دیوتا — نے شیوا اور اس کی بیٹی کے تنازعہ میں دخل اندازی کی تو شیوا کے غضب نے اسے جلا کر بھسم کردیا۔ بعد میں اپنی بیٹی کی سفارش پر اس نے اسے زندہ تو کردیا لیکن اس کی شکل اور ڈیل ڈول نہ بنایا۔

بلکہ اب وہ دو محبت کرنے والوں کی ہم آغوشی کے دوران میں رونما ہوسکتا تھا اس لئے اسے انگ کہتے ہیں۔ اس کا لغوی مطلب ہے جس کا جسم نہ ہو۔

ضرور ہیں۔ کنبہ، قوم، ملک، انسانیت وغیرہ ہم سب ان میں سے کسی نہ کسی سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ تعلق دیگر مرئی اور غیر مرئی اشیاء سے بھی استوار کیا جا سکتا ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر سینٹ فرانسس پرندوں کی بولیاں سمجھ لیتا تھا۔ ایک دست کار اشیاء تیار کرنے والے مواد کو سمجھتا ہے۔ اسی طرح فن کار، سائنسدان اور فلاسفر اس تصور کی پکار کو سمجھتے ہیں۔ جسے اظہار کے لئے خیالات الفاظ، کانسی اور پتھر کی ضرورت ہوتی ہے۔

میرے خیال میں نابغہ کی صحیح تعریف یہی ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جو قوانین اشیاء سے ہی واقف نہیں۔ بلکہ واضح یقین اور اعتماد کے ساتھ ان قوانین کا تجربہ اپنی ذات میں بھی کرتا ہے۔ یہ تجربہ محبت کو بھی رفعتوں سے روشناس کراتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر۔ گو سرسری طور سے ہی سہی۔ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہیئے کہ محبت جو کچھ بھی ہے اسے ہم کسی پیمانہ سے نہیں ناپ سکتے۔ ہمارے پاس ایسے اوزان نہیں جن سے محبت کو تولا جا سکے۔ اس لئے کسی محبت کو "عظیم" قرار دینا اور کسی کو "کم تر" یا یہ کہنا کہ فلاں نے دوسرے کے مقابلہ میں فلاں عورت سے "زیادہ" محبت کی۔

یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ ایسے مواقع کے لئے وہی اصول کارفرما ملتا ہے جس کی ابھی ابھی وضاحت کی جا چکی ہے۔ یعنی ایک انسان مختلف افراد سے ایک ہی نوع کی محبت نہیں کر سکتا کیوں کہ شخصیتوں کے اتصال کے عمل اور اس کے نتائج کا اظہار دونوں کی انفرادی خصوصیات پر ہے۔ کسی شخص سے "عظیم" محبت کی جاتی ہے۔

اگر ایک لمحہ کو "عظیم" کا استعمال کر لیا جائے۔ تو کسی ہلکی شخصیت والے سے کم تر محبت ہوتی ہے۔ لیکن دونوں محبتوں کا مکمل ہونا لازمی ہے۔

اس ضمن میں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات کسی نا اہل سے کی گئی عظیم محبت کا زیاں ہی ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ بالکل درست ہے کہ ایسا اس غلطی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرے کی محبت کی صلاحیتوں کے بارے میں مبالغہ آمیز تصور سے کام لیا جائے لیکن کیا اس سے ہمارے پہلے نظریہ۔ محبت بلا خطا اپنے مرکز کا انتخاب کر لیتی ہے۔ کی تکذیب نہیں ہو جاتی۔؟ یقیناً تکذیب ہوتی ہے۔ لیکن اصول اپنی جگہ بالکل درست ہے صرف بعض اوقات عملی زندگی میں ایسا ہو جاتا ہے اور وہ بھی اس بنا پر کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض خارجی اور داخلی عوامل بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

مثلاً جسمانی کشش یا کسی ایسی خصوصیت سے مسحور ہو جانا۔ جس کا محبت سے کوئی تعلق نہیں اس سے محبت پر پھر اول دھوکہ کھا سکتا ہے۔ یا محبت کا گمان ہو سکتا ہے۔ محبت خطا نہیں کھاتی۔ محبت کرنے والا خطا کر سکتا ہے ایک ہلکا شخص محبت بھی "ہلکی" ہی کرے گا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس کے لئے وہی محبت عظیم ہو۔ اس میں اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ محبوب کی شخصیت کی اصل قدر کا تعین کر سکے۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ محبت کا جدید تصور بارہویں صدی عیسوی میں اس وقت معرضِ وجود میں آیا جب اندھی رومانیت کی بجائے اس میں حقیقت پسندی سے کام لیا جانے لگا محبت کا دکھ درد۔ تکلیف اور اذیت سے ایسا گہرا رشتہ جوڑا گیا کہ اب تک محبت کے تجربہ کے لئے ان سب کو ناگزیر سمجھا جاتا ہے اس کی وجہ پر غور کریں تو کچھ پلے نہیں پڑتا۔

ہمارے لئے اس سلسلہ میں کسی نظریہ کا وضع کر لینا مشکل نہیں خصوصاً اگر اس مسئلہ کو مذہبی پس منظر میں سمجھا جائے تو بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ دکھ اور تکلیف ایمان اور صبر کے امتحان کے لئے ہیں۔ یا پھر جسمانی انحطاط یا روحانی جوش میں کمی سے آگاہی کے لئے ایک طرح کی تنبیہ ہیں۔ ایسا انداز نظر اپنانا مشکل نہیں بلکہ جدید سائنس نے تو محض قیاس کی بنا پر یہ سب کچھ فرض کر رکھا ہے۔ لیکن یہ تمام دلائل بے وزن ہیں۔ اور ان سے وہی قائل ہو سکتا ہے۔ جو پہلے سے ہی انہیں صحیح تسلیم کرتا ہو۔ اس لئے میں مسئلہ کے چند پہلوؤں کی وضاحت کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکوں گا۔

محبت کرنا۔ جیسے کہ وضاحت کی جا چکی ہے۔ ایک تخلیقی عمل ہے۔ اس لئے اس میں اذیت اور خوشی کی وہ تمام کیفیات ملتی ہیں۔ جن سے تخلیقی استعداد رکھنے والا ہر فن کار آشنا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ مکمل کیا گیا فن پارہ تصور کی صحیح اور جامع تصویر کشی کرتا ہو۔ بالکل اسی طرح محبت بھی ناقابلِ آسودگی ہے۔ کیوں کہ یہ مسلسل تمنا اور پیہم آرزو کا نام ہے۔ عدم تکمیل کا یہ احساس اور اپنی استعداد کے بارے میں شک وشبہ کا اندوہ اس اذیت کی کم از کم ایک وجہ تو ضرور ہے جو سچی محبت کے لئے لازم و ملزوم نظر آتی ہے۔ کئی عورتیں اس کی گواہی دے سکتی ہیں اور ان سے بڑھ کر اسے کون جان سکتا ہے۔ چنانچہ میڈموازیل ڈی لیس پی من نے ایک دوست کو یوں لکھا جس طرح محبت کرنی چاہیئے میں تم سے ویسے ہی محبت کرتی ہوں۔ لیعنی۔ بڑا اندوہ! "میرینا الکو فورڈو۔ پرتگال کی اس مشہور نن نے جس کا محبت کرنے والوں میں بہت اونچا مقام ہے اپنے محبوب کو یوں لکھا: "تم نے مجھے جس کربناک کیفیت سے دوچار کیا ہے میں اس کے لئے تمہاری تہ دل سے مشکور رہوں۔ الوداع! مجھ سے محبت کئے جاؤ اور مجھے اس سے بھی زیادہ کرب عطا کئے جاؤ۔"

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے الہیات کے مصنفین اور فلاسفروں کے خیالات کے برعکس اذیت اور دکھ تکلیف کا مقصد نہیں بلکہ اس کے نتائج ہماری روحانی اور ہیجانی حساسیت کے لئے بیش بہا ثابت ہوتے ہیں۔ ان سے ہماری ذہنیت کے اس نہاں خانہ کے در وا ہو جاتے ہیں جو اب تک سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔

کرک گارڈ کے بقول "غم و اندوہ ان عوارض میں سے ایک ہے جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے ناواقف رہنا زندگی کی سب سے بڑی بدبختی ہے۔" کیوں کہ "غم و اندوہ ہی کے ذریعہ روح کی گہرائیوں میں جھانکنے کا موقعہ ملتا ہے۔"

واضح رہے کہ اس کا فراجی لذت کے ارتفاع سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بالکل غلط ہے کہ مجروح جنسیت محبت کا روپ دھار لیتی ہے اور دبائی گئی محبت اور اندوہ۔ شادی و غم۔ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور یہ دونوں ہی ہماری شخصیت میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ بشرطیکہ شخصیت میں اضافہ کی گنجائش ہو۔ ورنہ عدم شخصیت کی صورت میں تلخیاں اور عناد ہی فرد کے حصہ میں آتے ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو اس کشمکش کی صورت میں ملتا ہے جس کے لئے زمانہ رطب اللسان چلا آتا ہے۔ یہ کشمکش محبت اور ہر نوع کی چاہت کے درمیان ملتی ہے۔ جیسے فرض وفاداری، کام وغیرہ

درحقیقت یہ کاذب مسئلہ ہے اور اس کی اساس "فیصلہ" کے شعور کی خام نفسیات پر استوار ہے۔ یہ محبت کو عقلی اور مادی کسوٹی پر پرکھنے کے مترادف ہے۔ اس صورت میں صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ جب ہر دو میں ہی کچھ قابل پیمائش خصوصیات مشترک ہوں۔

مثلاً یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کس کاروبار میں زیادہ نفع ہوگا۔ گرم کوٹ خریدنا ہو تو یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کون سا کوٹ زیادہ موزوں رہے گا۔ بلکہ دیکھا جائے تو یہ کام بھی اتنا آسان نہیں اور اکثر عورتیں بتا سکتی ہیں کہ موزوں ترین ٹوپی خریدنے کے لئے انہیں کتنی دیر لگتی ہے اور یہ کتنا مشکل کام ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے جوں جوں اقدار بلند سے بلند تر ہوتی جائیں توں توں فیصلہ کرنا مشکل ہوتا جاتا ہے اور ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں فیصلہ حقیقی فیصلہ نہیں بلکہ کوئی مصنوعی چیز بن جاتی ہے۔ اس لئے افراد اور روحانی اقدار کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدروں کا ایک دوسرے سے تقابلی مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔

لازمی نوعیت کے مسائل زیست ناقابل حل ہوتے ہیں۔ زندگی بسر کرتے کرتے ایسے مبہم مواقع کے لئے حل یا اس سے بھی زیادہ بہتر یہ ہے کہ بے تابی سے کئے گئے سوالات کے باوجود جوابات خود زندگی کی تہ سے ہی پھوٹ پڑتے ہیں۔ کسی وجدانی لمحہ میں ہی ایک پل کے اندر ہم پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے لئے کیا ضروری ہے۔ ایک لمحہ پہلے ہمیں جو متبادل صورت اہم معلوم ہوتی تھی اب وہ بالکل ہی غیر اہم نظر آنے لگتی ہے۔ بے یقینی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور حل "معلوم" ہو جاتا ہے۔ اسے "فیصلہ" اور "ارادہ" کے فرق سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ فیصلہ شعور اور استدلال پر مبنی ہوتا ہے جب کہ ارادہ یا عزم ہمارے وجود کی گہرائی سے جنم لیتا ہے اور وہ ہمارے شعور تک پہنچتے پہنچتے مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔ ہم تو صرف اس کی مکمل صورت سے آشنا ہوتے ہیں۔ ارادہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ فرد کے لئے کیا کچھ ضروری ہے۔ ہم اسے ناگزیر محسوس کرتے ہوئے اس کے لئے ہر طرح کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ میں ارادہ اور عزم کی تکمیل کو محض کام اور فعل سے ممتاز سمجھتے ہوئے ایک کارنامہ تصور کرتا ہوں۔ اور ایسا ہر کارنامہ تخلیق ہے۔

محبت کی ماہیت کے ساتھ ساتھ میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے اب یہ واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ محبت اور فرض کے درمیان کشمکش، حیلہ سازی ہے۔ اس سے ایسے لوگ پریشان ہوتے ہیں۔ جنہوں نے نہ تو کبھی محبت کی اور نہ ہی وہ یہ سمجھ سکے کہ فرض خارجی کے دباؤ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے محبت ہمیں ہیجانی بندھن میں جکڑ کر زمانہ بھر سے بے نیاز نہیں بناتی بلکہ اس کے برعکس یہ تو شخصیت میں وسعت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ وہ صرف اپنی محبوبہ ہی کو نہیں بلکہ تمام زندگی کو اپنے بازوؤں میں لے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور کام تو اس ابلتی توانائی کے مختلف مظاہر میں سے صرف ایک کا نام ہے۔

سچی، عظیم اور کم تر۔ ہر طرح کی محبت کرنے والے افراد ہی۔ ادھر کنواں ادھر کھائی والی کیفیت سے دوچار ہوتے آئے ہیں۔ محبت اور کام کے درمیان سبھی کشمکش محسوس کرتے ہیں۔ اس کشمکش کا احساس ہوتے ہی ارادہ کر لیا جاتا ہے لیکن وہ اس ناگزیر حقیقت کو غم و اندوہ سے تسلیم کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ انسان ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ شاید یہ زہر بھرا پیالہ ان کے آگے سے گزر کر چلا جائے جب ایسا نہیں ہو سکتا تو وہ اسے پینے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کشمکش میں کبھی محبت کی فتح ہوتی ہے۔ تو کبھی فرض کی اس کا باعث محبت کی قوت یا کمزوری نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص کی تمام شخصیت اور ذات محبت کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے جب کہ بعض کے ہاں فرض کا تصور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اگر فرض اور محبت دونوں کی یکساں قوت ہو تو بعض اوقات کسی فیصلہ سے پہلے فرد کو طویل اور تکلیف دہ کشمکش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔

بسا اوقات لوگ اپنی ذات اور شخصیت کو اظہار کا موقع نہیں دیتے یا وہ پریشانی کے باعث جلد بازی سے کام لیتے ہوئے غلط فیصلے کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے مردوں کی اکثریت ہے جن کی شخصیتیں ممتاز اوصاف سے عاری ہونے کی وجہ سے غیر نمایاں ہوتی ہیں۔ ایسے مردوں کے لئے عقلی استدلال کی امداد لازمی ہے۔ اور انہیں زندگی کے عملی پہلو سامنے رکھ کر کوئی قدم اٹھانا چاہیئے۔ ایسے تمام لوگوں کو ہم مثالی نہیں قرار دے سکتے۔ یہ تو اس معیار سے کہیں، پست سطح کے ہوتے ہیں۔

مندرجہ ذیل مثال بڑی خوبصورت اور منفرد انداز سے فیصلہ کی نفسیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مادرانہ محبت اور جنسی محبت کا فرق بھی واضح کرتی ہے۔

ایک عورت اپنے خاوند سے علیحدہ ہو چکی تھی اب وہ ایک اور شخص سے شادی کی خواہاں تھی لیکن اس کا بچہ راستہ کی رکاوٹ بن سکتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس آدمی کی محبت اس کی زندگی اور مستقبل کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن بغیر کسی کشمکش اور قوت فیصلہ کے اسے یہ احساس تھا کہ اس کی جگہ اس کے کمسن بچہ کے پہلو میں ہے اس لئے نہیں کہ بچہ اس کے خون اور "گوشت" کا حصہ ہے۔ بلکہ اس لئے کہ بچہ کو اپنی ماں سے مکمل طور سے آزاد ہونا چاہیئے۔ اس میں یہی نکتہ ذاتی اپیچ رکھتے ہوئے مسحور کن ہے۔ بچہ کے برعکس اس کے خیال میں محبت کی وجہ سے محبوب اس کی ذات کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ بچہ کی آزادی اس کے لئے ایک فرض ہے۔ جب کہ اس مرد سے اتصال کسی طرح کے حقوق کا باعث نہ تھا۔ اس لئے اس کے لئے اب کسی طرح کی کشمکش نہ تھی اور اسے ذہنی سکون میسر تھا۔

یہاں پر جو اعتراض کیا جا سکتا ہے میں خود ہی اس کی وضاحت کئے دیتا ہوں۔ تمام عظیم روحانی راہنما اپنے حلقہ بگوشوں کے لئے اپنے کنبوں سے قطع تعلق کو اولیں شرط قرار دیتے تھے۔ شخصیت کے دنیاوی پہلو کے خاتمہ سے فرض اور محبت کی کشمکش کو ختم کرنا مقصود ہوتا ہے گو حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی یہ بڑی انوکھی سی بات ہے ان پیروکاروں کے سامنے روحانیت کا جو ارفع معیار ہوتا تھا۔ اس کے باعث وہ لوگ دنیا کے عام معاملات اور علائق سے ماورا ہو جاتے تھے۔ ہم کسی صوفی کو مکمل بشر نہیں کہہ سکتے۔ اکمل انسان کے لئے شخصیت کے تمام پہلوؤں میں عظیم یکسانیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ صوفی صرف ایک ہی معاملہ میں کمال پیدا کرتا ہے۔ اچھے صوفی سے نفی خودی اور حقیقت کل میں مدغم ہو جانے کی توقع رکھی جاتی ہے۔ جب کہ یہ دونوں ہی انفرادیت کے برعکس ہیں۔ انفرادیت بشر کے لئے لازمی ہے۔ اور محبت کا تو اس کے بغیر گزارا ہی نہیں کیوں کہ اسی سے ہم ذہنی۔ روح اور جسم میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ جنسی محبت میں انسانی زندگی کے بہترین عناصر ملتے ہیں۔ اس لئے محبت کے ضمن میں اسے سب سے اعلیٰ مقام دیتے ہوئے محبت کی دیگر اقسام کو ذیلی درجہ دیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ انہیں اس سے مشابہ اور کم سے کم اس پر استفادہ قرار دیا جاتا ہے۔

محبت کے جسمانی اظہار کا نام جنسیت ہے۔ اور اس کا ثبوت۔ اگر واقعی شہوت کی ضرورت ہو۔ دونوں جنسوں کے درمیان روحانی محبت کی صورتوں میں ملتا ہے۔

حتیٰ کہ ان مثالوں میں بھی جہاں ہم جنسی لمس کا نام بھی نہیں لے سکتے۔ جنس کارفرما ملتی ہے۔ اس کے زیر اثر مرد میں عورت کے لئے جذبات میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی لطیف تمنا صرف یہ چاہتی ہے کہ وہ اس کے قریب رہے اور وہ ہاتھ چھونے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کرتا۔ یہ مادہ کے لئے روح کا خراج عقیدت ہے۔ مرد اور عورت کے ایسے ترقی یافتہ رابطہ کا بدلہ جسم شاہانہ فیاضی سے چکاتا ہے۔

دو محبت کرنے والے مکمل اتصال کی پیدا کردہ مدہوشی اور مستی سے بیداری کے بعد جب ایک دوسرے کو "من" و "تو" کے لحاظ سے دیکھتے ہیں۔ تو ان میں ایک طرح کا تناؤ پیدا ہو جاتا ہے دو افراد کے رابطہ میں یہ تناؤ ناگزیر ہے۔ اور یہ تناؤ جسمانی اختلاط سے ختم ہوتا ہے

یک جائی کی اس صورت میں بھی من و تو کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا اظہار انزالی کیفیت کی پر مسرت اور عورت کے شہوانی ہیجان سے ہوتا ہے۔ آسودہ عورت کی تھکی تھکی مسکراہٹ میں جو خیریت تشکر ملتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مردانگی کی تخلیقی کارگزاری سے بڑھ کر مرد کے لئے کوئی امر باعث تسکین نہیں ہوتا اور بے ہوشی سے مشابہ ان دونوں کی نیند سے بڑھ کر حسن کا اور کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بیداری پر وہ خود کو پھر اس جہان حقیقت میں پاتے ہیں۔ لیکن اب ان کی محبت میں پہلے سے بھی زیادہ دلکشی ملتی ہے۔

خالص جسمانی احتیاج ، وہ محبت پر مبنی جنسی اتصال سے حاصل شدہ تسکین میں جو فرق ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اولیں اختلاط عدم تسکین بلکہ کراہت اور نفرت پر منتج ہوتا ہے۔ محبت کی بقا کے لئے جنسیت لازمی ہے اور قوت حیات کے سرچشمہ کے سوکھنے پر یہ بھی مرجھا جاتی ہے۔ انزال اس اتصال کے لئے مہر کی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ اس کے مکمل ہونے کی دلیل کے ساتھ ساتھ محبوب کے خلوص کی لازمی شرط اور قیمت بھی ہے اس کھیل میں مہنگی شرط لگتی ہے۔ یعنی محبوب کی تمام شخصیت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور ان کے بدلہ میں دولت، عزت، سماجی درجہ اور ایسی دیگر چیزیں ناقابلِ قبول ہوتی ہیں۔ اس شرط کی بجا آوری سے ہی مکمل تسکین دہ اور قوت بخش انزال حاصل ہو سکتا ہے۔ جنسی حظ کا مطلب آخری سچائی ہے اور یوں جسم اخلاق کے محافظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کیا سچی محبت دائمی ہوتی ہے یا کسی وقت اس کا شعلہ بجھ سکتا ہے۔ یا اس کا ختم ہونا ضروری ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایسے سوالات کے جوابات پر اتفاق رائے نہیں ملتا۔ افراد اشیاء اصولوں، مقاصد اور تصورات کے لئے وضع کردہ "لازمی" طرزِ عمل کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ گو کئے گئے عہد کا اظہار زبان سے تو نہیں ہوا۔ لیکن اس سے مراد ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ یہ طرزِ عمل ہمیشہ برقرار رکھا جائے گا۔ یکساں روی مثالی شخصیت کی اہم خصوصیت ہے۔ گو طرزِ عمل سے یہ وفاداری بالآخر اپنی ذات اور شخصیت سے وفاداری کی صورت اختیار کر جاتی ہے اگر ہمیشہ اور ہر معاملہ میں ایسا نہیں ہوتا تو اس کی ایک وجہ تو خود انسان کی اپنی خطا پذیری ہے۔ لیکن ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے تمام تعلقات کیونکہ محدود اور تھوڑے عرصہ کے لئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک نہ ایک دن انہوں نے ختم ہونا ہی تھا۔ بلکہ اس کے برعکس اگر ان کی برقراری کے لئے جدوجہد کی جائے۔ تو وہ تکلیف دہ کشمکش کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ دائمی وفاداری کا یہ اصول سب سے بڑھ کر محبت پر لاگو ہوتا ہے۔ ہر محبت دائمی ہونی چاہیئے۔ اس کے برعکس یہ عام مشاہدہ ہے کہ محبت کتنی ہی پر خلوص کیوں نہ ہو۔ ایک نہ ایک دن وہ اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔ کیا یہ تمام محض سطحی معاشقے تھے۔ ایسا ثابت کرنا ناممکن اور اس پر یقین کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ ہم اس ضمن میں صرف یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ کیا محبت کی ماہیت میں یا محبت کرنے والوں کی فطرت میں ایسے عناصر موجود ہیں جن کی بنا پر محبت کی موت واقعی بلکہ لازمی ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں تین وجوہات بیان کی جا سکتی ہیں۔

اس سے پہلے یہ لکھا جا چکا ہے کہ محبت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ محبوب شخصیت کی تمام سطحی خصوصیات سے چشم پوشی کرتی ہے۔ اور محبت کی پہلی منزل — جب محبوب کی شخصیت مسحور کر لیتی ہے۔ کے لئے بالخصوص درست ثابت ہوتا ہے۔ لیکن روزمرہ زندگی کی چھوٹی موٹی الجھنوں اور دردسریوں کے ہجوم میں گھرے انسان کے لئے یہ اعلیٰ طرزِ عمل اپنائے رکھنا خاصہ مشکل ہوتا ہے۔

ایسی صورت حال کی پیدا کردہ بدمزگیوں سے اصل محبت عموماً ختم نہیں ہوتی۔ صرف مادرانہ محبت ہی محبت کی ایک ایسی قسم ہے جو ان تمام چیزوں سے غیر متاثر رہتی ہے۔ ماں کو بچوں کی حسن و قبح اور خوبیوں خامیوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ عورت کی محبت کے اس والہانہ اظہار کی مثال تعلقات کی کسی اور نوع میں نہیں مل سکتی۔

پر خلوص محبت کے لئے ایک اور خطرہ بھی مہلک ثابت ہوتا ہے اور وہ ہے محبوب کا گھٹیا پن جب محبت کرنے والے پر کچھ عرصہ بعد تدریج اور پر وثوق طریقہ سے یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی تمناؤں کا مرکز اس محبت کا اہل نہیں ہے "ایک قابل رحم انسان سے بھلا کیسے محبت کی جا سکتی ہے ؟" یہ تھا وہ احساس جس کے ساتھ ایک نوجوان عورت نے اپنی غلطی کا ازالہ کیا۔ اس سے ملتے جلتے فیصلہ کا اظہار نسبتاً ایک عورت نے اپنے دغاباز محبوب کے بارے میں کیا "اس

کے گھٹیا پن کو معاف کر دینے کے بعد ہی میں اس سے نفرت ختم کر سکوں گی۔"

محبت ختم ہونے کے لئے ایک اور اساسی وجہ بھی ہے۔ محبت کی اہم ترین کارکردگی یہ ہے کہ یہ ہماری شخصیت میں وسعت پیدا کر کے محبت کرنے والوں کی صلاحیتیں اجاگر کرتی ہے۔ لیکن جب محبت کرنے والے کی تخلیقی قوت ختم ہو جائے یا دوسرا فریق تخلیق کے مواد فراہم کرنے کی استعداد گنوا بیٹھے تو پھر محبت کی اس تخلیقی کارکردگی کے لئے اپنی موت آپ مر جانے کے علاوہ اور کیا چارہ رہتا ہے۔

"ہم اب ایک دوسرے کے لئے کچھ بھی نہیں رہے۔" یہ سب سے تلخ ترین الوداع ہے۔ محبت کے لئے دو طرفگی چاہیئے۔ یک طرفہ محبت اذیت دہ جنون کی صورت اختیار کر لیتی ہے جب اپنی محبت کے مرکز کی تسخیر چاہتا ہے وہ اسے ہمیشہ اپنے بس میں رکھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ لیکن ناکامی سے اس کی محبت مزاق اور نفرت کا روپ دھار کر کسی خوفناک موت سے دوچار ہوتی ہے بعض اوقات معصوم فریق بھی اس کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر محبت سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے۔

گو شاذ ہی — لیکن پھر بھی ایسا ہوتا کہ دو محبت کرنے والوں کی علیحدگی میں صرف کسی مخصوص عورت سے جدائی نہیں ہوتی۔ دل برداشتہ محبوب کو یہ کہہ کہہ کر جھوٹی تسلیاں دینا بڑی عامیانہ سی بات ہے کہ وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے اور ہیریسی کے برعکس ہر عورت شمع اتنی اہمیت بھی رکھتی۔ بعض آدمیوں کے لئے وہ واقعی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

میرے خیال میں تو ہر فرد بشر کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی شے ضرور ہونی چاہیئے۔ جس کے بغیر وہ اپنی زندگی میں خلا محسوس کرتا ہو۔ ایسی چیز جسے وہ اپنی زندگی کی جڑ تک ہلا دے۔ اور جس کے بغیر اسے وجود بے معنی اور بے مقصد معلوم ہونے لگے۔ بالفاظ دیگر یہ مطلق پر اعتقاد ہے۔ یہ درست ہے کہ ایسے بیان کو توڑ موڑ کر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کم ہمتی اور نرمی کے لئے باآسانی جواز ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ لیکن میرے ذہن میں جو مثال ہے اس میں نو زندگی بسر کرنے کی عدم استعداد اور مفاہمت کو مسترد کر دینا اگر اعلیٰ ترین نہیں تو کم از کم تکمیل ذات اور عظمت کے لئے سب سے بڑا ثبوت ضرور ہے۔ انسان کو زندگی بھر میں کم از کم ایک مرتبہ تو کسی ایسے شخص کے ضرور نیاز حاصل کرنے چاہئیں۔ جس کے بارے میں یہ المناک حقیقت صحیح ثابت ہوتی ہو کہ "اگر وہ شکستہ دل لئے اس جہان سے رخصت ہوا۔"

محبت کے عبوری ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پورے خلوص اور سعی کے باوجود بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ محبت کی صورت میں جنسی تعلقات کے تمام انداز تکمیل پا جاتے ہیں۔ یہ تو صرف شادی کی صورت میں ممکن ہے۔ محبت تو صرف شادی کے لئے فرد کو تیار کرتی ہے۔ جب کہ مرد اور عورت کے تعلقات کی تکمیل کے کل میں محبت بھی ایک فرد کی حیثیت سے شریک ہو کر اسے دوام دینے کا باعث بنتی ہے۔

بس! کیا یہی سب کچھ ہے ؟

کیا الفاظ کے اس تانے بانے اور جملوں کے اس بے ترتیب سلسلے کو محبت کی مکمل تشریح اور جامع تفسیر سمجھ لیا جائے ؟ وہ محبت جس کی ہمیں تمنا ہے، وہ محبت جس کے لئے ہم زندہ رہتے ہیں اور وہ محبت جسے ہم مسرت سے یاد کرتے ہیں۔ کیا یہ تشریح اس محبت کی ہے ؟

یقیناً نہیں !

محبت سے مسحور ہو کر طلب ماہیت کرنے ہی میں ہم محبت کی کیفیت سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایسے میں ہمیں ذاتی تجزیہ کی ضرورت نہیں رہتی جب ہم اس مخمور کن اور عجیب سے عالم سے اس دنیا میں واپس آتے ہیں تو ہم اسے خنک صبح کے ملگجے پن میں دیکھے گئے کسی جنسی خواب کی مانند یاد کرتے ہیں۔ زندگی کو الفت سے وابستہ رہ کر ہی بہتر بنایا جا سکتا۔ سائنس — جو ہو چکا ہے —

سے تعلق رکھتی ہے جب کہ محبت کی تمام نفسیات صرف لوحِ مزار ہے!

ہیولاک ایلس

عورت، جنس اور محبت

"شادی" کا کئی طرح سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں اسے قانونی ہم بستری" قرار دیا جا سکتا ہے۔ تہذیبی اثرات سے اس میں زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ اب یہ ہر ملک میں مروج اخلاق (یہاں اخلاق رزواج کے معنی میں ہے) کے تابع کر دی جاتی ہے یا پھر میکس کر سیچین کے الفاظ میں اسے ایک معاہدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسا معاہدہ جس میں جنسی تعلقات ہی نہیں بلکہ صحیح قسم کی معاشرتی زندگی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس معاشرتی زندگی کی اساس اقتصادی اور نفسی قدروں اور اخلاقی (یہاں اخلاقی سے سماجی مراد ہے) تقاضوں پر استوار ہوتی ہے۔ مگر ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر یہ ایک دوسرے کے لئے موزوں دو ایسے افراد کا آزادانہ انتخاب ہے جن کا مقصد محبت کے متنوع مظاہر کی بلا مزاحمت تسکین ہوتا ہے۔

کلو وی گرلی پر شکر چڑھانے کے طور پر جنسی تحریک کے ہر مظاہر کے لئے بالعموم "محبت" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہمیں شہوت یا عضویاتی جنسی تحریک کے تعلق سے میں تفریق کرنی چاہیئے۔

شہوت اور محبت کی تفریق کرنے والی ایسی جامع تعریفیں نہیں ہیں جن پر سب لوگوں کا بھی اتفاق ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ضمن میں کی گئی تعریفوں میں صرف مسئلہ کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

عبارت آرائی سے ہٹ کر اگر بات کی جائے تو محبت کو شہوت اور دوستی کا مرکب کہا جا سکتا ہے۔ عضویاتی لحاظ سے اس مسئلہ کو دیکھا جائے تو نورل کی ہم نوائی میں دماغی مراکز نے جنسی جبلت کے اظہار کو محبت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

جب جنسی تحریک وراثت کے بندھن سے آزاد ہو کر تخیل کی امداد سے دائمی صورت اختیار کر لے تو کانٹ اسے محبت کہتا ہے ادھر محبت کی مختلف تعریفوں کے محاکمہ کے بعد فینٹر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ محبت کشش اور خود سپردگی کا احساس ہے۔ کسی احتیاج سے جنم لینے والے یہ احساسات اس فرد کو اپنا مقصود بناتے ہیں جس سے آسودگی کی توقع کی جا سکتی ہو۔ یہ تعریف غیر موزوں ہے اور یہی حال دیگر تعریفات کا ہے۔

گو اپنی انتہائی صورتوں میں محبت بظاہر ایثار اور بے نفسی کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں کیوں کہ اس کی ماخذ اناتی تحریک ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ قربانی کی صورت میں بھی اناتی تسکین ملتی ہے۔ دیگر ماہرین کے ساتھ فرائیڈ نے بھی اپنے INTRODUCTORY LECTURES میں محبت کے اناتی ماخذ پر زور دیا ہے۔ کسی اور جگہ اس نے اس خیال کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے "بنیادی طور سے محبت نرگسیت ہے"

البتہ اس نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ بعد میں محبت اپنے ماخذ سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔ اگر فرائیڈ اور بعض دیگر ماہرین کے خیالات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو نرگسی جنسی عنصر سے قطع نظر بچہ کا اولین منصورالفت اس کی اپنی ماں ہوتی ہے۔

بعد ازاں، گر وہ نیوراتی نہ ہو تو یہ اولین منصورالفت اس کی پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ اور فطرتی طور سے۔ دوسری شخصیت محبت کا مرکز بن جاتی ہے۔

گو ابتدا میں جنسی تحریک نمایاں طور سے اناتی ہوتی ہے لیکن ارتقا پذیر ہو کر محبت کی صورت اختیار کرنے پر شعوری طور سے اس میں بے نفسی بھی شامل ہوتی ہے۔ فطرتی اور نارمل حالات میں اس کی جنسی نشو و نما میں شروع سے ہی بے نفسی اور لاغرضی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ انسان تو انسان جانوروں میں بھی فریقِ ثانی کے جذبات کا لحاظ کئے بغیر جنسی ترغیب اور بعد ازاں مجامعت نہیں کی جا سکتی ارتقائے الفت کے ساتھ بے نفسی اور لاغرضی کا یہ عنصر مدارج نشو و نما طے کر کے شعوری صورت اختیار کر جاتا ہے۔ بلکہ اناتی عنصر کو یہ تابع فرمان بھی کر سکتا ہے۔

ارتقائے الفت کے اس عمل کو دو گونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک باعث تو جنسی جبلت کی تمام عضویت میں پیدا کردہ تابانی ہوتی ہے۔ جس سے اعصاب ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ جنسی دائرہ سے باہر کے اعضا بھی اثر قبول کرتے ہیں۔ یہ اس وقت تک ہے جب تک کہ جنسی تحریک کی تسکین بلا مزاحمت اور فوراً ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا باعث جنسی جبلت کا کم و بیش یکساں نوعیت کے نفسی خصائص سے متصل ہونا ہے۔

مکمل جنسی نشو و نما کے بعد محبت کے ابتدائی دور میں۔ محبت کی مزید تقویت یکساں نوعیت کے ان ہیجانات سے ہوتی ہے جن کا منبع بچہ سے والدین کے تعلقات بنتے ہیں۔ اس لئے ماں کی جنسی محبت میں وہ صبر اور نرمی بھی ملتی ہے۔ جس کا وہ مظاہرہ اپنے بچوں کے لئے کرتی ہے اس طرح مرد کی محبت میں نگہداشت اور حفاظت کی شمولیت ہو جاتی ہے۔ شادی میں جنسی محبت معاشرہ کے ڈھانچہ کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اعلیٰ ترین صورتوں میں یہ مذہب اور فن کی تحریکوں سے لگا کھاتی ہے۔

اس معاملہ میں عورتوں کی حیثیت پیش رو کی سی معلوم ہوتی ہے۔ لیٹورنیو نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا کے اکثر خطوں کی عورتوں نے شہوانی شاعری کی تخلیق میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

بعض اوقات تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ محبت کے ہیجان پر ان کی اجارہ داری قائم ہو گئی ہے۔ واضح رہے کہ غیر متمدن اقوام میں شہوانی محرکات کے نتیجہ میں زیادہ تر عورتیں ہی خودکشی کرتی ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ امر ذہن نشین رکھا جائے کہ نسلی سطح کی انسانی نسلوں میں شہوت سے محبت کا برائے نام ارتقا ہوا ہے۔ بلکہ مہذب علاقوں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن میں یہ ابھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن میں یہ ابھی اپنی ابتدائی صورتوں میں ملتی ہے۔ "شہوت" کو عالمگیر حیثیت حاصل ہے۔ اور دنیا کی ہر زبان میں اس کے لئے لفظ مل جاتا ہے۔ لیکن محبت کو وہ آفاقیت حاصل نہیں اور دنیا کی کئی زبانوں میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں ملتا۔ محبت کی تلاش میں ناکامی بسا اوقات قابلِ ذکر اور غیر متوقع ہوتی ہے۔ جب کہ یہ ہمیں ایسی جگہ بھی مل سکتی ہے۔ کہ جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔

بعض جانوروں نے جنسی خواہش کو مثالی "حیثیت دے دی ہے۔ اس سلسلہ میں پرندے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک پرندہ اپنے بچھڑے ساتھی کے غم میں اگر گھل گھل کر جان دے دیتا ہے۔ تو محض سیدھی سادی جنسی جبلت کو اس کا باعث قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس صورت میں جبلت دیگر عناصرِ زیست کے ساتھ اس طرح سے گھل مل جاتی ہے کہ مہذب انسانوں میں بھی اس کا مظاہرہ نہیں مل سکتا۔ بعض وحشی نسلیں (مثلاً امریکی نہوس) محبت کے تصور سے ناآشنا اور ان کی زبان اس کے لئے کس لفظ سے معرا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس تدیلم پیروین کی زبان تو امیں اس کے لئے الفاظ کی تقریباً چھ سو مرکب صورتیں ملتی ہیں۔

عرصہ ہوا ہرنٹی نے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ امریکی انڈین کی زبانوں میں سے محبت کے تصور کی جا بہ بنیادی صورتوں کا اطلاغ ملتا ہے۔

(۱) بے ربط اور غیر مربوط ہیجانی پکار۔

۲ ۔ مماثلت اور مشابہت ۔
۳ ۔ ملاپ یا اتصال ۔
۴ ۔ خواہش ، تمنا اور آرزو ۔

برنٹن مزید رقم طراز ہے کہ یہ وہی تصورات ہیں۔ جن کے اظہار کے لئے عظیم آریائی زبانوں میں الفاظ کی کثرت ملتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے۔ کہ آریائی زبانیں بولنے والے افراد نے جنسی محبت کے تصور کی نشوونما میں سست روی کا ثبوت دیا۔ جب کہ امریکی مایا ہیں۔ جو کہ بلحاظ تمدن ۔ قدیم آریائی اقوام کے مقابلہ میں بہت پسماندہ تھے۔ محبت کے خط کے لئے ایک ایسا مشتق لفظ بھی تھا۔ جو خالص نفسی کیفیات کی ترجمانی کرتا تھا۔

یونانی بھی جنسی محبت کو مثالی قرار دینے میں پسماندہ ہے۔ ان کے لئے یہی محبت بالعموم ہم جنس پرستی ہوتی تھی۔ قدیم یونانی شاعروں نے بالعموم عورت کو حصول لذت کا ایک آلہ اور کنبہ کی بنیاد رکھنے والی ہستی قرار دیا ہے۔ تھیوجنس شادی کا مقابلہ مویشیوں کی افزائش نسل سے کرتا ہے جب القمان سپارٹا کی لڑکیوں کی عزت افزائی کرتا تو وہ انہیں اپنے زنانہ دوست لڑکے قرار دیتا۔ ایچی لیس تو باپ تک کے دل میں بھی یہ خیال ڈال دیتا ہے۔ کہ تنہا چھوڑنے پر اس کی بیٹیاں ضرور گڑبڑ کریں گے۔

سوفوکلینر کے ہاں جنسی محبت کا فقدان ملتا ہے۔ جب کہ یوری پیڈیز کے ڈراموں میں صرف عورتیں (مردوں) محبت میں گرفتار ہوتی ہیں۔ یونان میں کافی دیر تک جنسی محبت کو قابل حقارت سمجھتے ہوئے عام مجمع میں ترجمانی اور بحث مباحثہ کے ناقابل سمجھا جاتا تھا۔ یہ یونان نہیں بلکہ میگنا گریشیا تھا۔ جہاں بینیک کے بقول مردوں نے اور وہ بھی سکندر کے عہد تک ۔ عورتوں میں دلچسپی لینی شروع کی اس سلسلہ میں ایسی کلے پی ڈس نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں کے مردوں کے لئے عورت کی محبت زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتی تھی۔ اس کے بعد یورپ میں جنسی محبت کے رومانی تصور کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اور گارسٹن ہیرس کے بقول کلٹی زبان کی مشہور نظم ٹرسٹرم کی صورت میں مسیحی یورپ کی شاعری میں اسے انسانی زندگی کے مرکز اور کردار کے نئے عظیم اور پرقوت محرک کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن یہ رومانی تصورات عوام الناس تک رسائی نہ حاصل کر سکے ۔ کیوں کہ عوام کی اکثریت کے لئے اب بھی "محبت" صرف جنسی اختلاط کا نام تھی۔

مکمل نشوونما کے بعد محبت کا ایک بے حد وسیع اور بے انتہا پیچیدہ ہیجان کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔ جب کہ شہوت اپنی بہترین صورت میں بھی ثانوی حیثیت رکھنے والے بے شمار عناصر میں سے ایک عنصر ہوتی ہے۔

اپنی کتاب PRINCIPLES OF PSYCHOLOGY میں ہربرٹ سپینسر نے بڑے دلچسپ انداز میں محبت کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے نو اہم اور جداگانہ عناصر میں تقسیم کیا ہے۔

۱ ۔ جنس کی جسمانی تحریک ۔
۲ ۔ احساس جمال ۔
۳ ۔ اظہار خوشنودی ۔
۴ ۔ عزتِ نفس ۔
۵ ۔ رغبت ۔
۶ ۔ تعریف اور عزت ۔
۷ ۔ احساس ملکیت ۔
۸ ۔ ذاتی مفاد سے بلند ہو کر افعال کی آزادی ۔
۹ ۔ باہمی احساسات کی سربلندی ۔

اس تجزیہ کا اختتام اس نے یوں کیا ہے۔ "ہمارے ابتدائی نوعیت کے جوش دلانے والے تمام محرکات اس جذبہ کی صورت میں ایک عظیم ہم آہنگی اختیار کر لیتے ہیں۔"

گو یہ تجزیہ بہت جامع ہے لیکن اس میں بھی ایک اہم عنصر کی فرو گذاشت ہو گئی ہے۔ یہ وہ محبت ہے جس کی اساس ۔ جیسے کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ مادرانہ اور پدرانہ تحریکوں پر استوار ہے یہ عنصر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جب ازدواجی تعلقات میں سے خالص جنسی تحریکوں کے پس منظر میں چلا جاتا ہے تو خاوند کی بیوی کے لئے محبت اور خصوصیت سے خاوند کے لئے بیوی کی محبت بچہ کی محبت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

محبت کے ہر تجزیہ کے بعد ہم کرالے کی ہم نوائی میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ زندگی کی مانند محبت کی تعریف بھی بے حد مشکل ہے۔ غالباً دونوں صورتوں کی وجوہات میں بھی اشتراک ملتا ہے۔ معاشرہ میں محبت کی متنوع صورتیں اہمیت کے لحاظ سے صرف جبلت حیات سے کم تر قرار دی جا سکتی ہیں۔

افراد کنبہ کی اس سے شیرازہ بندی ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ ان میں اتفاق اور یگانگت بھی اس کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ قوموں یا نسلوں میں اخوت اور بھائی چارہ بھی اس کا مرہون منت ہے۔"

محبت کے اس مختصر سے جائزہ سے کم از کم سطحی سوجھ رکھنے والے پر بھی ۔ اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے۔ کہ ہم یہاں اس رومانی واہمہ سے بحث نہیں کر رہے۔ جسے یک قلم موقوف کیا جا سکتا ہو۔ نہ ہی بزعم خود بعض تجزیہ نگاروں کے خیال کے مطابق اسے نفرت کی منقلب صورت قرار دیا جا رہا ہے۔ ہمیں بھی الیس کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ فی زمانہ کسی لفظ میں بھی اتنا جھوٹ اور دغا فریب نہیں بھرا جتنا کہ اس چھوٹے سے لفظ "محبت" میں ہے۔ لیکن یہ لفظ جن باتوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ اپنی جگہ برقرار ہیں۔ جس حد تک اس لفظ کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے اس کی اہمیت اور قدر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ صرف سونا، ہیرے اور دیگر قیمتی دھاتوں ہی کی نقل کی جاتی ہے۔ یا ان کے گھٹیا نعم البدل تلاش کئے جاتے ہیں۔

دیگر افراد اور ان کی خواہش کے بغیر اپنی ذات کا تصور محال ہے۔ اس لئے دوسرے لوگوں اور ان کے پیدا کردہ ہیجانات سے قطع نظر کرنے کے لئے پہلے اپنی ذات کو پس پشت ڈالنا ہو گا۔ زندگی اور محبت کا ناطہ گہرا ہے۔ اگر محبت واہمہ ہے تو زندگی کو بھی ایک واہمہ ہی قرار دینا ہو گا۔

جب ہم مزید غور کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ محبت کا فرد اور نسل دونوں سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس سے فطری مقاصد ہی کا حصول نہیں ہوتا۔ بلکہ روحانیت بھی اس کے دائرہ میں آ جاتی ہے ہمیں جانس گبسن کے اس قول میں صداقت نظر آتی ہے۔ کہ محبت قلب ماہیت اور شمولیت کا عظیم وسیلہ اور حیات کل کا آخری وصف ہے۔" اس لئے تو یہ کہا گیا ہے کہ محبت عظیم وصف ہے اور وصف محبت ہے۔ یا جیسے کہ مسیحیت کے ابتدائی دور سے تعلق رکھنے والے ایک دینی راہبر نے کہا تھا۔ "خدا محبت ہے۔"

محبت کو (مثلاً جانس گبسن) ایک جذبہ اور والہانہ پن یا شوق بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان اس کی تعریف دو مختلف نکات نظر سے کی جا چکی ہے۔ بہر حال اس کی کیسی ہی کیوں نہ تعریف کی جائے اتنا تو ضرور ہے کہ ہیجانی زندگی کی یہ ایک پیچیدہ اور مستقل قسم کی صورت ہے۔ جذبہ قرار دینے سے یہ نسبتاً زیادہ ذہنی لطیف اور گھمبیر ہیجانی احساسات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جب کہ اسے والہانہ پن قرار دینے سے یہ شدید اور قوی ہیجانات کے نظام کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں شوق کا وہ مطلب لیا جا رہا ہے۔ جس کی وضاحت اے ایف شینڈ نے ان الفاظ میں کی ہے۔ یہ خواہشات اور ہیجانات کی منظم صورت ہے۔ یعنی اس میں ہیجانات کے علاوہ کچھ اور بھی ملتا ہے۔ ہر شوق میں کم و بیش ضبط نفس کا ایک نظام ملتا ہے اس نظام کی کارکردگی

کیسے ہوتی ہے۔ یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کی شدت پر اس سے ایک حد تک قابو پا لیا جاتا ہے۔ اس نظام کی منظم صورت اور یک رنگی پیدا کرنے والے اصول کی بناء پر ہم محبت کے شوق کو گہری عقل سے ممیز ایسی صفت قرار دے سکتے ہیں۔ جس میں دوام کے ساتھ ساتھ محرکی اور تنظیمی خواص بھی ملتے ہیں۔ یعنی اس کی فطری نشوونما کے لئے۔ اور ہم اس سے بحث کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر بامس کیمن کے الفاظ میں "مقصود میں مسرت" ایک لازمی شرط ہے۔ اگرچہ اس مسرت کا رشتہ درد اور غم سے بھی استوار ملتا ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ہیجانات ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اور یوں محبت کے پیدا کردہ شوق میں خوشی اور غم کا یہ امتزاج شوق الفت کی تقویت کا باعث بنتا ہے۔ اس پیچیدگی اور معنویت کے باعث محبت ارفع اور یکتا صورت اختیار کر کے تمام جذبات کی سرتاج بن جاتی ہے۔

اتنا کچھ سمجھ جانے کے بعد بھی ہم ابھی تک اس مقام پر نہیں پہنچے کہ محبت کے وسیع تر مفہوم کو سمجھ سکیں۔ تمام جذبات کی سرتاج محبت وسیع پیمانہ پر اظہار انانیت بھی تو ہو سکتی ہے اس لئے خواہ اس کے لئے کتنے جواز ہی کیوں نہ مہیا کئے جا سکیں۔ یہ کتنی اعلیٰ اور ارفع کیوں نہ معلوم ہو۔ اس کا درجہ خام [illegible] سے کسی بھی بلند نہیں ہو سکتا۔

اس صورت میں محبت [illegible] توانائی کا منبع بن جاتی ہے۔ لیکن اگر دونوں فریق ایک دوسرے کو [illegible] کا مرکز [illegible] یہ توجیہ توانائی ضائع ہو جائے کہ محبت [illegible] اشیاء میں سے [illegible] زندگی [illegible] اور [illegible] پیدا کرتی ہے۔ لیکن جیسے کہ [illegible] دوسرے کے لئے دو افراد کی محبت [illegible] اپنے اپنے دائرہ میں مفید [illegible] محبت بہتر زندگی بسر کرنے کا مقصد نہیں بن سکتی۔ زندگی میں ایسے مقاصد بھی ہوں گے جو محبت کرنے والے جوڑے کی ذات سے بڑھ کر اس وسیع دنیا اور مستقبل کے لئے [illegible] بن جاتے ہیں۔ ایسے مقاصد جن کا حصول چاہے ناممکن ہو لیکن جن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ محبت کا کسی ایسے ہی اعلیٰ اور ارفع مقصد سے رشتہ استوار کرنے پر اس میں گہرائی اور اہمیت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے محبت عبادت سمجھی جاتی ہے۔"

محبت کی ایک بنیادی خصوصیت کا تذکرہ رہ گیا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جسے معلمین اخلاق بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسا کرتے وقت وہ اکثر تفصیلات سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہے: مقصود میں مسرت۔

اور یوں ہم اپنے موضوع ۔ محبت ایک فن ہے ۔ کی حدود میں آ جاتے ہیں۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب نہ تو نفسیات اور نہ ہی اخلاق کی کتابوں میں محبت کا ایک فن کی حیثیت سے جائزہ لیا جاتا تھا۔ یہ موضوع شاعروں کے لئے چھوڑا گیا تھا۔ جو اس پر قانع تھے کہ اسے ایک "ناجائز" موضوع ہی رہنا چاہیئے۔ اور پھر اووڈ کا زمانہ آیا جس نے فن الفت پر لکھا اور یوں لکھا کہ ڈیڑھ ہزار سال تک وہ مشہور اور بعض اوقات رسوا رہا۔ عیسائیت کے بعد بھی کچھ یہی حال رہا۔ جنسی محبت کو نامناسب، غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ سمجھا جاتا تھا اس لئے ادب یا سماج میں اس کا تذکرہ بطور فرض کیا جاتا تھا۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ جدید عہد کے لئے فن الفت کو بارہویں صدی کے اہل فرانس نے دریافت کیا۔ اس وقت بھی اسے قدرے ناجائز فن ہی سمجھا جاتا تھا۔

مگر آج حالات اور صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اب بالعموم محبت کو ایک فن سمجھا جاتا ہے اور خود معلمین اخلاق بھی اس کے لئے جواز مہیا کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اب وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شادی میں صرف فرض ہی وفاداری کے لئے مناسب باعث نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس لئے محبت کی بنیاد میں وسعت پیدا کرنے اور باہمی الفت کو پرکشش بنانے والے محرکات میں اضافہ کے لئے محبت کا فن میں تبدیل کیا جانا ضروری ہے۔ [illegible] ازدواجی دانش

کی بنیادیں گہری ہوں گی۔ اور یوں اخلاق کو استحکام نصیب ہو گا۔ گو ہمارا اخلاق سے بلاواسطہ تعلق نہیں لیکن ہم اس کے فوائد کو ضرور گن سکتے ہیں۔

اس فن کو تسلیم کرنے کا سلسلہ جدید تہذیب سے شروع ہوتا ہے۔ البیرو ۔ بیرے ۔ جسے سرجری میں عظیم پیش رو کی حیثیت حاصل ہے۔ اپنے پاس آنے والوں کو مجامعت سے پہلے کافی دیر تک محبت کا کھیل کھیلنے کی ہدایت کیا کرتا تھا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب شادی میں جنسی صحت مندی کے موضوع پر اپنے رسالہ میں فوربرنجر نے اس امر پر زور دیا تھا کہ ایک معالج کو اس قابل ضرور ہونا چاہیئے کہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے مریضوں کو ازدواجی اختلاط کی تکنیک سمجھا جا سکے۔ اور فرانس میں ۔ جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ فن الفت کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا ڈاکٹر جولیس گائے نے ۱۸۵۹ء میں جو کتاب تحریر کی اس میں فن الفت سے وابستہ تمام قابل ذکر امور کا بڑی چابکدستی سے محاکمہ کیا گیا تھا۔ کافی مدت بعد یعنی ۱۹۳۱ء میں اس کتاب کا جزوی ترجمہ اس عنوان کے تحت شائع کیا گیا: A RITUAL FOR MARRIED LOVERS.

اس مرحلہ پر عورتوں میں جنسی تحریک کی خصوصیات کا سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے خصوصیت سے اس جنسی سرد مزاجی کا جس کی شکایت عورتوں کی اکثریت میں ملتی ہے۔ ان خصوصیات کو تسلیم کر لینے سے ہی فن الفت کی اساس استوار ہوتی ہے اور اس سے یہ بنیادی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ تمام حیوانات میں جنسی ترغیب کو فن کی حیثیت حاصل ہے۔

اب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ جنسی سرد مہری گھر کے سکون کو غارت کرنے کا موجب بنتی ہے۔ بیوی تکلیف اٹھاتی ہے اور خاوند بیوی سے ناامید ہونے کے بعد اپنی آسودگی کے لئے کوئی اور دروازہ جا کھٹکھٹاتا ہے۔ ایسی صورتوں میں یا تو جنسی ملاپ کی خواہش خام ہوتی ہے اور یا پھر اس ملاپ سے حاصل ہونے والا حظ نامکمل ہوتا ہے۔ اور بالعموم یہ دونوں عناصر [illegible] ملتے ہیں۔ بہرحال ہر دو صورتوں میں محبت کے فن کی ضرورت ہوتی ہے۔

حیاتیاتی لحاظ سے جنسی کھیل میں مادہ مفعول ہوتی ہے۔ مہذب عورتوں میں نخوت اور سماجی قواعد کی بناء پر اس مفعولیت میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ویسے مرد کی جنسی کارکردگی اور عورت کی جنسی مفعولیت کا اثبات کیا جانا بھی ضروری ہے۔ یہ امر بنیادی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ یہاں ہم مرد اور عورت کے ان نفسیاتی خصائص سے جنہیں مدتوں بھلائے رکھا ۔ دوچار ہوتے ہیں۔ جو گہری اخلاقی بنیادوں پر استوار ہیں۔ بقول ڈوگلس برین دو جنسوں میں جنسی تضاد ایک دوسرے کے برعکس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتا ہے۔ اس لئے ہر دو جنسوں میں اس کے پیدا کردہ احساسات اور ردعمل جداگانہ ہوں گے۔

قابل اشتعال ذکر آگے دھکا دینے، کارکردگی اور چھا جانے کی تحریکیں پیدا کرتا ہے جبکہ قابل اشتعال مہبل قبولیت اور مفعولی سپردگی کی۔ بالفاظ دیگر اب ہمارے سامنے "مردانگی" اور "نسائیت" کی اساسی خصوصیات موجود ہیں۔ لیکن جیسے کہ ڈوگلس برین ہی نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس انتہائی صورت تک پہنچنے تک یعنی جنسی ترغیب کے ابتدائی درجہ میں مرد اور عورت کے کردار قدرے الٹ ہو جاتے ہیں۔ یعنی مرد ایک حد تک مفعول اور عورت ایک حد تک پہل کرنے والی [illegible] جنسی مراکز تعداد میں زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ بکھرے ملتے ہیں۔ اس لئے جنسی تحریک باآسانی پھیل جاتی ہے۔ اور اس کی آسودگی [illegible] لاشعوری حصوں میں ہوتی ہے۔

عورتوں کو قدیم روایت نے یہ سکھایا کہ جنسی تحریک کے مظاہر قابل مذمت ہیں۔ اس لئے گناہ سمجھتے ہوئے انہیں دبا دینا چاہیئے۔ اس لئے مرد کے مقابلہ میں عورتوں میں بالعموم جنسی تحریک تہ نشین ملتی ہے۔ [illegible] آسودگی اور خوف [illegible] شعور کے دو [illegible] حصوں سے ہوتا ہے یہ وہ [illegible] حقیقت تھی جسے [illegible] نے خوب سمجھا۔ عورتوں میں جنسی تحریک کی ان خصوصیات سے قطع نظر

عام اور فطری حالات میں زندگی بسر کرنے والی عورتوں میں جنسی سرد مہری کے جواز کے لئے معقول وجوہات کا تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ حتیٰ کہ مہذب علاقوں میں بسنے والے غریبوں (گھریلو ملازموں کی ایک خاص تعداد سے قطع نظر کرتے ہوئے، جو کافی حد تک غیر فطری حالات میں گھریلو جانوروں ایسی زندگی بسر کرتی ہے) میں بھی عام عقیدہ کے برعکس "بوڑھی کنواریاں" نہیں ملتیں جس کا یہ مطلب ہوا کہ ثابت کئے بغیر بھی اس امر پر زور دیا جا سکتا ہے کہ جنسی تحریک میں بذاتِ خود کوئی خامی نہیں ہوتی۔ لیکن فطرت، فن، روایات، مذہب، اور اخلاق کے ملے جلے اثرات کے تابع زندگی بسر کرنے والی مہذب عورت عموماً بلوغت کے کافی دیر بعد اپنے خاوند کے ہاتھ چڑھتی ہے۔ اس وقت تک وہ ازدواجی ہم آغوشی کے قابل نہیں رہ جاتی اور اگر دولہا میں مہارت اور التفات کا فقدان ہو تو عورت میں جنس کا تصور نفرت اور تکلیف سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ اگر اتنا نہ بھی ہو تو کم از کم وہ لاتعلق تو ضرور ہی ہو جاتی ہے۔

اس ضمن میں خود عورتوں کی بعض حرکتوں کی طرف بھی توجہ دینی چاہیئے۔ جلق اور ہم جنس پرستانہ تعلقات کی بنا پر اکثر عورتوں کے لئے نارمل اختلاط تکلیف دہ اور قابلِ نفرت بن جاتا ہے۔ دیکھ بھال نہ کرنے سے جنسی اعضا ٹھیک اور درست حالت میں نہ ہوں۔

بعض اوقات تشنج المہبل کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نسائی امراض کے کسی ماہر سے رجوع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا امکان ہے کہ طبی امداد سے جلد ہی نارمل جنسی احساسات پُرطمانیت طریقہ سے نشوونما پا لیتے ہیں اور وہ جنسی خط کے قابل ہو جاتی ہے۔

عورت میں جنسی بے حسی دور کرنے میں خاوند اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن عموماً وہ اس کردار کی ادائیگی کے لئے خود کو نا کافی محسوس کرتا ہے۔ بالزاک کے اس قول میں کافی صداقت ملتی ہے کہ بعض اوقات خاوند اور بیوی کی جدوجہد اور وائلن والی حالت ہوتی ہے۔ وائلن پر "بے حسی" طاری رہتی ہے لیکن یہ وائلن کا قصور نہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ خاوند جان بوجھ کر اپنی بیویوں سے بہیمانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ اکثر خاوندوں کا طرزِ عمل نادانی پر مبنی ہوتا ہے یا پھر اسے ایک ازدواجی فریضہ سمجھ لیا جاتا ہے عموماً خاوند میں مہارت کے فقدان کے ساتھ ساتھ التفات کی حقیقی خواہش بھی ملتی ہے۔ سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ خاوندوں کی اکثریت محض اپنی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں اور اخلاقی بلندی کے باعث جنسی کردار میں "بے ڈھنگے پن" کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شادی سے پہلے ہر لحاظ سے مجرد اور پاک صاف رہے۔ اس لئے انہوں نے عورتوں کی فطرت اور ان کے تقاضوں کو کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ یہ درست ہے کہ بہت سی پُرمسرت شادیاں ایسی شادیاں ہیں جن میں دونوں تمام عمر ایک دوسرے کے والہ و شیدا رہے۔

بعض اوقات ان نوجوان جوڑوں کے کیس جو جنسی لحاظ سے بالکل اناڑی اور ناتجربہ کار تھے ناتجربہ کاری کی یہ خصوصیت دو دھاری تلوار ہے۔ اور زیادہ تر یہ خود کو زک دیتی ہے اس لئے تمام عمر اخلاقی اصولوں کے تحت ایمانداری سے زندگی بسر کرنے والا مرد شادی کے بعد یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے اپنے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کی بھی ازدواجی مسرت تباہ کر دی ہے یہاں اس امر کا اور اضافہ کر دیا جائے کہ شادی سے قبل طوائفوں سے جنسی تعلقات استوار کرنے والا مرد بھی بہتر ثابت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ احمقانہ بھونڈے پن یا بیوی کی "پاکیزگی" کے مبالغہ آمیز احساس — ہر دو کی وجہ سے المناک نتائج ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ عموماً خاوند کا کام مشکل ہے یہ مشکل اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ موجودہ تہذیبی تقاضوں کی بنا پر عورت کئی سالوں کی دیر بعد شادی کرتی ہے۔ اور یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اس نے ناکتخدائی کے وقفہ میں باعصمت زندگی بسر کی ہو گی۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ ناکتخدائی کی طویل مدت میں جنسی توانائی کا اخراج ہوتا رہا تھا۔ اور لازماً اس توانائی کو کسی نہ کسی راستہ پر ڈالا گیا ہو گا۔ اس مقصد کے لئے عورت کچھ عادات و اطوار اپنا کر ایک لائحہ عمل مرتب کر لیتی ہے۔ اس کا تمام نظام بھی ایک مخصوص سانچہ کا عادی ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جسمانی لحاظ سے بھی جنسی اعضا اپنے فطری وظائف کی ادائیگی کے لئے بآسانی اور فوری طور سے تیار نہیں ہو سکتے۔

اولیں زوجگی کی مشکلات کا دیر سے مجامعت کے آغاز سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بالکل غلط مفروضہ ہے کہ مجامعت کے لئے عنفوان شباب ناموزوں عمر ہے اور ایک طرح سے پاکیزگی کی رسم کی خلاف ورزی ہے۔ اس کے برعکس تمام شواہد سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بالغ عورت کے مقابلہ میں نوجوان لڑکی مجامعت کے لئے کہیں زیادہ موزوں ہے۔ مجامعت میں یہ تاخیر فطرتی نہیں بلکہ تہذیبی اقدار کی مرہونِ منت ہے۔

یہ درست ہے کہ حیوانی ارتقا کے دوران میں فطرت نے ہی پختگی میں تاخیر کی لیکن یہ مقصد بلوغت کی تعویق سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس لئے تو بنی نوع انسان میں بلوغت دیر سے ہوتی ہے۔ تہذیبی تقاضوں کی بنا پر ہم جنسوں کے تعلقات کو مزید التوا میں ڈالنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے سے ہم اپنے لئے بعض ایسی مشکلات پیدا کر لیتے ہیں۔ جن کا مداوا صرف محبت کے فن ہی سے ہو سکتا ہے۔

یقینی طور سے یہ بالکل درست ہے کہ مرد کی جنسی زندگی کی تنظیم عورت کے جنسی تقاضوں کو سمجھے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کی اہمیت پر بھی پورا زور دیا جا سکتا ہے۔ کہ اگر جنس کی روشنی میں عورت کی نفسیاتی زندگی کا مطالعہ کرنا ہو تو ہمیں مرد کا بھی جائزہ لینا ہو گا۔ مرد کی جنسی زندگی سے عورت کی جنسی زندگی ایک حد تک متاثر ہوتی ہے۔

کئی وجوہات کی بنا پر اس حقیقت کا سمجھنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ گو اس سے قبل بھی ان کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن جنسی نفسیات میں فن الفت کی اہمیت کا جائزہ لینے میں ان کا اعادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس نظریہ کا جائزہ ضروری ہے۔ جس کی رو سے یہ سمجھا جاتا رہا کہ اس ضمن میں عورت غالب ہوتی ہے۔ جب کہ مرد اس کے ہاتھ میں محض ایک کھلونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ گو اس میں تھوڑی سی صداقت ملتی ہے۔ لیکن یہ بنیادی حقیقت نہیں ہے دیگر امور کے ساتھ ساتھ تمام سلسلہ حیوانات — ہم بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہیں —

اس امر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ جنسی معاملات میں نر فاعل اور مادہ مفعول ہوتی ہے جسمانی ساخت کے لحاظ سے بھی نر "دینے" والا مادہ "لینے" والی ہوتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کا نفسیاتی رشتہ جسمانی تعلق کے عکس کے علاوہ اور بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن بعض اوقات مختلف حالات میں فطرت کے اس عمومی اصول کی خلاف ورزی کئے بغیر اس سے روگردانی بھی مل جاتی ہے

نر مادہ کے لئے تعلقات کے فطری رشتہ سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر اپنے ماحول کا جائزہ لیا جائے تو ابتدائے تاریخ سے ہی جنسی معاملات میں مرد کی برتری اور حکومت تسلیم کرنے کی روایت چلی آ رہی ہے۔ عورت کا مقصد صرف بچے پیدا کرنا سمجھا جا رہا ہے اگر عورت کی جنسی زندگی کا مقصد یہی مقصد نہ بھی سمجھا جاتا ہو تو کم از کم تولید اہم ترین فریضہ ضرور متصور ہوتی ہے۔ اور عورت کی شہوانی کارکردگی کم و بیش ناجائز اور ضمنی قرار دی گئی۔ ہمارے تمام سماجی اداروں کی بنا مردانہ برتری کے عمومی طور سے تسلیم کردہ مفروضہ پر استوار ہے۔ شادی خاوند کے لئے کنبہ کی قانونی سربراہی اور بیوی کے لئے قانونی غیر ذمہ داری کا نام ہے۔

شادی کے حلقہ سے باہر طوائفیں صرف مردانہ احتیاجات کی تسکین کے لئے تھیں عورتوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اب ان دونوں کے بارے میں قانون اور سماجی اقدار میں تغیرات آ رہے ہیں۔ لیکن قدیم ادارے اور ان سے وابستہ احساسات اور نظریات ختم ہوتے ہوتے کافی وقت لے لیں گے۔ اس عبوری دور میں ہم ماضی سے بہت زیادہ متاثر (قبول)

کر لیتے ہیں۔

مندرجہ بالا امور سے ۔ نسائی نفسیات سے متعلق ۔ ایک اہم حقیقت آشکار ہوتی ہے ۔ یہ ہے ۔ شرم : یہ شرم دو طرح کی ہے۔ فطری شرم جو عورت کے ساتھ ساتھ نچلی سطح کے کم و بیش تمام حیوانات میں ملتی ہے۔ اور مصنوعی شرم جو سماجی ضوابط کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اور اس لئے اس کے انداز میں بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مصنوعی شرم خالص نسائی خصوصیت ہے۔ مصنوعی شرم کی خصوصیات بیان کرنے اور اسے ثابت کرنے کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ لیکن اسے تسلیم کرنے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا اس کا سب سے بڑا باعث بھی عورت کا مفعولی جنسی کردار ہے اور اسے سماجی روایات سے تقویت ملتی ہے۔ (اس شرم کی تغیر پذیری کا اندازہ عریاں انجمنوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔ جن کے مرد اور عورت اراکین اور ایک دوسرے کو کسی شرم اور جھجک کے بغیر عریاں حالت میں ملتے ہیں) ہماری روایات کی تغیر پذیری نے ابھی تک شرم پر اپنے اثرات واضح نہیں کئے۔ بلکہ ان کے باعث اب عورت کے آشکارہ اور خفتہ شعوری عناصر میں ایک خاص طرح کی عدم آہنگی پیدا ہو رہی ہے۔ عورت در پردہ جو محسوس کرتی ہے جسکی اسے تمنا ہوتی ہے۔ اب اسے ان کے بارے میں حصول معلومات کی تو مکمل آزادی ہے۔ لیکن وہ ان احساسات اور خواہشات کے اظہار کے لئے آزاد نہیں۔ نتیجہ میں ہمارے معاشرہ میں ایسی عورتوں کی کمی نہیں جو اپنی طلب جاننے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتی ہیں کہ بے باک اظہار۔ جاننے کے حقدار مردوں میں ۔ نفرت یا حقارت کا موجب نہ بھی بنے تو بھی وہ غلط فہمی کا باعث ضرور ہی بن جائے گا۔ اس لئے گھوم پھر کر ہم پھر مردوں تک آ پہنچے ہیں۔

نسائی جنس کے اس جائزہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ عورت کی جنس کے بارے میں مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات ملتے ہیں۔ ہماری تہذیب کے قدیم ترین نظریہ کی رو سے عورت کی جنسی زندگی کا مرکزی نقطہ مادریت ہے۔

اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن مادریت کے دائرہ سے باہر عورت کی جنس زندگی مفقود تصور کی جاتی تھی ۔ یعنی وہ مرد کا حق تھی ۔ کیوں کہ عورت کی ہر جنسی تحریک ۔ (اگر اسے مانا بھی گیا) کا مرکز مادریت تھی۔ اس لئے وہ فطرتاً ہی یک شو تھی ۔ لیکن مرد کیوں کہ گھر اور بچے سے آزاد ہوتا تھا۔ اس کی نفسی زندگی میں مختلف النوع کیفیات ملتی تھیں۔ اسلئے وہ فطرتاً کثرت ازدواج کے لئے بنایا گیا تھا۔

اس نقطۂ نظر کی رو سے مرد کے مقابلہ میں عورت کے جنسی مسائل سیدھے سادے اور واضح قسم کے ٹھہرتے تھے جبکہ مرد کے نسبتاً زیادہ پیچیدہ! یہ ہے وہ نظریہ جو قدیم کلاسیکی زمانہ سے لیکر کم و بیش موجودہ زمانہ تک کارفرما چلا آ رہا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ حقائق اس نظریہ سے ہم آہنگ دلیں۔ تقریباً ایک صدی پیشتر انگریز سرجن ایکٹن نے کی تحریر کردہ کتاب انیسویں صدی کے اختتام تک جنسی مسائل پر ایک مستند تصنیف تسلیم کی جاتی تھی۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ عورت سے جنسی احساسات کی منسوبی "شرمناک تہمت" کے مترادف ہے اس عہد کی ایک اور مستند طبی کتاب کی رو سے صرف "نفس پرست عورتیں" ہی اپنے خاوندوں سے ہم آغوشی کے وقت جسمانی لذت کا اظہار کرتی ہیں۔ ان احمقانہ بیانات کو اس زمانہ میں صحیح سمجھا جاتا تھا۔

آج ایک اور معیار ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ اس معیار کی تشکیل میں دو جنسوں میں مساوات کے بڑھتے ہوئے احساس کے ساتھ ساتھ فطری امور بھی کارفرما ملتے ہیں۔ اگر اس جائزہ سے خارج امور کا بھی جائزہ لیا جائے تو اب گذشتہ دور کی مانند دونوں جنسوں میں امتیاز کے لئے واضح قسم کی حد بندی نہیں کی جاتی۔ دونوں میں اب بھی امتیازات تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اور ان کی تعداد بھی تھوڑی نہیں لیکن یہ سبھی اساسی نوعیت کے ہیں۔

اب انسانوں کو دو انواع میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ بلکہ انسانی فطرت کو ایک تسلیم کرتے ہوئے دونوں میں مختلف النوع رجحانات پر زور دیا جاتا ہے۔ دونوں جنسوں میں ان رجحانات میں مخصوص نوعیت کی ترامیم ہو سکتی ہیں۔ لیکن بہر صورت دونوں میں انسانی خصائص برقرار رہتے ہیں۔

اس سے قبل بھی ہم اس انداز نظر کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ جس کی رو سے کثرت ازدواج لازم سمجھی جاتی تھی۔ اس پر مدتوں زور دیا جاتا رہا۔ اور گذشتہ صفحات میں ہم نے صحیح اور غلط ہونے پر خاص بحث کی تھی۔ فطرت کا یہ بنیادی اصول ہے۔ کہ جنسی فعل کے نتائج مرد کے مقابلہ میں عورت کے لیے کہیں زیادہ اہم اور دور رس ثابت ہوتے ہیں۔ اور اس لئے وہ جبلی طور سے رفیق حیات کے انتخاب میں احتیاط کرتی ہے۔ دونوں میں ہمیشہ سے ہی یہ فرق نمایاں رہا ہے لیکن اس کے باوجود ایسی عورتوں کی کمی نہیں جن کے لئے مادریت کوئی مسئلہ نہیں، جو مردوں کی مانند باآسانی جنسی تعلقات استوار کر سکتی ہے۔ بھنورہ صفت مردوں کی مانند عورتیں بھی تنوع پسندی کی خاطر پھول پھول گھومنے والی تتلیاں بن سکتی ہیں۔ اسی طرح وہ بیک وقت دو مردوں سے محبت کر سکتی ہیں۔ اس معاملہ میں اگر وہ مردوں سے بڑھ نہیں سکتی تو کم از کم کسی لحاظ سے ان سے پیچھے بھی نہیں رہتی۔

جنس یا دیگر معاملات میں "مرد" اور "عورت" کے درمیان واضح قسم کی خانہ بندی کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ویسے ابھی تک مرد عورت کی جداگانہ تقسیم کا رواج بالکل ختم نہیں ہوا۔ اپنے بھائیوں کی مانند عورتوں کے بھی باپ ہوتے ہیں۔ اور مردانہ اور نسائی امتیازات خواہ کتنے ہی معمولی کیوں نہ ہوں انہیں بھی ورثہ میں مردوں ایسی انسانی فطرت ملتی ہے۔

مرد اور عورت کے درمیان یہ نوعی تقسیم اس بنا پر ہے کہ تمدن کے ارتقا میں آنیوالے دو مدارج سے وابستہ خیالات اور تصورات ابھی تک موجود ہیں۔ آج کے عبوری دور میں جو تصوراتی کشمکش ملتی ہے۔ وہ اسی بنا پر ہے۔

اس لئے ہمارے لئے اعداد و شمار پر مبنی عورتوں کی جنس کے وسیع پیمانے پر لئے گئے جائزوں کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ خواہ ایسی عورتیں نارمل ہوں یا مردوں کے مقابلہ میں خاص شعبہ سے تعلق رکھتی ہوں۔ خوشنما الفاظ کے پردوں میں چھپے عمومی بیانات اور تحلیل نفسی یا دیگر مضامین کے ماہرین کی نظریاتی بحثیں ہمارے لئے اس لئے بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ کہ ایسے جائزے لینے والوں کا ایک تو تجربہ محدود ہوتا ہے۔ اور دوسرے وہ اپنے تعصبات سے ان جائزوں کو مبرا نہیں رکھ سکتے۔

ان دونوں مخصوص نوعیت کے مواد پر مشتمل جائزے مکمل کئے جا رہے ہیں۔ اور تربیت یافتہ افراد کی کار آمد اعدادی تحقیقات سے استفادہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں کیتھرائن بی۔ ڈیوس، آر۔ ایل ڈکنسن اور جی وی ہملٹن نمایاں ہیں۔

کیا عورتوں کی نمایاں مفعولیت اساسی نفسی احساسات یا احتیاجات کی عمومی تبدیلی کی وجہ سے ہوتی ہے! اس چھان پھٹک کے لئے ہملٹن، ڈیوس اور ڈکنسن کی تحقیقات سے متخرج جو نتائج ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عورتوں میں جنسی تحریک اپنے اظہار کے لئے خود شہوانیت کا سہارا لیتی ہے۔ جب کوئی جنس بھی خود شہوانیت کا سہارا لے تو اس تحریک کو کلی طور سے ناقابل مزاحمت تسلیم کئے بغیر بھی جنسی خواہش کو بیداری ملنے کا جواز موجود ہے۔ ان محققین کے پیش کردہ اعداد و شمار اور نتائج میں یکسانیت نہیں ملتی اور اس کی توقع بھی نہ رکھنی چاہیئے کیوں کہ ان جائزوں والے افراد کے لئے ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہ تھا اس لئے بعض اوقات وہ کسی سوال کا جواب گول کر جاتے تھے۔ اور عورتوں کے ایسے کرنے کا زیادہ امکان ہے۔ اس صورت میں اکثریت کا خود شہوانیت کو تسلیم کر لینا خالی از اہمیت نہیں۔ ڈکنسن کے

جائزہ کی رو سے مختلف طبقات سے متعلق درمیانہ درجہ کی عورتوں میں سے ۷۰ فی صد نے جنسی تحریک کی قوت اور شدت تسلیم کی۔

اس کے تناؤ سے نجات پانے کے لئے ان کا بار بار تنہائی میں آسودگی کی کوشش کرنا بالکل واضح قسم کا ہو جاتا ہے۔ کیتھرائن ڈیوس نے جب کالج کی ایک ہزار غیر شادی شدہ طالبات کا جائزہ لیا تو سوالات کے جواب دینے والی طالبات میں سے ۶۵ فی صد نے جلق لگانے کا اعتراف کیا۔

تقریباً نصف تعداد نے یہ بھی مان لیا کہ وہ ابھی تک جلق کی عادی ہیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ جلق لگانے والی لڑکیوں میں سے اکثریت کی صحت "قابلِ رشک" اور "بہترین" تھی۔ جب کہ اسے ترک کر دینے یا کبھی نہ کرنے والی لڑکیوں کی صحت بالعموم خراب ملی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھی صحت اور قوی جنسی تحریک میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ہملٹن نے جب ذہنی اور سماجی مرتبہ کے لحاظ سے عام معیار سے بلند شادی شدہ افراد کا جائزہ لیا۔ تو ان میں سے صرف ۲۶ فی صد نے پورے وثوق سے یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے کبھی بھی جلق نہ لگائی تھی۔ اس نے عورتوں کے اس رجحان کا بھی تذکرہ کیا۔ (میں خود بھی ایک مدت سے اس سے واقف تھا) کہ ـ بچپن کے بعد ـ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں تاخیر سے جلق کا آغاز کرتی ہیں۔

پچیس سال کی عمر کے بعد ایک فی صد مرد کے مقابلہ میں چھ فی صد عورتیں جلق شروع کرتی ہیں۔ اس تقابلی مطالعہ سے کئی دلچسپ نکات واضح ہوتے ہیں۔ عام عقیدہ کے برعکس بالعموم جلق دوسروں سے نہیں سیکھی جاتی۔ کیوں کہ دونوں جنسوں میں ایسے افراد کی اکثریت ہے جنہوں نے خود بخود ہی اسے "دریافت" کیا۔

یہ امر بھی غور طلب ہے ۷ فی صد مردوں اور ۲۴ فی صد عورتوں نے شادی کے بعد جلق نہ لگانے کا بتایا اسی طرح شادی کے بعد "بار بار" جلق لگانے والی عورتوں کی تعداد بھی مردوں سے مساوی نکلی۔ ان میں سے نصف تعداد ایسی خواتین پر مشتمل ہے۔ جنہوں نے شادی کے بعد صرف اسی پر انحصار کیا۔ اس کے برعکس مردوں میں یہ اتنے تواتر سے نہیں ملتی۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مردوں میں شادی کے بعد جلق کا باعث گھر سے دوری یا کوئی اور خارجی وجہ ہوتی ہے جب کہ شادی شدہ عورت کا جلق ازدواجی جنس سے عدم تسکین کا غماز ہوتا ہے۔ یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ عورتوں کے مقابلہ میں ایسے مردوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جو جلق کو ذہنی و جسمانی ضعف رسانی کا موجب قرار دیتے ہیں۔

ان تینوں جائزہ نگاروں میں سے ہملٹن اس لحاظ سے زیادہ اہم ہے کہ اس نے ازدواجی زندگی میں خاوند اور بیوی کی آسودگی کے مسئلہ کا بلاواسطہ مطالعہ کیا تھا۔ اس کے جائزہ میں خاوندوں اور بیویوں کی تعداد ہی یکساں نہ تھی بلکہ ان دونوں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں دونوں کے معاملہ میں طریق کار کی نوعیت بھی ایک ہی تھی۔ اس نے ازدواجی آسودگی کے ۱۴ مدارج قائم کئے۔ جب نتائج مرتب کئے گئے تو معلوم ہوا کہ ۴۵ فی صد بیویوں کے مقابلہ میں ۵۱ فی صد خاوندوں کے لئے آسودگی کا انتہائی درجہ [illegible] تھا۔

مجموعی لحاظ سے مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی اکثریت نے اپنی شادی سے [illegible] اور ناامیدی کا اظہار کیا تھا۔

کیتھرائن ڈیوس نے بھی ـ بالواسطہ [illegible] ـ اس کی توثیق کی ہے اس کے جائزہ کے مطابق عورتوں کی اکثریت نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے مقابلہ میں ان کے خاوند اپنی ازدواجی زندگی سے زیادہ آسودگی کا اظہار کرتے ہیں۔

امریکنوں اور انگریزوں کی ازدواجی زندگی کے بارے میں میں اپنے ذاتی مشاہدات سے بھی ـ گو وہ اتنے قابلِ وثوق نہیں ـ اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ اس لحاظ سے مردوں اور عورتوں میں بہت زیادہ فرق نہ بھی ہو۔ لیکن پھر بھی وہ نمایاں ضرور ہے۔

اب یہ پورے طور سے واضح ہوتا جا رہا ہے کہ عورتوں کی کوئی مخصوص جنسی نفسیات نہیں۔ راہبوں اور تارک الدنیا لوگوں کے پھیلائے ہوئے عقیدوں نے باطل ثابت ہوتے ہوتے کافی سے زیادہ وقت لے لیا۔ یہ درست ہے کہ دونوں میں فرق ہے اور یہ لازمی ہے جب تک مرد اور عورت میں جسمانی یکسانیت نہیں پیدا ہوتی۔ ان میں روحانی یکسانیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن یہ نفسیاتی اختلافات چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔

اب ہم یہ حقیقت جان چکے ہیں کہ بلحاظ جنس مرد اور عورت کا ایک ہی مٹی سے خمیر اٹھایا گیا ہے۔ رہا قدما کا یہ خیال کہ اس سے عورت کی "تذلیل" ہوتی ہے۔ ہمارے لئے تو یہ سب کچھ محض ملمع سازی ہے۔

روایتی لاعلمی اور کہنہ تعصبات کی بنا پر جنسی حالات سے مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ تکلیف برداشت کرتی ہیں۔ شادی سے آسودگی اور بے اطمینانی نے عمومی اظہار سے قطع نظر ـ جس سے ازدواجی تعلقات سے عورتیں نسبتاً کم آسودہ ظاہر ہوتی ہیں ـ

نسوانی امراض کے ماہرین کے جمع کردہ شواہد بھی یہی ظاہر کرتے ہیں۔ حالانکہ قدیم زمانہ میں یہ کہا جاتا تھا کہ مرد نے "رحیم کریم" ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے عورتوں کی بہبود کے لئے شادی وضع کی تھی۔ ڈکنسن نے تکلیف دہ جنسی اختلاط کی ۵۰۰ مثالیں پیش کی ہیں۔ ان سب میں عورتیں جنس کے جسمانی تعلقات کے نتیجہ میں کم و بیش درد دیا۔ بے آرامی محسوس کرتی تھی ۲۰۰ مثالیں ایسی عورتوں کی تھیں۔ جو جنسی تعلقات کے لئے کچھ نہ کچھ سرد مہر اور جنسی لحاظ سے سرد مزاج تھیں۔

گویا ان کی حالت بھی تکلیف دہ جنسی اختلاط والیوں سے بہتر نہ تھی۔ جب کہ تقریباً سبھی شوہر ایسے عوارض سے ناآشنا تھے۔ (وہاں ان میں نامردی ملتی تھی لیکن وہ تو منفی ضرور ہے) گویا یہاں بھی عورتیں گھاٹے میں رہتی ہیں۔

عورتیں جو گھاٹے میں رہتی ہیں تو اس میں فطرت اور حالات کا کردار کتنا کتنا ہے؟ یہ جاننا اس لئے ضروری ہے کہ کسی حد تک خارجی حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

دراصل اس معاملہ میں فطرت اور حالات دونوں ہی کا دخل ملتا ہے۔ بالفاظِ دیگر نارمل حالات میں مرد کے مقابلہ میں عورت کے لئے جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے جنسی تعلقات سے مطابقت پیدا کر لینا نسبتاً مشکل ہے۔ یہ فطری دشواری ہے۔ لیکن فطری طور پر ہی اسے دور بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ فطرت کی پیدا کردہ یہ جزوی دشواری جس شدت سے آج محسوس کی جا رہی ہے جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔ تمام انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

ڈاکٹر ڈیوس سے ایک عورت نے یہ سوال کیا؟ "آخر خاوندوں کو مزید کیوں نہیں سکھایا جاتا" اس عورت کے لئے جنسی تعلقات تکلیف اور اذیت کے مترادف تھے۔

شادی کے اولیں ردعمل پر دیئے گئے سوال کے جوابات سے جنسی تعلقات کی تکلیف دہ نوعیت کا ایک حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ "پُر تعفن" ـ "حیران" ـ "پریشان" ـ "ناامید" ـ "خوف زدہ" ـ "حقارت" "صابر و شاکر" ـ "صدمہ" ـ "ہوش اڑ گئے" ـ جب کہ ۳۱ نے صرف اسے امر واقع سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیا۔

یہ بالکل واضح ہے کہ ایسے جوابات دینے والی عورتوں کی اکثریت نے جنسی امور سے لاعلمی کی صورت میں شادی کی تھی۔ گویا ہم گھوم پھر کر جہاں سے چلے تھے وہیں آ پہنچے۔

پہلے زمانہ میں سطحی حالات سے قطع نظر ـ میاں بیوی میں ایک خاص طرح کی جنسی مطابقت

ملتی تھی عورتوں کو اپنے مخصوص حالات اور اس دور کے خیالات کے مطابق ازدواجی زندگی کے لئے تیار کر دیا جاتا تھا۔ اور انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ شادی سے کیا توقعات وابستہ کرنی چاہئیں۔ لیکن حالیہ زمانہ میں ــ اگر موجودہ زمانہ نہ سہی ــ ان کی اچھی بری جو بھی تربیت ہوتی ہے اس کی وجہ سے وہ اپنی شادی سے جو توقعات وابستہ کرلیتی ہیں۔ وہ شرمندہ تکمیل نہیں ہوتی۔ بالفاظ دیگر ــ جنسی کارکردگی کو بلاواسطہ متاثر کئے بغیر۔ عورت کے درجہ اور نسائی کارکردگی کے دیگر شعبوں میں ایک غیر محسوس کن انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ جس کے اثرات بالواسطہ طور سے عورت کی جنسی تحریک پر بھی اثر انداز ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس مرد سماجی مقام یا کارکردگی کے ضمن میں کسی انقلاب سے دوچار نہیں ہو رہے جس کا لازمی نتیجہ جنسی عدم مطابقت کی صورت میں رونما ہو رہا ہے۔ کیونکہ نسائی انقلاب اور اس کے اثرات ختم نہیں کئے جاسکتے۔ نہ ہی اس کی خواہش کی جاسکتی ہے۔ اس لئے موجودہ جنسی صورت حال کو صرف مرد ہی ٹھیک کرسکتے ہیں۔ جدید عورت کے لئے کسی جدید خاوند ہی کی ضرورت ہے۔

میں ایک سے زاید مواقع پر یہ کہہ چکا ہوں کہ تمام زندگی فن ہے۔ فن کو جمالیاتی احساس کے معنوں میں لینے والے احباب نے اس خیال کو جھٹلایا ہے بنانے اور کرنے کا سارا سلسلہ آخر فن ہی تو ہے۔ اور یہ فن صرف انسانی کارگزاریوں تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام فطرت کی تہ میں بھی یہی کارفرما ملتا ہے۔ زندگی کو فن قرار دینا ایک مسلمہ صداقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اسے تسلیم کرنے والے بھی عموماً اس کی تکذیب کر دیتے ہیں۔ ورنہ لاتعلقی پر مبنی چشم پوشی سے تو ضرور ہی کام لیتے ہیں۔ لیکن حقیقت ہی یہی ہے اس لئے ہم تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ کہ اگر واقعی زندگی فن ہے تو پھر یہ ناقص فن ہے۔

دیگر امور زیست کے مقابلہ میں محبت کے ضمن میں اس طرح کے بیان کو ثابت کرنا بہت زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ فطرت میں مادہ کے مقابلہ میں فن کی تحریک کا نسبتاً زیادہ قوی مظاہرہ کرتا ہے۔ حیوانات اور بالخصوص پرندوں کی ــ مختلف النوع کے مشاہدہ سے اس امر کی توثیق بھی ہو ... جاتی ہے۔

لیکن ہملٹن ڈیوس اور ڈکنسن کی تحقیقات پر مبنی نتائج کے مطالعہ کے بعد۔ محبت کے ضمن میں جدید دور کے مردوں کے بارے میں ایسی عمومی بات قطعی نہیں کہی جاسکتی۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے محبت تو جنسی تعلقات کا نفسی پہلو ہے یوں وہ خود زندگی قرار دی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر شمع حیات گل ہو جائے گی۔ آج ان تمام وجوہات اور بواعث کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ جن کی بدولت محبت کے فن کو اوباشی قرار دیتے ہوئے اسی سے اظہار، نفرت کے طور پر لاتعلقی کا اظہار کیا جاتا تھا۔

یہ وجوہات مذہبی، اخلاقی اور جمالیاتی نوعیت کی تھیں۔ آج ہم بآسانی یہ جان سکتے ہیں کہ ان وجوہات کی بنیاد محض ریت پر استوار تھی۔ اپنے فن کی نشو و نما اور ارتقا کے لئے یہ انداز نظر ضروری ہے ویسے ایسے فن کے اثرات گہرائی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

اب یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات اس سلسلہ میں صحیح معلومات کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ بعض لوگوں نے جنسی مسائل ختم کرنے کے لئے تمام جنسی کارکردگی کو محض ــ ایک معمول کی حیثیت دے دی۔ یا ایسا اندھی جبلت کی بنا پر نہیں بلکہ سوچے سمجھے اصول کے مطابق کیا گیا چنانچہ ان لوگوں کے لئے جنسی کارکردگی بھی کھانے پینے کے درجہ پر آگئی۔ جس کے لئے کسی گہری سوچ بچار کی ضرورت نہ ہو۔ یا پھر رقص اور ٹینس کی طرح۔ محض تفننِ طبع کا ایک ذریعہ اس انداز پر زندگی اور محبت کے جدید نقشوں کے سب سے بڑے نکتہ چین الڈوس ہکسلے نے رابرٹ برنز کی ہم نوائی میں یوں لکھا ہے:۔

"سرد غیر جذباتی لطف اندوزی سے بڑھ کر اور کچھ بھی خوفناک نہیں ہوسکتا۔ لاپروا ہی سے محبت بھی بالآخر سوداء غیر جذباتی ہو جاتی ہے۔"

علاوہ ازیں اگر محبت کا یوں درجہ گرایا جائے تو مرد عورت میں جنسی مطابقت کے مسئلہ کی تو پھر ضرورت ہی نہیں رہتی جب ہم نے اس زمانہ میں جذبات اور رومان کے امداد سے یا ان کے بغیر ہی جنسی فعل کو ایک فریضہ قرار دے لیا تو ہم فطرت سے دور ہو گئے لیکن اسے: ایک بندھا ٹکا معمول بنا لینے یا تفنن طبع کا ایک ذریعہ قرار دے دینے کی صورت میں فطرت سے دور ہی رہتے ہیں۔

متمدن افراد ہی میں نہیں بلکہ ذوات الثدی سے بڑھ کر اگر فطرت کے عضویاتی حقائق کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جنسی فعل بالعموم مزاحمت کا باعث بنتا ہے۔ جس پر فنی کارانہ مہارت اور گرم جوشی سے قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس لازمی امر کی فراموشی سے کسی نہ کسی لحاظ سے ضرور ــ تکلیف ہوتی ہے۔

اب فن الفت کی معالجاتی اہمیت پر زور دیا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کی اہمیت پر زور دینا ہی ناممکن نہ ہوتا۔ بلکہ سرے سے لوگوں کے پلے یہ بات ہی نہ پڑتی۔ محبت کا فن، در خور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے حقارت سے مسترد کر دیا جاتا تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ بیوی کی شہوانی احتیاجات کا کسی کو احساس ہی نہ تھا۔ جب کہ عدم آسودگی کی صورت میں خاوند خاموشی سے گھر سے باہر وسیلۂ تسکین تلاش کرسکتا تھا۔ لیکن اب دونوں صورتوں کے بارے میں طرزِ عمل میں تبدیلی آچکی ہے۔

اب مردوں کی مانند عورتوں کے شہوانی حقوق تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس یک زوجگی کی تمنا کی جا رہی ہے۔ جو موجودہ دور کی نام نہاد یک زوجگی کے برعکس اعلیٰ اور ارفع قسم کی ہو۔

گویا محبت کے فن کی ترویج یک زوجگی کی ترویج کے مترادف ہے۔ آج شادی سے جو مفہوم وابستہ ہے اس کی تکمیل فن الفت کے بغیر ایک حد تک مشکل ہے۔ بلکہ فن الفت کے ساتھ بھی شادی میں کافی مشکلات ملتی ہیں۔

اپنی اعلیٰ اور گمبھیر صورت میں فن الفت کسی مرد یا عورت کی شخصیت کی گہرائیوں سے جنم لینے والے احساسات کا اظہار ہے اپنی زیریں سطح کی صورت میں اس کے ڈانڈے جنسی صحت سے جا ملتے ہیں۔ اور یوں یہ معالج کے حلقہ اثر میں آجاتا ہے۔ تاکہ ازدواجی زندگی کی مختلف الجھنوں کے بارے میں وہ مشورہ دے سکے۔

جنسی صحت کا پرچار کرنے والے حضرات نے ابھی تک یہ حقیقت فراموش کر رکھی ہے لیکن ایسے طرزِ عمل کا مستقلاً اپنائے رکھنا بہت مشکل ہے اور اب یہ رجحان تیزی سے ختم ہوتا جا رہا ہے اب اس بات پر زور دینا ممکن نہیں رہا کہ فطرت خود ہی اختلاط اور جنسی ترغیب کے رموز سکھا دیتی ہے۔ بقول ہیبیٹ متمدن علاقوں میں ان باتوں کا سکھایا جانا بہت ضروری ہے۔ اس نے یہ بات کافی سال پہلے کہی تھی۔ اور اس پر مزید اضافہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے۔ کہ متمدن ہی نہیں بلکہ وحشی اور غیر متمدن نسلوں کے لئے بھی جنسی تعلیم ایک باقاعدہ رسم کی صورت میں ملتی ہے۔

علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی فراموش کر دی جاتی ہے کہ فطری حالات کے تحت زندگی بسر کرنے والے لوگوں میں بالعموم اختلاطی مبادیات پر زور دیا جاتا ہے اور اختلاط کی تکنیک میں کافی سے زیادہ تنوع ملتا ہے۔ یہ دونوں نکات بے حد اہم ہیں۔

جسمانی لحاظ سے اختلاط کی تیاری کے لئے پیار محبت کو طول دینا بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ نفسی لحاظ سے یہ اس لئے اہم ہے کہ اس کے بغیر محبت کا عنصر ثانوی ہوتے ہوئے

مکمل نشوونما نہیں پا سکتا۔ حالانکہ شادی کی کامیابی اور تکمیل کے لئے یہ بے حد ضروری ہے۔

اب یہ حقیقت بھی تسلیم کر لینی چاہیئے کہ اختلاط کے مختلف طریقے "شیطانی گمرہیاں" نہیں بلکہ یہ بالکل فطری اور انسان کی تنوع پسندی کے غماز ہیں۔ ایسا کئی مرتبہ ہوا کہ جب ایک طریقہ آسودگی بخش نہ ثابت ہوا تو کوئی اور طریقہ نسبتاً زیادہ بہتر رہتا ہے۔

بعض اوقات تو ان حالات اور طریقوں کی تلاش میں کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ جن سے کسی عورت کے لئے مجامعت پسندیدہ یا صرف گوارہ ہی ہو سکتی ہے۔ عورتوں کی اکثریت میں جنسی سرد مہری کو اختلاط سے پہلے کے پیار محبت اور موزوں طریقے سے بآسانی ختم کیا جا سکتا ہے۔

ہماری بڑھتی ہوئی تعلیم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ایک معالج ان امور سے چشم پوشی کر کے عقل مندی کا ثبوت نہیں دیتا۔ عورت کی جنسی آسودگی کو بار آوری کے فعل کا ایک عنصر سمجھنا چاہیئے۔ جنسی فعل میں وہ نری مفعول ہی نہیں رہتی۔

گذشتہ صدی میں نسائی امراض کے ایک ممتاز ماہر میتھیوز ڈنکن نے عورت میں یقینی بار آوری کے لئے جنسی لذت پر بہت زور دیا تھا۔ جب ہم جنسی لذت پر بہت زور دیا تھا بعد کے دیگر ماہرین کے ساتھ ساتھ کینش نے بھی اس نظریہ کی توثیق کر دی ہے۔ جب ہم جنسی لذت کے بغیر پیدا ہونے والے لاتعداد بچوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا لیکن کینش نے اپنی تحقیقات کی بناء پر یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کہ تکلیف دہ جماع (اس سے اس کی مراد اختلاط میں عدم تسکین تھی) کا بانجھ پن سے کافی گہرا تعلق ہے۔ بانجھ عورتوں میں سے ۳۸ فی صد کے لئے جماع تکلیف دہ تھا۔ البتہ اس نے جماع کا تواتر نہیں بتایا۔

فن الفت کے ضمن میں بنیادی حقیقت — جس کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا — یہ ہے کہ ہر جنسی اختلاط سے پہلے پیار محبت کا کھیل فطری ہی نہیں بلکہ ناگزیر بھی ہے۔ عموماً اس سلسلہ کا آغاز مرد کرتا ہے جب وہ یہ سمجھے (اور اسے یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ عورت اپنے منہ سے کچھ کہے گی) کہ اب صحیح وقت آ گیا ہے تو وہ زیادہ سرگرمی کا اظہار کرتا ہے۔ اگر عورت نسبتاً زیادہ گرم جوشی کا اظہار کرے تو اسے غیر فطری نہ سمجھنا چاہیئے۔ اگر عورت نری مفعول ہی رہے تو محبت کافی کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔

اختلاط سے قبل کا پیار محبت عورت میں جو حظ اور اشتلذاذی رجحانات پیدا کرتا ہے ان کے باعث اس کے تناسلی اعضاء غدودی افرازات میں بھیگ کر اختلاط کو پر مسرت بلکہ سہل بھی بنا دیتے ہیں۔ اس فطری چکنائی کی عدم موجودگی میں اس کے مصنوعی نعم البدل کی تلاش کی جاتی ہے۔ حالانکہ ایسا نہ ہونا چاہیئے۔

یہ تمام امور متمدن علاقوں میں عموماً فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔ جب کہ "پسماندہ" اقوام کے افراد ان کی اہمیت سے اچھی طرح سے واقف ہیں۔ مثلاً برٹش نیوگنی کے میلنسی قبیلہ کے افراد کو شریک حیات کے انتخاب میں کافی سے زیادہ آزادی تھی۔ (البتہ ٹوٹم اور خونی رشتہ کے تقدس کا ملحوظ رکھنا لازمی شرط تھی) مناکحت سے قبل کئی ماہ کے بے تکلفانہ تعلقات ضروری سمجھے جاتے تھے۔

بعض اضلاع میں تو یہ دستور بھی تھا کہ لڑکا لڑکی کی ساتھ شب باش بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اسے اپنے بازوؤں میں لے کر جسم کے بالائی حصہ کا مساس کر سکتا تھا۔ یہ شب باشی بالعموم جنسی کھلتی پر منتج نہ ہوتی تھی لیکن ایسا ہونے کی صورت میں فوراً ہی شادی رچالی جاتی ایسے طریق میں محبت کے فن کی تمام مبادیات آ جاتی ہیں۔

اختلاط سے قبل کے پیار و محبت میں بظر کو چھیڑنا، دبانا اور مسلنا فطری ہی نہیں بلکہ مرغوب خاطر بھی ہے۔ عورت میں جنسی حس کا سب سے بڑا مرکز بظر ہی ہے۔

بعض اوقات تحلیل نفسی کے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ بظر صرف کم عمری میں جنسی لذت کا باعث ہوتا ہے اور عنفوان شباب کے بعد عموماً ۔ مستقلاً نہ ہی سہی — جنس حس بظر سے مہبل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ اس نظریہ نے کیسے فروغ پا لیا شاید یہ صرف کتابی علم کی بنا پر ہو۔ لیکن عورتوں کے بارے میں بلاواسطہ قسم کی معمولی سی معلومات بھی اسے غلط ثابت کر سکتی تھی۔ بظر فطرتاً ہی جنسی حس کا مرکز ہے۔ اگر ہم اسے واحد مرکز نہ بھی مانیں تو کم از کم اہم ترین مرکز تو ضرور ہی قرار پاتا ہے۔ اس کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔

بلوغت کے بعد جب عورت سے اختلاط کیا جائے تو مہبل کا بھی جنسی حس کے مرکز کی صورت اختیار کر لینا عین فطری ہے لیکن اسے "منتقل" کا نام دینا قطعی غلط ہے۔ نسائی امراض میں ڈکنسن ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے اس قول میں صداقت ہے کہ "عورت کی اکثریت صرف بظر دبانے سے شہوت کے نقطۂ عروج تک پہنچ سکتی ہے۔ اور یہ بالکل فطری ہے۔"

مجامعت کے انداز کے بارے میں بعض اوقات یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ صرف عورت کے پیٹھ کے بل لیٹے والا انداز ہی صحیح موزوں اور فطری ہے۔ جب کہ باقی طریقے اگر شہوت پرستانہ نہیں تو کم از کم غیر فطری ضرور ہیں۔ یہ انداز نظر قطعی غلط ہے۔

تاریخ کے کسی مخصوص دور یا کسی نسل انسانی میں جو طریقہ مقبول ہو اس کا کسی دوسرے دور یا دیگر اقوام میں پسندیدہ قرار دیا جانا لازمی نہیں ہے۔ مجامعت کے انداز کی قدیم ترین تصویر ڈورڈون سے ملی تھی (اس کا تعلق قدیم حجری (SOLUTRIAN) عہد سے ہے۔ اس میں مرد چت لیٹا ہے اور عورت اس کے اوپر ہے۔ خود اس زمانہ میں بھی مختلف اقوام میں مختلف انداز ملتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے بھی متنوع طریقے تسلیم کئے ہیں۔

وان ڈی ویلڈ کے خیال میں یورپی مردوں نے آج تک اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ ازدواجی بستر کی یکسانیت کو فطری حدود کے اندر رہ کر تنوع پسندی سے دور کیا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں کو اس کا احساس ہے وہ اسے "نفسانیت" کا دوسرا مصب قرار دیتے ہوئے پایہ استحقار سے ٹھکرا دیتے ہیں۔

اس ضمن میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔ بعض مثالوں میں یہ صرف مرغوب خاطر انداز کی تلاش ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ زیادہ اہم مسئلہ بن جاتا ہے

بعض عورتوں کے لئے مروجہ اور زمانہ بھر کے پسندیدہ طریقے ناگوار اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ جب کہ دوسرے اور بعض اوقات تو غیر معمولی طریقے نسبتاً آسان اور لذت بخش ثابت ہوتے ہیں۔

خود کو صرف جسمانی دائرہ میں رکھتے ہوئے لیکن جنسی تعلقات کو وسیع مفہوم میں لیتے ہوئے اس امر کا ذہن نشین رکھنا بہت اہم ہے کہ دونوں فریقین کے لئے آسودگی بخش اور تسکین دہ طریقہ صحیح اور بہتر ہی نہیں بلکہ فطری بھی ہے۔

(بشرطیکہ دونوں کو اس سے کسی قسم کا گزند نہ پہنچے اور صحت مند افراد میں اس کا امکان بھی نہیں)

مرد اور عورت کے ملاپ کی انتہائی صورت یہ ہے دونوں ایک دوسرے کے تناسلی اعضاء کو پیار کرتے اور منہ میں لیتے ہیں۔ (یہ تحریک ایسے افراد میں خود بخود ہی پیدا ہوتی دیکھی گئی جنہوں نے اس کا ذکر تک بھی نہ سنا تھا۔)

اعصابی یا محتاط افراد جنسی تسکین کے مختلف اور غیر معمولی طریقوں کے بارے میں وثوق سے بالعموم یہ دریافت کرتے رہتے ہیں کہ یہ طریقہ درست ہے۔ یا نہیں۔ فلاں انداز نقصان دہ ہو گا۔ اور یوں اس "غیر جمالیاتی طریقہ سے انہیں ذہنی دھچکہ پہنچتا ہے"۔ لوگ یہ بھول جاتے

ہیں کہ اختلاط کے کسی طریقہ کو بھی جمالیاتی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ یہ حقیقت بھی فراموش کر جاتے ہیں کہ اس پراسرار جہانِ الفت کے اپنے جداگانہ قواعد ہیں۔ وہاں سائنس یا جمالیات کے سرد اور مجرد نظریات کا گذر نہیں۔ انسانی ہیجانات کی سند کے بغیر جہانِ الفت میں کسی اصول کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ نظریہ پرست کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن وہ محبت کے اسرار و رموز سے لاعلم ہے۔ اس لئے اسے خاموش کرنے کے لئے شیکسپیئر کے یہ الفاظ کافی ہیں: "محبت بہتر علم سے اور علم گہری محبت سے سخن طراز ہوتے ہیں۔"

ہملٹن نے جب سو شادی شدہ عورتوں کا جائزہ لیا۔ ان میں غالباً "سبھی نارمل صحت مند اور اچھے سماجی مقام کی حامل تھیں ان میں سے ۴۲ نے تناسلی اعضا کو پیار کرنے کرانے یا دونوں تجربات کا اعتراف کیا۔ انہوں نے اس سے کسی قسم کا نقصان نہ محسوس کیا۔ ہملٹن نے اس سے یہ بالکل درست نتیجہ نکالا ہے۔ "جنسی کھیل کا کوئی انداز بھی نفسیاتی تحریم نہیں۔ اس سلسلہ میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس سے نہ تو کوئی جسمانی گزند پہنچے اور نہ ہی پشیمانی ہونی چاہیے یہ بہت اہم ہے۔

ہملٹن کا بیان ہے کہ بعض مواقع پر میری ایسے افراد سے ملاقات ہوئی جو انجان پن سے اس بجروی کے مرتکب ہوتے رہے۔ انہیں کبھی اس کا احساس بھی نہ ہو سکا کہ بعض لوگوں کے خیال میں یہ قبیح اور قابلِ اعتراض بات ہے۔ اس لئے جب اچانک ہی ان پر یہ انکشاف ہوا کہ اب تک وہ قابلِ نفرت اور بجروی حرکات کرتے رہے اس سے ان میں قبل از وقت ہی اعصابی خلل (ضبطِ عظمت) کی علامات واضح ہو گئیں۔"

ایسے ہی معاملات سے یہ امر واضح اہمیت اختیار کر لیتا ہے کہ جنسی امور میں معقول اور عقلی خیالات کا پرچار بے حد ضروری ہے نسوانی امراض کے لحاظ سے ڈکنسن ایسے سمجھدار اور تجربہ کار ماہر کے خیال میں ہر عورت کو یہ یقین کرا دینا چاہیے کہ کھولتے جذبات کے بہاؤ میں جو کچھ بھی کیا جائے وہ محبت کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر اترتا ہے۔ میاں بیوی میں کردار کی باہمی بے تکلفی جائز ہے۔"

محبت کے فن کی تفصیلی جزئیات ہمارے اس محدود دائرہ سے خارج ہیں۔ لیکن اتنا واضح کر دیا جائے کہ یہ فن صرف محبت کے جسمانی پہلوؤں تک ہی محدود نہیں۔ یہ فن۔ اور یقیناً "یہ شکل فن ہے" ایسا ہے کہ اگر جسمانی محبت کا بلاواسطہ تعلق نہ بھی رہے، یا یہ پس منظر میں جا کر غیر اہم ہو جائے بلکہ جسمانی تعلقات قطعی طور سے ختم ہی کیوں نہ ہو جائیں، تو بھی جسمانی تعلقات میں یہ فن برقرار رہتا ہے۔ اس صورت میں اس کا اظہار انفرادی آزادی تسلیم کرنا، خیالات اور تصورات پر بنیادی مطابقت کے باوجود اختلافِ مذاق اور رجحانِ طبع کا تسلیم کرنا، دوسرے کے احساسات کا پاس کرتے رہنا، ذاتی خامی تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے فریق کے عیوب اور کمزوریوں کا درگزر کرنا، ساتھ ہی اس حسد اور رقابت پر قابو پانا جن کی جڑیں انسانی فطرت میں پیوست ہیں۔ اس لئے ہم زندگی کے کسی نہ کسی دور میں خود کو اس کے شکنجہ میں محسوس کرتے ہیں۔ ایسی اور اس وضع کی دیگر تمام مشکلات پر۔ جن کا بظاہر جنس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ قابو پانا محبت کے فن کا ہی جزو نہیں۔ بلکہ بہت بڑا اور اہم حصہ ہے۔ ان میں سے کسی ایک میں ناکامی کمزوری یا پریشانی کا باعث بنتے ہوئے فنِ الفت کو مجروح کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ازدواجی تعلقات میں تکمیل عناصر کے محاکمے کے لئے ان تعلقات کا وسیع پیمانے پر جائزہ لینا ہوگا۔ انفرادی بہبود کے لئے ان تمام عناصر کی تسکین لازمی ہے۔ معاملاتی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی سماجی حیثیت بھی ہے۔ کیونکہ یہی شادی کے دوام کے ضامن ہیں۔"

۱۹۰۰ء میں فرائیڈ نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اصلاحی منصوبے پیش کرنا معالج کا کام نہیں" مگر اب یہ خیال ماضی کا ورثہ بن چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے خود فرائیڈ کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد اس نے خود زندگی کے بعض اہم ترین مسائل پر غور کیا۔ آج ہمیں برملا یہ کہہ دینا چاہیے کہ اب معالج کا یہ کام نہیں رہا۔ کہ وہ دفع الوقتی سے کام لیتے ہوئے خرابیوں کو دور نہ کرے۔ یہ نظریہ درست ہے خواہ اس سے طب کا قدیم ترین نظریہ ہی متزلزل کیوں نہ ہو جائے۔ اب ہر شعبہ طب سے وابستہ معالجین کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ایسے حالات زیست پیدا کریں اور آج جنسی امور میں معالجین کے لئے یہ لازمی ہونا چاہیے کہ وہ معلومات میں وسعت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ شعور اور اعلیٰ ذہانت کا ثبوت دینے کی کوشش کریں۔

<u>کلارا تھامپسن</u>

سہیلیوں سے جنسی لگاؤ

تحلیل نفسی میں اب تو "ہم جنس پرستی" کی اصطلاح کچھ ردی کی ٹوکری ہی ایسی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جس میں اپنی جنس سے وابستہ ہر نوعیت کے تعلقات اٹھا پھینکے جاتے ہیں۔ ہم جنیت پر مبنی کارکردگی، طرزِ عمل، احساسات، خیالات اور دباؤ سبھی اسی ایک لفظ کی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ المختصر: اپنی جنس کے افراد سے دوستانہ یا معاندانہ کیسے ہی تعلقات کیوں نہ ہوں ان سب پر ہم جنس پرستی کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔

ان حالات میں جب ایک ماہر تحلیل خود کو اپنے سامعین کو یا اپنے کسی مریض کو یہ بتاتا ہے کہ مریض میں ہم جنس پرستانہ میلان ملتا ہے۔ تو آخر وہ کس حقیقت کا ابلاغ کرتا ہے! اس سے نہ تو اس کے خیالات کوئی واضح صورت اختیار کرتے ہیں۔ اور نہ ہی اس کے سامعین کے ذہن میں کوئی ٹھوس اور جامع تصور پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ جب کبھی مریض سے عام گفتگو میں وہ یہ لفظ استعمال کرتا ہے۔ تو مریض کے لئے کسی طرح بھی ممد ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ خوف اور دہشت ہی پیدا کرتا ہوگا۔ کیونکہ عام گفتگو میں لفظ "ہم جنس پرستی" مخصوص قسم کے معانی ہی نہیں رکھتا۔ بلکہ ہیجانی پریشانی کا غماز بھی ہے۔

اس مسئلہ کے بارے میں خیالات و نظریات کے بارے میں جو الجھن ملتی ہے اس کے باعث میں نے اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کی۔ یہاں میں نے ہم جنسیت پر تحلیل نفسی کے تمام نظریات کا جائزہ لے کر موجودہ دور کے نظریہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

فرائیڈ نے اپنے "لیبڈو" کی روشنی میں جب اس مسئلہ کا جائزہ لیا تو اس نے لاشعوری ہم جنسیت کو بنیادی قرار دیتے ہوئے اعصابی خلل کا ایک باعث قرار دیا۔ جب کہ موجودہ تحقیقات کی رو سے یہ شخصیت کے عمومی مسائل کی ایک علامت ہے۔

اب کسی مرض کے معاملہ میں اسے بنیادی اہمیت نہیں دی جاتی۔ بلکہ اسے کرداری الجھن کے متنوع مظاہر میں سے گردانا جاتا ہے۔ جب کرداری الجھنیں درست ہو جائیں۔ تو یہ بھی خود بخود ہی رفع ہو جاتی ہے۔

فرائیڈ کی رو سے سبھی میں لاشعوری ہم جنسیت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ جنسی توانائی کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بقول اس کا مظاہرہ تین مختلف صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ مخفی ہم جنسیت، بند۔ وبائی گر۔ ہم جنسیت اور آشکارہ ہم جنسیت۔

البتہ بلحاظ شدت اس میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اس کا مرضیاتی ہونا لازمی نہیں۔

فرائیڈ کے خیال میں اگر یہ ارتفاع پذیر نہ ہو سکے۔ تو یہ مریضانہ صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تحلیل نفسی ہم جنسیت کا علاج دبائے جانے یا آشکارہ صورت میں کرتی ہے۔ اور اسی صورت میں اسے

ایک مسئلہ سمجھا جا سکتا ہے اگر اس اصطلاح کو صرف ان دو ہی صورتوں میں استعمال کیا جائے تو اس کے مفہوم کی پیدا کردہ الجھن میں خاصی کمی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ فرائیڈ دبائی گئی ہم جنسیت کے میلانات کا ان صورتوں میں بھی تذکرہ کر جاتا ہے۔ جہاں اس اصطلاح کے محدود معانی میں جنسی مواد نہیں ملتا۔

فرائیڈ کا خیال اس کے نظریہ زوجنسیت پر مبنی ہے۔ اس کے بقول لبیڈو کا ایک حصہ ہم جنسیت پر مشتمل ہے اس لبیڈو کو مخالف جنسیت لبیڈو میں تبدیل کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے یہ دونوں اپنا انفرادی وجود برقرار رکھتے ہوئے زوجنسیت کے دو حصے بنتے ہیں جنسی نشوونما کے دوران ان دونوں میں سے ایک زیادہ نمایاں اور اہم صورت اختیار کر لیتا ہے اور دوسرا یا تو ارتفاع پذیر ہو جاتا ہے ورنہ پھر اعصابی الجھنوں کو جنم دینے کے باعث بن جاتا ہے۔

پس فرائیڈ کے خیال میں شخصیت کی بنیادی ساخت کی تشکیل میں لاشعوری ہم جنسیت ایک اہم ترین عنصر ہے۔ لیکن میں آج تک یہ جان نہ سکی کہ کن حالات کے تحت یہ لاشعوری رجحانات شعوری اور آشکارہ صورت اختیار کر جاتے ہیں؟

ہم جنسی نشوونما کے لئے منقلب ایڈی پس الجھاؤ کو نقطۂ آغاز مانا جاتا ہے۔ جب کہ بعض صورتوں میں نرگسیت کی طرف مراجعت سے ہم جنسی نشوونما تقویت پاتی ہے۔ اپنی جنس کے فرد سے محبت الفتِ ذات ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی سمجھی جا سکتی ہے۔ بہرحال اگر فرائیڈ کے نظریہ کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس کی وضاحت اس سے وابستہ اعمال کی قوت و شدت کو واضح نہیں کر سکتی۔ ابھی تک ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کون سے تجربات زیست منقلب ایڈی پس یا نرگسیت کی طرف مراجعت پیدا کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو نرگسیت کی طرف مراجعت سے ہمیشہ آشکارہ ہم جنسیت ہی کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ فرائیڈ اس کی "..." کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں جسمانی ساخت کی طرف رجوع کا مطلب بالفاظ دیگر "..." ہوتا ہے۔ ابھی ہمارے پاس ضروری معلومات نہیں ہیں!

بعض اوقات تحریروں میں اس بنا پر بھی الجھن پیدا ہو جاتی رہی ہے۔ کہ بسا اوقات ہم جنسیت کی مثالوں میں ایسے واقعات کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔ جہاں واضح طور سے جنسی تعلقات کا ثبوت تو نہیں ملتا ہاں! اپنے ہم جنس پر نیوراتی انحصار ضرور پایا جاتا ہے۔ گویا ہمیں یہ فرض کر لینے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ دونوں صورتوں کی شدت و قوت میں کوئی فرق نہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تو تحلیلِ نفسی کے کلاسیکی دبستان میں ایسا تحلیلی مواد نہیں ملتا جس سے اس امر کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ کہ آخر کیوں عقدِ نی تحریم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے افراد واضح اور آشکار ہم جنس پرستی اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ ہمیں صرف اتنا بتایا جاتا ہے کہ ایسے افراد کی فوق الانا کمزور ہوتی ہے۔ یعنی یہ اپنے لبیڈوئی محرکات پر قابو نہیں پا سکتے۔

اگر تشکیل شخصیت کو سمجھنے کے لئے فرائیڈ کے بنیادی نظریہ — کہ داری ساخت جنسی تحریک کے ارتقاء سے عبارت ہے — کا جائزہ لیا جائے تو دبائی گئی اور آشکار ہم جنسیت کے مسئلہ کا کسی اور طریقہ سے جائزہ لیا ہو گا۔ اگر ہم لبیڈو پر مبنی فارمولا نکال دیں۔ تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم جنسیت صرف مریضانہ رجحان ہی کا نام نہیں۔ اس کی وقوع پذیری کے لئے واضح اور مخصوص حالات کی ضرورت نہیں اور مختلف المزاج کرداری ساخت کے افراد میں ملتی ہے۔ تمام ہم جنس پرستی کو فاعل اور مفعول دو خانوں میں تقسیم کرنا بھی موزوں نہیں اور نہ ہی ایسی تقسیم واضح ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنے سے کم عمر لڑکے کے ساتھ فاعل اور زیادہ عمر والے کے ساتھ مفعول بن سکتا ہے۔ یکساں لڑکے دو اشخاص ہیں۔ ان میں سے ایک آشکارہ ہم جنسیت کو اپنا شعار بنا لیتا ہے۔ جب کہ دوسرا مخالف جنسیت کے مانند پر چل نکلتا ہے حالانکہ بلحاظ شخصیت دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔

رونبر کے بقول ہم جنس پرستوں کی شخصیت میں رقیبانہ اور استحصالی خصوصیات نمایاں ملتی ہیں۔ لیکن مخالف جنسیت میں کبھی یہ سب کچھ پایا جاتا ہے یوں رونبر کبھی جنسی مقصود کے انتخاب کی وجوہات کی تشریح نہیں کر پایا۔

اس امر پر فرائیڈ کی توثیق کی جا سکتی ہے۔ کہ تمام افراد صرف زوجنسی ہی نہیں۔ کثیر جنسی بھی ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حیاتیاتی لحاظ سے وہ دونوں جنسوں کے افراد سے جنسی بیداری کے اہل ہی نہیں بلکہ متنوع تہیجات سے بھی وہ بیدار ہو سکتے ہیں۔

اکثر لوگ جنسی خط کے معاملہ میں کم و بیش منتقل قسم کی وابستگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عہد طفلی میں — جب کہ بچہ ابھی بالغوں کی تحریمات کے نفاذ سے بچا ہوتا ہے تو وہ ہر طرح کے جسمانی تہیج سے غیر تنقیدی حظ اٹھاتا ہے جب اس خط میں کسی کو شریک کیا جائے۔ تو شریک کار کسی بھی جنس سے تعلق رکھ سکتا ہے۔ البتہ اس کے انتخاب میں قربت اور قابلِ حصول ہونے سے کافی فرق پڑ جاتا ہے۔

اگر ہم اوائل طفلی کی مثال سامنے رکھیں تو یہ تصور کرنا کافی دلچسپ ہو گا کہ جنسی پابندیوں سے آزاد تمدن میں جنسی نشوونما کے لحاظ سے کسی فرد کی کیا حالت ہو گی؟ اس کا قوی امکان ہے کہ بچوں کی اکثریت بالآخر حیاتیاتی ضروریات کے لحاظ سے موزوں ترین طرز عمل — نر و مادہ کے اعضائے تناسل کا ملاپ — اپنا لے گی۔ ایسی صورت میں کیا مخالف جنسیت کی ترجیح کا یہ مطلب ہو گا کہ جنسی زندگی کے دیگر مظاہر برباد دیئے گئے ہیں؟

اگر تمدن میں ان امور پر نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔ تو دباؤ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا یوں آسودگی کے دیگر موزوں وسایل کی موجودگی میں ہم جنسیت خود بخود ہی ختم ہو جائے گی۔ لیکن مخالف جنسیت پر مبنی تعلقات کی دشواری کی صورت میں اس کی دوبارہ ظہور پذیری کا امکان ہو سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر — عضویاتی لحاظ سے انسانوں میں جنسی تسکین کے لئے امتناعات کی عدم موجودگی میں — ہر طریقہ سے جنسی تسکین کا حصول ممکن ہے۔ لیکن جہاں بھی انتخاب کی آسانی ہو تو وہ زیادہ لذت انگیز طریقہ کو ترجیح دیں گے۔ دراصل جنسی تعلقات بہت اہم ہیں۔ اور تعلقات سے وابستہ اہمیت کا احساس جنسی کارکردگی سے اخذ شدہ لذت کی شدت کا تعین کرتا ہے۔

بعض استثنائی صورتوں میں ہم جنس مقصودِ الفت، ماحول اور گرد و پیش کی بعض پابندیوں کا جزو ہندہ ہوتا ہے۔ اگر ان سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم اس مسئلہ کا جائزہ لیں تو مخالف جنسیت پر مبنی طرزِ زیست کے تعین میں بعض بین الشخصی عوامل جیسے ماز تعلقات، خاندان کی نوعیت اور مقصودِ الفت کی شخصیت وغیرہ کو کسی طرح سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مزید تفصیلات میں جانے سے پہلے مغربی معاشرہ میں ہم جنس پرستی کی مقبولیت کے مختلف مدارج کا جائزہ لینا سودمند رہے گا۔

ہر تمدن ہی میں کسی نہ کسی طرح کی جنسی پابندی ملتی ہے۔ جنسی کردار کی ایک صورت کو ترجیح دے کر قبولِ عام کے تاج سے اسے نوازا جاتا ہے۔ جب کہ جنسی آسودگی کے دیگر طریقے بدنامی کے مختلف مدارج پر ہونے کے باعث ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کم مقبول ہوتے ہیں۔ جب کہ بعض ممنوع اور قابلِ تعزیر۔

اب ظاہر ہے کہ ان حالات میں انفرادی انتخاب کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ کیوں کہ تمدنی ناپسندیدگی پر مبنی جنسی کردار اپنانے کی صورت میں اسے حقہ پانی بند ہونے کا خدشہ بھی تو ہوتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں آشکار ہم جنسیت کی راہ میں اور خصوصاً مردوں کی صورت میں سب سے بڑی مشکل اس کی وجہ سے پیش آتی ہے۔

فرائیڈ نے آشکار اور دبائی گئی ہم جنسیت میں امتیاز کرتے وقت فوق الانا پر زور دیا تھا۔ اول الذکر میں فوق الانا کمزور ہے۔ جب کہ موخر الذکر میں قوی، لیکن یہ بات اتنی واضح اور سیدھی سادی نہیں کیونکہ آشکارہ ہم جنس پرستوں میں فرائیڈ کی تعریف پر پورے اترنے والے نفسی مریضوں کے ساتھ ساتھ ایسے افراد بھی ملتے ہیں جو اپنی (سخت یا شدید) فوق الانا کے ہاتھوں تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں اور فی الحقیقت اپنی حالت سے ملول اور ناشاد ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں خود کو قسمت کے دھارے پر چھوڑنے والے لوگ بھی ملتے ہیں لیکن انہیں اس کوتاہی کا احساس ضرور ہوتا ہے پھر ایسے بھی مل جائیں گے۔ جنہوں نے عزت نفس کا احساس ختم کر دیا ہے اور وہ اپنے جنسی کردار کو اپنی کم مائیگی کے ایک اور ثبوت کی صورت میں لیتے ہیں کچھ ایسے خوش قسمت بھی ملتے ہیں جو محفوظ حالات کے باعث ہم جنس پرستوں کے اس گروہ میں شمولیت سے بچ گئے جو مجرمانہ نفسی مرضیاتی عناصر سے عبارت ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت بڑے شہروں میں رہنے والوں پر صادق آتی ہے جہاں تنہا زندگی بسر کرنے یا احتیاط برتنے کے باعث معاشرہ کی ناپسندیدگی سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

ایسے ہم جنس پرست اپنے تعلقات کے بارے میں کوئی خاص الجھن نہیں محسوس کرتے حالانکہ دیگر معاملات زیست میں انہیں اپنی سماجی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہوتا ہے۔ یعنی فرائیڈ کے الفاظ میں یکسر دوفوق الانا کے حامل نہیں ہوتے۔

زیادہ تر عورتیں ایسی ہی صورت حال میں پائی جاتی ہیں اور اسی سے مردانہ اور زنانہ ہم جنسیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے خصوصیت سے اس تمدن میں سماجی لحاظ سے مردوں کے مقابلہ میں عورتیں باآسانی جسمانی بے تکلفی سے کام لے سکتے ہیں۔ اور کوئی اس پر حرف گیری نہیں کر سکتا۔ عورتیں اگر آپس میں بوس وکنار کرتی ہوں تو اسے عموماً اظہار دوستی سمجھا جاتا ہے۔

امریکہ میں باپ اپنے بیٹے کا منہ چومتے وقت خاصہ گھبراتا ہے۔ لیکن ماں بیٹی کے معاملہ میں ایسا نہیں ہوتا۔

فرینزی[1] نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ ہمارے تمدن میں کیونکہ ایک ہی جنس کے افراد میں گہری دوستی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔ اس لئے زبردستی کی مخالف جنسیت پائی جاتی ہے لیکن عورتوں کے ضمن میں ایسا نہیں اور ان میں اپنی ہی جنس سے گہری دوستی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان میں آشکار ہم جنسیت نسبتاً زیادہ گوارا کی جاتی ہے۔

حالانکہ حالیہ زمانہ تک غیر ازدواجی مگر مخالف جنسیت پر مبنی تعلقات رکھنے والی دو عورتیں اکثر معاشروں میں اکٹھی رہ کر آزادانہ زندگی بسر کر سکتی ہیں۔ سماجی لحاظ سے کوئی بھی ان پر حرف گیری نہ کرے گا لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنے اس رجحان کی مردانہ ملبوسات یا طرز عمل سے نمائش نہ کرتی پھریں۔

لیکن بعض اوقات اگر کوئی اس انتہا تک چلی بھی جائے تو اسے نہیں بلکہ عجیب تو سمجھا جاتا ہے لیکن ان کے سماجی مقاطعہ کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی اس کے برعکس اگر دو مرد بھی کچھ کرنا چاہئیں تو سماج ان کا ناطقہ بند کر دے۔

لیکن معاشرہ کے رجحان میں یہ فرق گہرے حیاتیاتی تقاضوں کا پیدا کردہ ہے۔ اپنا دل خوش رکھنے رہ دو عورتیں رہتے ہوئے اور بلا بازی جسمانی بے تکلفی اور ایک دوسرے کے جسم پر ہاتھ

باوجود بھی واضح قسم کی جنسی تسکین حاصل نہیں کر پاتیں۔ جب کہ ان ہی حالات میں دو مرد جنسی تہیج کا شکوہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ نسائی ہم جنسیت گوارا کرنے کا باعث یہ حیاتیاتی عوامل ہی ہیں لیکن بعض اور عوامل کی بنا پر بھی عورتوں کے لئے صورت حال نسبتاً زیادہ آسان ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ جب انتخاب کے مواقع محدود ہوں تو فرد حاضر مال ہی میں سے جنسی رفیق کے انتخاب پر مجبور ہوتا ہے۔ جب کہ انتخاب کے لامحدود مواقع کی صورت میں اس کا انتخاب دل کی پسندیدگی اور رجحان طبع کا مرہون منت ہے۔ مرد یا عورتوں سے دوستی کے ایسے ہی حالات میں جنسی رفیق کی حیثیت سے سب کچھ جائز ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی آتا ہے کہ مردوں کے برعکس عورتوں میں ایسی محرومی پیدا کرنے میں خارجی حالات کا ہاتھ بہت کم ہوتا ہے۔ اس لئے واضح قسم کی ہم جنس پرستی اختیار کرنے کا یہ مطلب ہوگا کہ اس مرد کی ذات میں کچھ الجھنیں پائی جاتی ہیں انہیں معاشرہ کسی طور سے گوارا نہیں کر سکتا اور ایسے مردوں پر کمزور کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔

جہاں تک مخالف جنسیت کا تعلق ہے تو مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کو اس کے کم مواقع کم میں کمی کا باعث بنتی ہیں۔ ایک رفیق کی تلاش میں سماجی طور پر صد ضوابط کئی پیچیدہ مراحل پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے کم عمری اور خوبصورتی کے باوجود بھی سماجی طریقوں کی پیروی میں موزوں مرد کے حصول کے لئے کافی انتظار کرنا پڑتا ہے یا ایسے خارجی حالات اور سماجی ضوابط کے باعث لبسا اوقات پختہ عمر عورتیں بھی ہم جنس پرستی پر مبنی تعلقات استوار کر لیتی ہیں۔ لیکن کسی مرد میں ان تعلقات کا مطلب ہوگا کہ اس کی شخصیت میں بعض اہم اور غیر معمولی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں ان پریشان کن معاملات سے آزاد ہوتی ہیں۔ لیکن معاشرہ جو نسائی ہم جنسیت گوارا کرتا ہے۔ تو اس کی وجہ نارمل عورتوں کی کثرت بھی ہو سکتی ہے۔

جب زنانہ اور مردانہ خصوصیات رکھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے بارے میں مختلف معاشروں میں مروجہ انداز نظر کا جائزہ لیا جائے تو یہاں بھی ہم جنس پرست عورتوں کو زیادہ گوارا کیا جاتا ہے جب ایک لڑکے کو "سیسی" کہا جائے تو اس کے لئے یہ لفظ اچھا خاصہ کلنک کا ٹیکہ بن جاتا ہے۔ اور دوسرے لوگوں کے نزدیک یہ لفظ تحقیر اور تذلیل کا مترادف ہے لیکن جب ایک لڑکی کو "ٹام بوائے"[ا] کہا جاتا ہے تو یہ لفظ تحقیر اور تذلیل کا باعث بننے کی بجائے۔

بعض اوقات تو نسائی پندار میں اضافہ کا موجب بنتا ہے غالباً اس کی وجہ جنسی کے وہ تصورات ہیں جن کے باعث دونوں جنسوں میں جرات اور دلیری قابل قدر سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے "سیسی" ماں کے پلے سے بندھا رہنے والا بزدل، ورکم ہمت لڑکا ہے۔ جب کہ "ٹام بوائے" ایک ایسی لڑکی ہے جو اپنی عمر کے کسی بھی لڑکے کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ دونوں جنسوں میں ہم جنسیت ہم اندازاں صورت اختیار کرتی ہے یہ۔ رجحانات غالباً اس کے انداز کے تعین میں حصہ لیتے ہیں۔

مغربی تہذیب میں ہم جنسیت کے بارے میں طرز عمل کچھ یوں ہے۔ اکثر حلقوں میں اسے جنسی کارکردگی کا ایک ناقابل قبول طریقہ قرار دیا جاتا ہے لیکن جب خارجی حالات کے باعث مخالف جنس تعلقات کا استوار کرنا یا عارضی طور سے ممکن نہ ہو جیسے تنہائی پیدا کرنے والے مواقع — تو ان حالات میں معاشرہ ہم جنس پرستوں کو ایک حد تک گوارا کر لیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ہم جنس پرستوں سے وابستہ کرداری خصوصیات بھی کافی حد تک اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لئے "سیسی" کے مقابلہ میں "ٹام بوائے" سے کم نفرت کی جاتی ہے۔

اپنی شخصیت کی مدد سے مردانہ جرات کی بنا پر اپنی جنس میں مقصود الفت تلاش کرنے

---

1. FERENCZEI.S. SEX IN PSYCHOANALYS SIX.CROION

ا (TOMBOY) مردانہ خصوصیات اور میلانات رکھنے والی لڑکی۔
— مترجم —

والے ہم جنس پرست اسی بنا پر نارمل قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ وہ اپنے انفرادی حالات کے مطابق، بین الشخصی تعلقات کی بہترین صورت سے افادہ حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ایسے افراد نفسی مرضیات کے لئے مریضوں کا درجہ نہیں رکھتے۔

نفسی معالجین کے لئے سب سے زیادہ اہم یہ سوال ہے کہ آخر وہ کون سی داخلی مشکلات ہیں جن کے باعث فرد بین الشخصی تعلقات کے لئے آشکارہ ہم جنسیت قابل ترجیح گردانتا ہے۔ جب خارجی ماحول میں مخالف جنسیت کے لئے پابندیاں نہ ہوں کیا شخصیت کے بعض داخلی عناصر کی بنا پر ایسا ہوتا ہے۔ یا بین الشخصی تعلقات کی متنوع مشکلات میں سے یہ بھی ایک ہے؟ کیا شخصیت کی اساسی ساخت کی بنا پر ایسا ہوتا ہے؟ کیا بعض ہنگامی عناصر پہلے سے بوجھ تلے دبی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور کیا اوائل طفلی میں تشکیل پا جانے والے بعض مستقل رجحانات شخصیت کو ہم جنسیت کے راستہ پر گامزن کرانے کا باعث نہیں بنتے؟

اس کا امکان ہے کہ یہ تمام امور ہی کسی نہ کسی طور سے ہم جنسیت کی تشکیل کے لئے تعین کن پس منظر کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اور ہر انفرادی مثال میں ہم جنسیت کی علامات کے تعین کا انحصار اس پس منظر پر ہو گا۔

الغرض! ہم جنسیت شفاخانہ کے قابل نہیں بلکہ مختلف النوع شخصیتوں میں مختلف النوع معانی کا حامل انداز: اعصابی خلل کی مختلف اقسام ہیں اس کے تعین کے لئے اسے مختلف امراض میں سے درد سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سر درد کا باعث ـــ دماغی رسولی، کسی ہڈی کا خمیدہ ہونا، متعدی مرض کے حملہ کا آغاز، دردِ شقیقہ، ہیجانی انتشار یا سر کی چوٹ ـ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سر درد پیدا کرنے والی بیماری کے کامیاب علاج سے سر درد خود بخود ختم ہو جائے گا۔

بعینہٖ آشکارہ ہم جنسیت ہے۔ زن ترسی، بالغانہ ذمہ داریوں کا خوف، قواعد و ضوابط کے خلاف معاندانہ رویہ، ہم جنس افراد سے نفرت اور حریفانہ جذبات پر قابو پانا ـ حقیقت سے گریز کر کے انشقاق ذہنی میں خود شہوانیت کے لئے کی جانے والی حرکات سے مشابہ جسمانی تہیج کا حصول ـــ اپنے یا دوسروں کے لئے سامان تہیج بہم پہنچانے کا ایک انداز ـــ غرض کہ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ بیبر نے خود اپنے مریضوں کی تحلیل کے دوران جن لوا حق سے واقفیت بہم پہنچائی صرف ان ہی کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ہم جنسیت کی علامت اختیار کر کے تسکین پانے والی الجھنوں کی وسعت کا اندازہ بھی اس سے لگایا جا سکتا ہے۔

اب اگر ممکن ہو تو ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ شخصیت اپنی الجھنوں کے حل کی خاطر ہم جنسیت کا کیوں سہارا لیتی ہے؟

کیا ہر فرد میں ایسے رجحانات کے سراغ لگائے جانے کا امکان ہے جو بچپن کے پیدا کردہ تھے اور جنہوں نے ہم جنسیت کے لئے شخصیت کی نشوونما کا تعین کر دیا۔

بہت سی مثالوں میں یہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے تمدن میں بچوں کو اپنی نشوونما کے دوران میں دونوں جنسوں کے افراد سے ہی گہرے رابطہ کا موقع ملتا ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ والدین میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے تعلقات کا انداز متعین ہوتا ہے اور اس انداز کے تعین میں بعض اہم عوامل کے ساتھ ساتھ جنسی دلچسپی اور جنسی تجسس بھی کچھ کردار ادا کرتے ہیں۔ اس رابطہ کے تعین میں والدین میں سے کسی ایک کے بچہ کی زندگی میں ادا کئے گئے کردار سے کافی حد تک فرق پڑتا ہے۔ مثلاً جسمانی احتیاجات کے ضمن میں باپ کی بجائے ماں بچہ کے زیادہ قریب ہوتی ہے جب کہ باپ کے متنوع وظائف کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے۔

بعض گھرانوں میں وہ نظم و ضبط برقرار رکھتا ہے۔ تو بعض میں بچوں کے لئے ایک اچھا خاصا ہم جولی جب کہ بعض کنبوں میں وہ ماں کے ساتھ ساتھ بچوں کی پریشانیوں میں شریک ہوتا ہے۔ یہ تمام عوامل والدین کے لئے بچہ کے ردعمل کے تعین کے نوعیت متعین کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں بچہ کا والدین کے ساتھ ایک اور رابطہ بھی ہوتا ہے اور وہ ہے وہ ان کا شخصی کردار! بچہ جلد ہی یہ دریافت کر لیتا ہے کہ کون طاقت اور قوت کا مالک ہے۔ کون اس سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ کس پر زیادہ انحصار کیا جا سکتا ہے۔ اور کسے اپنے لئے آلہ کار بنایا جا سکتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس! یہ تمام عوامل والدین میں سے کسی ایک کی ترجیح اور اس سے وفاداری کا باعث بنتے ہیں۔ ہم جنسیت کے ارتقاء میں بچہ کا یہ احساس بے حد اہم کردار ادا کرتا ہے کہ بحیثیت جنس وہ اپنے والدین کی امیدوں اور توقعات کے برعکس ثابت ہوا۔ زیادہ افسوس والدین میں سے پسندیدہ ہستی کی ناامیدی کے باعث ہوتا ہے۔ یہ احساس اس صورت میں مزید شدت اختیار کر جاتا ہے۔

والدین اپنی تسکین کی خاطر بچہ کو مخالف جنس کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوں تاہم یہ تمام عوامل بالغوں میں ہم جنسیت پیدا کرنے کے موجب نہیں بنتے۔ جن لڑکیوں کے والدین نے انہیں لڑکا بنانا چاہا۔ ایسی لڑکیاں اپنی جنس سے کسی مخصوص دلچسپی کے بغیر بھی پروان چڑھ سکتی ہیں۔ اسی طرح مادریت ایسے نرم و نازک احساسات کے حامل لڑکے عموماً شادی کے بعد ہم جنسیت کے خلاف کسی بھی طویل جوڑی کشمکش سے دوچار ہوئے بغیر۔ اپنے بچوں کی پرورش ماں بن کر کرتے اور اس سے آسودگی بھی حاصل کرتے ہیں۔ جب باپ مضبوط اور قوی محبت کرنے والا اور شخصیت پر تعمیری اثرات چھوڑنے والا ہو اور ماں لڑکے کی توقعات پر پوری نہ اترتی ہو تو لڑکے میں ہم جنسیت پیدا ہونے کا امکان ہے۔ لیکن یہ بھی اغلب ہے کہ وہ پدرانہ خصائص کی حامل عورت سے شادی کا خواہاں ہو گا۔ اگر اس کی شخصیت مضرت رساں رجحانات کی شکار ہو چکی ہے تو وہ اپنی ماں سے ملتی جلتی ایسی عورت سے شادی کرے گا۔ جو اس کی زندگی میں تخریب کی مظہر بن کر رہ جائے گی۔ درتباہ کن اثرات کے حامل کسی مرد سے ہم جنس پرستانہ تعلقات کی استواری بھی بعید از قیاس نہیں۔ اسی انداز سے اگر ہم ماں اور باپ کی شخصیات کے متعدد عناصر کی اثر اندازی کا تجزیہ کریں۔ تو یہ واضح ہو جائے گا کہ بالغانہ زندگی میں جنسی رفیق کے انتخاب کے معیار کے تعین میں ان کا کوئی کردار نہیں ہے۔

جنسی تعلقات کی استواری دو بنیادوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ایک طرف تو جنسی رفیق کا انتخاب تعمیری اور باہمی تعاون و مسرت کا باعث بنتا ہے۔ اور اس کے برعکس دوسری طرف تخریبی انتخاب ہے۔ اب تعلقات کی بنیاد خوف پر ہے۔ جو بالآخر تباہی کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ یہ کچھ شمع و پروانہ ایسی حالت ہے۔ ان دو انتہائی صورتوں کے درمیان اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

جیسے تعلقات کے تعمیری انداز کے باوجود بھی ان میں کچھ تخریبی عناصر ملتے ہوں۔ وغیرہ وغیرہ تعلقات کی استواری کا یہ انداز جنس سے بالاتر ہے۔ مخالف جنسیت اور ہم جنسیت دونوں ہی پر مبنی تعلقات یہ تمام صورتیں اختیار کر سکتے ہیں۔

اس لئے ہم جنسیت کے بواعث کے لئے ہمیں مزید گہرائی میں جانے کی ضرورت ہو گی اس ضمن میں مزید دو عوامل کا جائزہ بھی لازمی ہے۔ شخصیت کس حد تک نقصان اٹھا چکی ہے اور اتفاقی اور حادثاتی واقعات کا کردار!

وہ لوگ جو بہت زیادہ خوفزدہ ہوں۔ اور عزت نفس کی کمی ہو تو کیونکہ یہ آسانی سے دوست نہیں بنا سکتے۔ اور دوسرے لوگوں سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے یہ اپنی ہی جنس کے افراد سے رابطہ رکھنے میں سہولت محسوس کرتے ہیں۔ اس صورت میں وہ خود کو کم خوفزدہ محسوس کرتے ہیں اور معاملہ گھائل کی گت گھائل جانے ـ ایسا ہو جاتا ہے۔

مخالف جنس کے افراد ان کے لئے پراسرار سے ہوتے ہیں۔ اور "نامعلوم" ان پر دہشت طاری کر دیتا ہے۔

علاوہ ازیں مخالف جنس کے ساتھ تعلقات کی استواری خاصی ذمہ داری اور دردِ سر کا کام ہے مرد سے عورت کے اخراجات برداشت کرنے کی توقع رکھی جاتی ہے۔ اسی طرح عورتوں کو بچوں کا خدشہ ہوتا ہے۔ زندگی سے خوفزدہ عورت میں مرد کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے کوشش حسن کا امتحان لینے کی ہمت نہیں ہوتی۔ یہی حال ایک خوفزدہ مرد کا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی عورت بھی قبول نہ کرے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے تمام افراد ہم جنس پرستی ہی کو شعار بنا لیتے ہیں۔

بسا اوقات معاشرہ کی ناپسندیدگی اور سماجی معاییر کی پابندی کے باعث یہ لوگ شادیاں کر لیتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ شادی دلیلِ پختگی نہیں سمجھی جا سکتی۔

ایسے لوگ بھی ہم جنسیت کے راستہ پر چل نکلتے ہیں۔ جو قربت اور بے تکلفی سے خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ تنہائی سے بھی ہراساں رہتے ہوں ابھی ابھی بتایا جا چکا ہے کہ انہیں جنس غیر اجنبی ہونے کے باعث خوفزدہ نہیں کرتی۔ ایسے لوگوں کے لئے ہم جنس پرستی پر مبنی تعلقات وقتی ہوتے ہیں اور ایسے بندھن جنہیں جب بھی چاہیں توڑا جا سکتا ہو۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تعلقات میں آزادی کا احساس تو محض دھوکہ ہی ہے۔ کیونکہ نیوراتی ضروریات کی بنا پر جس جنس سے بھی نیوراتی وابستگی ہوگی اس سے چھٹکارا [illegible] نہ ہوگا مردوں میں جہد للبقا کا خوف انہیں اپنے سے زیادہ امیر مردوں پر مالی [illegible] انحصار کو جنم دیتا ہے۔

اب تک جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے صرف یہی واضح ہوتا ہے کہ شخصیت سے وابستہ مختلف النوع الجھنیں جزوی حل کے طور پر ہم جنسیت کا سہارا لیتی ہیں۔ لیکن ہم جنس پرستی اور صرف ہم جنس پرستی پیدا کرنے والے خصوصی عوامل کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ کچھ مصنفین نے کم عمری میں ورغلائے جانے کو اہمیت دی ہے اور اکثر ہم جنس پرست ایسے تجربات ہی کو اپنی ہم جنسیت کا باعث قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ قطعاً درست نہیں کیونکہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنہوں نے ان تجربات سے دوچار ہونے کے باعث بھی ہم جنس پرستی کو اپنا شعار نہ بنایا۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا لڑکا جو پہلے سے ہی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے۔ جو عورتوں سے خوف کھاتا ہے اور خود میں زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کی سکت نہیں پاتا۔ جب ایسے تجربہ سے دوچار ہوتا ہے تو اعصابی خلل کی تکمیل کے لحاظ سے وہ تہیج کا باعث بنتا ہے جب کہ زندگی سے ہراساں نہ ہونے والے لڑکے کے لئے ایسا تجربہ تفتیشِ حیات کے طویل عمل میں محض ایک واقعہ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ اور یوں یہ تجربہ دیگر اور مختلف النوع تجربات زیست کے حصول میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

یہ عام حقیقت ہے کہ قبل بلوغت میں اکثر بچے ہم جنسیت پر مبنی کھیل کھیلتے ہیں۔ مگر اکثریت کے لئے یہ کھیل کسی نفسیاتی نقصان کا باعث نہیں بنتے۔

غالباً فرائیڈ نے اعصابی خلل کے ماخذات میں جنس کی اہمیت پر زور دیا تھا اور شاید ہم جنسیت کی سماجی ناپسندیدگی کے باعث اکثر معالجین ہم جنس پرستی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے رہے ہیں۔ جدید تجزیاتی تحقیقات نے یہ واضح کر دیا ہے کہ دیگر کرداری الجھنوں کے حل ہو جانے پر ہم جنسیت خود بخود ہی ختم ہو جاتی ہے۔

ہم اگر ہم جنسیت کو اعصابی خلل کی ایک علامت سمجھ لیں تو یہ ایسی علامت ہے جس کے ضمن میں یکسانیت نہیں ملتی۔ مخالف جنسیت کی ہی مانند ہم جنسیت پر مبنی بین الشخصی تعلقات میں بھی بے شمار الجھی ہوئی صورتیں پائی جاتی ہیں۔

بعض اوقات ماں بچہ جیسی وابستگی اس ضمن میں بہت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتی ہے اس وابستگی ضمن میں بعض اوقات حریفانہ، آزار پسندانہ، اور ایذا پسندانہ رجحانات نمایاں ملتے ہیں پھر ایسے تعلقات بھی ملتے ہیں۔ جن کی اساس ہی نفرت یا خوف پر استوار ہوتی ہے۔

جب کہ برعکس صورت میں باہمی تعاون و امداد پائی جاتی ہے۔ غالباً مخالف جنسیت کے مقابلہ میں ہم جنسیت میں بے وفائی اور "آزاد جنسی تعلقات" زیادہ ملتے ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں میں شخصیت کے تشکیلی عناصر کے لحاظ سے ان کے انداز میں یکسانیت ملتی ہے۔ ہر دو صورتوں میں تناسل اور جسمانی تہیج سے زیادہ دلچسپی لی جاتی ہے اور تہیج پیدا کرنے والی ہستی ثانوی اہمیت رکھتی ہے جنسی فعل سے صرف فعل ہی کی حد تک دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے وہ بھی اس لئے کہ فرد جنسی فعل کے لئے خود کو مجبور پاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ بعض اوقات جنسی فعل کے دوران جنسی رفیق سے ایک بات بھی نہیں کی جاتی۔

دوسری انتہا ہمیں ہم جنسی "ازدواج" کی صورت میں ملتی ہے۔ یہاں ازدواج سے ایسے طویل ہم جنس پرستانہ تعلقات مراد ہیں جن میں فریقین ایک دوسرے کی شخصیت اور باہمی دلچسپیوں کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔

لیکن یہ "ازدواج" بھی مخالف جنسی شادیوں کی مانند بہت سی الجھنیں اور پریشانیاں اپنے ہمراہ لاتا ہے۔ شک و حسد، تعریفیت، رقابت اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی خواہش۔ یہ سبھی کچھ ہم جنس پرستانہ "شادیوں" میں ملتا ہے۔ کم از کم نظریاتی طور سے ہی یہ مانا جا سکتا ہے کہ ہم جنسیت پر مبنی بالغ۔ محبت پر استوار تعلقات بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمارے تمدن میں بالغانہ محبت ابھی خاصی عنقا معلوم ہوتی ہے اس لئے لازماً ہم جنس پرستوں میں اس کا فقدان اور بھی زیادہ ہوگا۔ کیونکہ تھوڑی بہت پختگی کے بعد ایک شخص لازماً خارجی حالات کی عاید کردہ پابندیوں اور مجبوریوں سے قطع نظر جنسِ مخالف سے تعلقات کی استواری کو ترجیح دے گا۔

اس لئے جیسے کہ مندرجہ ذیل عوامل کے تجزیے سے بھی واضح ہوتا ہے۔ بین الشخصی تعلقات کے لئے ہم جنسیت کی ترجیح مختلف صورتوں میں مختلف بواعث کی پیدا کردہ ہوگی۔ کیا اس کی تشکیل کا باعث ایک مخصوص واقعہ بنتا ہے یا یہ مختلف النوع امور کی کارفرمائی ہوتی ہے اس بارے میں ابھی تک ہماری تحقیقات وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتیں۔

گو ہم اس کے مخصوص بواعث نہیں جان سکتے۔ لیکن ہم جنسیت سے تسکین پانے والی احتیاجات سے ہم ناواقف نہیں اور ان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں جنسی تسکین کا حصول بالکل واضح ہے۔ اور مخالف جنس سے آسودگی نہ پانے والے شخص کے لئے یہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ حصول تسکین کا انحصار کسی دوسری ہستی پر ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے تنہائی اور علیحدگی کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ احساس بھی ایک حد تک باعث تسکین ہوتا ہے کہ ہم ہم جنس پرست سماجی ضابطہ کو توڑنے والے ہیں۔ چنانچہ اس احساس کے تحت خود کو باغی، دلیر اور قوی سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اور لوگ کبھی یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اس سے احساس جرم میں ایک حد تک کمی ہو جاتی ہے۔

اس سے قبل ایک دو اور آسودگیوں — بعض مرد ہم جنس پرستوں کی صورت میں مالی مدد اور احساسِ ذمہ داری سے چھٹکارا — کا بھی تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

آشکارہ ہم جنسیت کے لئے تعمیری یا تخریبی ثابت ہو سکتی ہے۔ بعض صورتوں میں فرد اس کے علاوہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے لئے تعلقات کا یہی انداز موزوں ہو سکتا ہے ایسی صورت میں تنہا پسند زندگی بسر کرنے سے ہم جنسیت کہیں زیادہ بہتر ہے۔ یہ خصوصیت سے دونوں جنسوں کے ان ہم جنس پرستوں کے لئے کہا جا سکتا ہے۔ جن کے ہم جنس پرستانہ تعلقات میں ماں بچہ ایسی وابستگی پائی جاتی ہو۔ گو بعض صورتوں میں پہلے سے انحطاط پذیر شخصیت کے

لئے اور بھی تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن ہم اسے کسی طور سے بھی شخصیت کے دیگر نیوراتی رجحانات کی اساس نہیں قرار دے سکتے۔ یعنی اسے اعصابی خلل کا باعث نہیں سمجھا جا سکتا۔ البتہ اس بات کا اس کے بعد سے شخصیت کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ اعصابی خلل کی دیگر علامات کی صورت میں کیا جاتا ہے نفسی معالج کو شخصیت کے عناصر ترکیبی پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔ کیونکہ اصل چیز تو شخصیت ہے نہ کہ اس کی ایک نا توں مدمت جیسے — تم جنسیت!

ہیولاک ایلس

جنسی ابال، دباؤ اور ارتفاع

اپنے تمدن کے لحاظ سے ہمیں یہ معلوم ہے کہ سماجی زندگی کے عام حالات کے تحت جنسی تحریک کی توانائی کا رخ ان تین راستوں کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔

۱۔ اس کے واضح اظہار کی تمام صورتوں کو دبا کر اس توانائی کو بے لگام چھوڑ دیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں عصوبیت نارمل یا ابنارمل صورتوں میں اس کی تسکین کرتی ہے۔

۲۔ عارضی یا برائے نام جنسی تعلقات کو ذریعہ تسکین بنایا جاتا ہے۔ طوائف بازی اس کی عام مثال ہے۔

۳۔ شادی کر لی جاتی ہے۔ یعنی جنسی تعلقات کا وہ سلسلہ جسے اگر حالات اجازت دیں۔ تو دائمی بنانے کا ارادہ ہوتا ہے۔ اس میں جنس کے علاوہ دیگر مقاصد بھی شامل ہوتے ہیں۔

اس امر کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ تیسرا طریقہ بہتر ہے۔ اور بچوں کی عدم موجودگی کے باوجود بھی شادی زندگی کا ایک گمبھیر اور لطیف تجربہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جسے ہر نظام اخلاق اور مذہب کے پیرو بلکہ لامذہب بھی باآسانی تسلیم کر سکتے ہیں۔ شادی بہترین راستہ سہی مگر مشکلات کے خارزار سے بھرا ہوا ہے۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ جنسی کارکردگی کا راستہ مشکلات کے ہفت خواں سے بھرا ملتا ہے اس میں اعصابی خلل کے مریض یا نارمل اور صحت مند فرد کی تخصیص نہیں ہے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ جلد ظہور پذیری کے باوجود بھی دیگر تحریکوں کے مقابلہ میں جنسی کردار کی تحریک قدرے تاخیر سے مکمل نشوونما حاصل کرتی ہے۔

دوسری وجہ اس تحریک کی دروبست اور شدید نوعیت میں ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ اور سب سے اہم وجہ اخلاق، مذہب، قانون اور روایت کی صورت میں وہ سخت اور کٹر قسم کے قواعد ہیں جن کا سکہ جنسی طور پر چلتا ہے جنس کے سلسلہ میں پیش بندی کے لئے دانشمندانہ طور پر اپنائے گئے صحت کے قوانین کی ہمیشہ ہی ضرورت رہے گی۔ اس ضرورت کی اہمیت اسی بنا پر اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں سقم سے پیدا ہونے والے حالات بعض اوقات معالج کی پہنچ سے باہر ہوتے ہیں۔ ہمیں جنسی تحریک کو توانائی سمجھنا چاہیئے۔ ایسی توانائی جو تمام شخصیت کو گھوارے

اس توانائی کا سوتہ ہمارے اندر سے پھوٹتا ہے۔ یہ توانائی مختلف النوع صورتیں اختیار کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ صحت مند اور مریضانہ نارمل اور ابنارمل سبھی اس کے مختلف روپ ہیں بلکہ بعض اوقات تو اپنے اظہار کے لئے یہ ایسا انداز بھی اختیار کر لیتی ہے۔ جس کا بادی النظر میں جنس سے کوئی تعلق ہی نہیں معلوم ہوتا۔

ہم اس توانائی پر کسی حد تک قابو پا سکتے ہیں۔ یا اس کا رخ کسی اور راستہ کی طرف بھی موڑا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے کلی طور سے دبا ... جنسی تحریک کی توانائی کا ... ماہرین کے اذہان میں طویل مدت سے ... تھا۔

الفلش نے نصف صدی قبل اعصاب کی صورتوں کی تشریح اسی کی روشنی میں کی تھی۔ ہیمنر ... سے مخصوصیت سے اس کا اعلانی ... پر ... یہ نظریہ خود ... استو ... ہے اور فرائیڈ نے تو اس کی تمام گہرائیوں کو کھنگال ڈالا ہے۔

ہمارے خیال میں جنسی تحریک کو توانائی قرار دینا مبہم ہے۔ گذشتہ صفحات میں کی گئی تعریف سے زیادہ وضاحت والی تعریف کے لئے شاید یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ شہوانی شخصیت کا انحصار اس تکون پر ہے جو دماغ، غدۂ حمار کے نظام اور خود کار نظام عصبی کے اشتراک سے تشکیل پاتی ہے تیسرے عنصر کی اہمیت ابھی تک اجاگر نہیں ہو سکی۔ اس لئے اس کے بارے میں کچھ وضاحت کی جانی چاہئے۔ اس نظام میں ہاضمہ، گردش، تنفس اور بول کے خود کار نظام شامل ہیں۔

گویا مجموعی طور سے زندگی کے بنیادی وظائف کی درستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیمپف کے خیال میں ماحول اور گردوپیش کے ضمن میں فرد کے مخالفانہ اور موافقانہ رویہ کا انحصار اسی خود کار نظام کی درستی پر ہے۔

واضح رہے کہ وہ انسانی کردار اور طرز عمل کا مطالعہ اسی کی روشنی میں کرتا ہے۔ جانوروں نے خود کار نظام کی ابتدائی نوعیت کے باعث جب تکلیف کا تناؤ محسوس کیا تو انہوں نے حفاظت خود کا انداز اپنایا۔ یوں تناؤ سے چھٹکارا پا کر انہوں نے جب سلسلہ حیات برقرار رکھا تو ورثہ میں یہ اسے خصوصیتوں کو بخش دیا گیا۔

اس طور سے ہم جسمانی اور نفسی عوامل میں علت و معلول کا رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یوں یہ عمل ایک وحدت کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس سے ہم خواہشات اور قوت اور لیبڈو کے نظریات کو صحیح طور سے سمجھ سکتے ہیں۔ اسے آپ چاہیں تو شوپنہار کے "ارادہ" کا نام دیں۔ یہ وہی ارادہ ہے جس کی جنسی تحریک کے طرف فلاسفر یقیناً رجوع کریں گے۔

کافی عرصہ پہلے کارلائل نے اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ ہم نے سب سے قابل ذکر جس کا تذکرہ سنا وہ جرمنی فلاسفر گرم کا ہے۔ اور وہ ہے — خواہش!

فرائیڈ اپنے درخشاں اسلوب کی امداد سے ۱۹۱۲ء سے ان مختلف حالات کا تذکرہ کر رہا تھا جو جنسی زندگی میں مشکلات پیدا کر کے اعصابی خلل کا باعث بنتے تھے۔ اس کی تشریح اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے کہ وہ تحلیل نفسی کے تمام متنازعہ فیہ نظریات سے آزاد اور ممتاز ہے۔

فرائیڈ نے خود بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ تمام مثالوں کی درجہ بندی قابل اطمینان نہیں کیونکہ اس کا امکان ہے کہ ایک کیس مختلف حالات میں مختلف صورتیں پیش کرے۔

بلکہ بعض اوقات تو ایک کیس میں ایک ہی وقت میں مختلف صورتیں مل جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی درجہ بندی سے ان مختلف صورتوں کا سمجھ لینا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے

یوں انہیں چار درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جنسی مواقع کے پیدا کردہ اعصابی خلل کی سب سے عام اور سیدھی سادی صورت محرومی کی ہے۔ اس صورت سے اکثریت کسی نہ کسی وقت اور کسی نہ کسی طور سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ جب تک خارجی دنیا میں محبت کی احتیاج کسی حقیقی مقصود کے وسیلہ سے تسکین پاتی ہے تو فرد صحت مند رہتا ہے۔ لیکن جب کسی نعم البدل کے بغیر یہ مقصود والفت چھن جائے۔ تو وہ نیوراتی ہو جاتا ہے۔

اس صورت حالات میں جنسی محرومی کے باوجود بھی دو طریقوں سے صحت مند رہا جا سکتا ہے۔ پہلی صورت میں نفسی تناؤ کا رخ عمل دنیا سے متعلقہ کارکردگی کی طرف موڑ دیتا ہے اور یوں ایک ... جنسی ... تسکین کا ... کر لیتا ہے

دوسری صورت ... سے ... اور ... توانائی ...

مقاصد کے حصول کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں ان علامات کے پیدا ہو جانے کا بھی امکان ہوتا ہے جن کے لئے سی۔ جی۔ ژنگ نے دروں بینی کی اصطلاح وضع کی تھی۔ یعنی اضافی جنسی تحریک ارتفاع پذیر ہونے کی بجائے اصل راستوں سے ہٹ کر تخیلی راستوں پر چل نکلتی ہے اور یوں وہ خوابی تمناؤں کی تسکین کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔

۲۔ دوسری صورت میں فرد مریض بن جاتا ہے۔ وہ اس وجہ سے مریض نہیں بنتا کہ خارجی دنیا میں عدم تسکین اور محرومی اس کا مقدر ہو جاتی ہے۔ بلکہ خارجی دنیا میں حصول تسکین کے لئے اس کی داخلی سعی اس کا باعث ہوتی ہے۔ وہ جنسی تسکین کے لئے نارمل اور مروجہ طریقے اپنانے کے ناقابل ہوتا ہے۔ اس لئے جب وہ خارجی حالات کے ساتھ مطابقت کی کوشش کرتا ہے۔ تو داخلی مشکلات کی کشمکش اس میں ذہنی اختلال پیدا کر دیتی ہے۔

۳۔ دوسرے گروہ کی انتہا پسندانہ مثالیں تیسرے گروہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جنسی نشوونما میں امتناعات کے باعث فرد انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اصولاً ہم انہیں جداگانہ درجہ نہیں دے سکتے۔ ایسا صرف سہولت کی خاطر کیا گیا ہے۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی جنسی تسکین صرف طفلانہ مقاصد سے ہو سکتی ہے۔ یہ طفلانہ مقاصد انفرادی نشوونما کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ یہ طفلانہ تحریکوں کو دبانے سے ظہور پذیر ہونے والی ذہنی کشمکش انتہائی مریضانہ صورت اختیار کر لیتی ہے۔

۴۔ اس زمرہ میں وہ صحت مند افراد آتے ہیں۔ جو خارجی حالات میں عدم تبدیلی کے باوجود بھی مریضانہ صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ لیکن جب ژرف نگاہی سے ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے کسی دور سے وابستہ بعض حیاتیاتی تغیرات (جیسے بلوغت یا اختتام حیض) کے باعث جنسی خواہشات میں کمی بیشی سے صحت کا توازن بگڑ جانے پر اعصابی خلل کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ فرد جنسی خواہشات کی اس کمی بیشی سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور خارجی طور سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور خارجی طور سے وہ ان کی تسکین کے ناقابل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مریضانہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔

جنسی خواہشات کی کمی بیشی پیمانوں سے نہیں ماپی جا سکتی۔ دراصل یہ کمی بیشی ہی فساد کی جڑ ہوتی ہے۔ اور اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جدوجہد ہی فرد کو عاجز کر دیتی ہے۔

ہماری یہ درجہ بندی شفا خانوں کے انداز پر نہیں ہے۔ اس کا مقصد تو جنس سے وابستہ مریضانہ صورتوں کا اندازہ لگانا تھا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جنسی انتشار کی نفسی اور اعصابی کیفیات سے نجات دلانے کے لئے تدابیر وضع کیا جا سکتی ہیں۔ اور جنسی زندگی میں حفظانِ صحت کے اصول کیسے اپنائے جا سکتے ہیں۔

خواہ فرد کی جسمانی ساخت کتنی ہی صحت مند کیوں نہ ہو، لیکن جنسی زندگی سے وابستہ مشکلات، داخلی تغیرات اور تغیر پذیر خارجی حالات سے مطابقت کی سعی مسلسل بالآخر مریضانہ صورت اختیار کر ہی جاتی ہے۔ اگر فرد کو ورثہ میں کچھ مریضانہ خصائص بھی ملے ہوں تو جنسی زندگی کی یہ مشکلات سوا تشنہ ہو جاتی ہیں۔

جنسی تحریک قوت ہے ایسی قوت جس کا صحیح اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ اب خود ہی سوچئے جب فرد ذاتی تغیرات کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات کے تحت اس بے اندازہ قوت کو لگام دینے کی کوشش کرے گا۔ تو یہ کام کتنا خطرناک نہ ہو گا۔ اس تحریک کے نارمل ہونے یا نارمل بننے کی سعی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس تحریک کے نارمل ہونے سے صورت حالات میں مزید پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ نارمل ہونے سے اس کی غیر معمولی شدت یا حصول تسکین کے لئے غیر معمولی طریقوں کا [illegible] نہیں مد [illegible] تحریک کا غیر معمولی پن اور مریضانہ صورت بھی [illegible] میں آ جاتی ہے۔

بعض اوقات جنسی تحریک کا یہ بیرونی پن خفی ہوتا ہے۔ یہ خلقی ویسے ہی ہے جیسے کہ جنسی تحریک کی دیگر صورتیں خلقی ہوتی ہیں۔

اب یہ واضح ہو چکا ہو گا کہ ہم نے جنسیات فرائڈ کی اصطلاح میں "لیبڈو" کی مخصوص تعریف کئے بغیر ہی جب سلسلہ بحث چھیڑ دیا۔ تو اب اس کے مفہوم کی وسعت سامنے آ رہی ہے۔

"لیبڈو" سے فرائڈ کے وابستہ کو وہ مفہوم میں اور بھی زیادہ وسعت ہے۔ فرائڈ کے بعض شاگرد جنسی تحریک کے عام مفہوم کو پھیلانے میں بالکل ہی انتہا تک جا پہنچے۔ اسی طرح ایف۔ ایل۔ ویلز کے خیال میں "شہوانیت" کی بجائے "لذتیت" اور "خود شہوانی" کی جگہ "خود لذتی" اصطلاحات استعمال کرنی چاہیئے۔

کریل برٹ کے خیال میں لیبڈو کے مفہوم میں وسعت نفسیات کے عمومی رجحان سے مطابقت رکھتی ہے۔ اب نفسیات دانوں کا یہ خیال ہے کہ حیوانی آباء سے ورثہ میں ملے ہوئے خلقی رجحانات و میلانات صرف ایک جذبۂ حیات کی مختلف النوع صورتیں ہیں۔ اسی طرح میکڈوگل جبلتوں کی کٹر حد بندی کے نظریہ کو مزید وسعت دیتے ہوئے اب ان کو زندگی کے اس عظیم مقصد سے ہم آہنگ قرار دے رہا ہے جو تمام جاندار اشیاء میں رونق حیات کا باعث ہوتا ہے۔ "اس مقصد کی منزل کو ہم پورے طور سے نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ثباتِ زیست اور افزائشِ حیات اسی سے ہے۔"

اس امر کا جائزہ موجب دلچسپی ہو گا کہ جب ژنگ نے فرائڈ کے خالص جنسی مفہوم سے ہٹ کر لیبڈو کے مفہوم کو زیادہ وسیع کرنے والا نظریہ پیش کیا تو اس پر سخت تنقید کی گئی۔ حالانکہ وہ اس قدیم اندازِ نظر "جذبہ یا خواہش کی عمومیت" والی بات ہی کر رہا تھا۔ یوں یہ شوپنہار کے ارادہ اور برگساں کے جوشِ حیات والی بات ہو جاتی ہے۔ شاید اسی لئے برٹ نے اسے تمام جبلتوں سے خارج ہونے والی عمومی نوعیت کی ارادی توانائی کا نام دیا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی بتا دیا جائے کہ اگر "جبلت" کی اصطلاح استعمال کرنی ہی ہے تو اسے ہیجان کے مقابلہ میں زیادہ بنیادی اور قدیم سمجھنا ہو گا۔

بعض لوگوں کی مانند ہیجانی خصائص کو جبلتوں کا مرکزی حصہ قرار دینا بالکل غلط ہے۔ جبلتوں کے معاملہ میں تو ہمیں ڈگارنٹ کی ہم نوائی میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ہیجانی نظام نہیں بلکہ ارادی ہے۔ اساسی ارادہ وابستہ تحریک ہے۔

۱۹۱۸ء میں فرائڈ نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ زندگی میں جبلتی عنصر ارتقاء پذیر نفسی حصہ کے مرکز کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ سبھی جانتے ہیں کہ "لاشعور" کے روپ میں فرائڈ نے اسے کتنی اہمیت اور اثر کرنے والی قوت بخشی ہے۔ یہ ذہنی کارکردگی وحشیانہ ہے اور اسے جانوروں کی جبلی معلومات ایسا قرار دیا جا سکتا ہے۔

فرائڈ کے بقول دباؤ کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم پھر اسی جبلی درجہ کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ یوں انسان اس کی قیمت اعصابیت کی صورت میں ادا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

گویا گھوم پھر کر ہم پھر اپنی تہذیب کی نمایاں ترین خصوصیت دباؤ اور اظہار کے چکر میں آ پھنستے ہیں۔ ویسے یہ چکر حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ نفسی معالجین اپنے خصوصی تجربات کی بناء پر اس میں زیادہ تر اعصابی انتشار کے امکانات دیکھتے ہیں۔

یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ صحت مند عضویت میں نارمل حدود کے اندر رہ کر دباؤ اور اظہار مضر ہونے کے برعکس موجب صحت بلکہ ارتقائے زیست کے لئے ایک حد تک ناگزیر بھی ہے۔ یہ سمجھنا کہ لاشعور اگر ہمیشہ نہیں تو بالعموم ہی شعور سے دست و گریباں ملتا ہے۔ حقائق کو مسخ کر دینے کے مترادف ہے جس شخص کے شعور اور لاشعور میں ہم آہنگی نہ ہو ہم تو اسے [illegible] یہ معمول کریں گے۔ معمولی سی سوچ کے بعد ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ یہ حقیقت نہیں اس

سلسلہ میں ہم خوابوں سے رجوع کر سکتے ہیں۔ جو لاشعور کے اظہار کا سب سے اہم ترین وسیلہ ہیں نارمل لوگوں کی اکثریت نے یہ محسوس کیا ہو گا کہ خواب مستقل طور سے حالتِ بیداری کے شعوری ہیجانات اور حقائق کو کہیں زیادہ خوبصورتی اور لطافت سے پیش کرتے ہیں۔

بعض اوقات خفیہ عدم ہم آہنگی کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ لیکن شعور اور لاشعور کی زندگی میں ہم آہنگی کا سب سے نزدیں ثبوت بھی یہی خواب ہی ہیں۔ ہم بالعموم خوابوں کے سطحی پہلوؤں تک خود کو محدود رکھتے ہوئے ان کے باطنی اور اہم مواد کی اہمیت فراموش کر جاتے ہیں۔

صحت مند عضویت میں خواہ اظہار اور دباؤ کا توازن کتنا ہی موزوں اور معقول کیوں نہ ہو لیکن اس کا حصول اور مستقل برقراری خالی از مشکلات نہیں غیر صحت مند عضویت میں یہی مشکلات خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتی ہیں۔ اس کا عمومی حل ارتفاع سمجھا جاتا ہے۔ اور سو نظ کی گانٹھ سمجھتے ہوئے ہر موقع پہ اس کا نام لے دیا جاتا ہے۔

بعض اوقات یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ یہ جنسی تناؤ سے بآسانی چھٹکارا کرا دیتا ہے۔ بعض کے لئے یہ ایسا ہو گا لیکن ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بہترین قوت ارادی کے باوجود بھی اس میں ناکام رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں عضلاتی تھکن اور ذہنی کارکردگی سبھی بے سود ثابت ہو سکتے ہیں نہ ہی اساتذہ کی پسندیدہ کھیلیں اور ورزشیں جنسی کارکردگی روک سکتی ہیں۔

ہاں! انتہا پسندی سے کام لیتے ہوئے انہیں نقصان وہ حد تک اپنا لینے کی اور بات ہے بلکہ سکولوں میں تو یہ دیکھا گیا ہے کہ سب سے اچھے کھلاڑی ہی زیادہ اوباش ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟

گارنٹ کے خیال میں ہمیں جنسی جبلت اور جنسی اشتہا میں تفریق کرنی چاہیئے (اس کے خیال میں فرائیڈ نے ان کا فرق ملحوظ نہیں رکھا) جنسی جبلت جنسی تسکین کے موقع پر بیدار ہوتی ہے اور ایسے مواقع سے احتراز کرنے کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن جنسی اشتہا پھر بھی برقرار رہتی ہے کیونکہ اپنے وجود کے لئے یہ خارجی ماحول کی نہیں بلکہ داخلی تحریک کی مرہونِ منت ہوتی ہے مارسل جونز اس خیال کا اظہار یوں کرتا ہے کہ ہمیں یہاں جنس کے محدود مفہوم سے غرض نہیں بلکہ ہمیں توجہت کی تشکیل کرنے والے منفرد حیاتیاتی عناصر کا جائزہ لینا ہے۔

بالفاظ دیگر وہ مختلف النوع طفلانہ رجحانات جو بعد از ان شہوانی خواہشات اور بہت سی (غیر جنسی) دلچسپیوں کی اساس بنتے ہیں۔ یہ دلچسپی کے ایک شعبہ سے دوسرے کی طرف توانائی کی منتقلی ہے۔"

یہاں یہ امر ذہن نشین رکھنا بہت اہم ہے کہ عموماً زندگی کے ابتدائی زندگی کے حصے میں یہ مسئلہ نہیں پیدا ہوتا۔ مالنوفاتو کے بقول خصیوں کے بین رخنکی خیسے پیدائش کے فوراً بعد حالتِ سکون میں آجاتے ہیں۔ اور پھر وہ بلوغت کے بعد کارکردگی کا آغاز کرتے ہیں۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اوائل عمر میں جنسی دلچسپیوں کا کوئی سراغ مفقود ہوتا ہے۔ (اس موقع پر یہ بیان کر دیا جائے کہ ابھی تک ہم جنسی تحریک کے تمام سرچشموں سے ناواقف ہیں) عورتوں میں یہ دلچسپیاں بالعموم خفتہ یا غیر واضح صورت میں ملتی ہیں۔

بعض اوقات تو بیس برس کی عمر تک بھی یہ شدید صورت نہیں اختیار کرتیں۔ تاہم زود یا بدیر ہمیں ارتفاع کے مسئلہ سے دوچار ہونا ہے۔ بہترین ساخت والے افراد میں یہ مسئلہ کچھ زیادہ ہی نمایاں صورت اور اہمیت حاصل کر لیتا ہے

افلاطون نے محبت کو سماوی نمو والا پودہ قرار دیا تھا۔ اگر ہم اس سے یہ مراد لیں کہ پودے کی جڑیں مٹی میں پیوست ہوتی ہیں۔ اور وہ سماوی پھول لاتا ہے۔ تو اس استعارہ کی سچائی کو علمی حقائق سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہی سچائی ہے جس کا ابتدا سے ہی شاعروں کو ادراک رہا۔ اور وہ اس کے ابلاغ کی سعی کرتے رہے۔ فلوطنس کی گوشت پوست والی لڑکی تخیل میں

بیٹرس بن کر فردوس میں دانتے کی راہنمائی کرتی ہے۔ جنس کی کشش روحانی کارکردگی کے لئے جس طرح سامان تہیج مہیا کرتی ہے یہ اس عمل کی ایک مخصوص مثال ہے۔

یہ نظریہ افلاطون کی تخلیق نہ تھا۔ بلکہ نسبتاً زیادہ سائنٹیفک ذہن رکھنے والے ارسطو نے اسے سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ لیسنگ کے خیال میں تزکیہ کو "ہیجانات اور جذبات کی عمومی لحاظ سے بادصف رجحانات میں منتقلی کا عمل سمجھنا چاہیئے۔ لیکن یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ارسطو کے خیال میں "تزکیہ" سے خوف اور رحم سے وابستہ ہیجانی اخراج کی تسکین معلوم ہوتی ہے اور جیسے کہ گارنٹ کا خیال ہے۔ صرف ہیجانات کو "بہا دینے" کا نام ارتفاع نہیں ہے۔

عیسائیت کے بعد ارتفاع کا تصور ایک واضح اور ٹھوس صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس سلسلہ میں اولیں خیالات مصری صحرا کے راہب ابا میکاریوس اعظم سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ یہ رہبانیت کے ابتدائی دور میں تھا۔ اور بعض اوقات اسے عیسائیت کے اولیں علمی صوفی" کا لقب دیا جاتا ہے

ایولین انڈرہل نے اپنی کتاب (THE MY STICWAY) میں اس روحانی عمل کی نفسیاتی توضیح کی ہے۔ جب سے آتش ربانی کے زیر اثر روح کا جوہر (وہ اسے کلی طور سے غیر مادی نہیں سمجھتا) اپنی آسودگیوں سے تبدریج پاک وصاف ہوتا جاتا ہے وہ رقم طراز ہے۔ "دھات بھٹی میں ڈالنے سے اپنی فطری سختی کھو بیٹھتی ہے۔ اور جتنی دیر تک وہ بھٹی میں رہے گی۔ اتنی ہی اس میں نرمی پیدا ہوتی جائے گی"۔

یوں اذیت دینے والی آگ آسمانی نور بن جاتی ہے۔ اور میکاریوس نور اور حیات کو ایک ہی معنی میں لیتا ہے۔ یہ خیال ارتفاع کے جدید تصور کے بالکل قریب ہے۔ میکاریوس سینٹ پال کا جو مسیحی روایات کے دھارے میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ گہرا دوست تھا۔ اور یوں بعد میں آنے والے تمام مسیحی صوفیا کے ہاں اس خیال کی تکرار ہی نہیں ملتی۔ بلکہ جینوا کی سینٹ کیتھرائن کے کفارہ کے اس نظریہ کی اساس بھی اسی پر ہے جس کی رو سے کفارہ کی آگ گناہوں کا زنگ چاٹ جاتی ہے۔

بعد ازاں شاعروں نے مذہبی اثرات سے ماورا ہو کر ارتفاع کا لفظ استعمال کیا۔ اور اس کے بعد معلمین اخلاق نے یہ نظریہ اپنا لیا۔ ارتفاع پذیری سے بالعموم یہ مطلب لیا جاتا تھا کہ جوہر کی کثافتوں، ماریتوں، اور گھٹیا پن کو آگ سے تحلیل کر کے زیادہ پاک صاف اور منزہ کیا جائے۔

شاعروں اور بالخصوص سترھویں صدی کے شاعروں نے اسے انسانی روح میں وقوع پذیر ہونے والے عمل کی تفہیم کے لئے بطور علامت استعمال کیا اسی لئے تو اپنی نظم (IMORTALILY OF THE SOVLS) میں ڈیوس نے "ناقابل فہم ارتفاع سے اجسام کے ارواح بننے" کے گیت گائے ہیں۔

اسی طرح مذہبی اور غیر مذہبی نثر نگاروں نے بھی اس نظریہ کو موضوع بحث بنایا۔ مثلاً جرمی ٹیلر نے شادی کی پر تقدس ارتفاع پذیری کا تذکرہ کیا۔ ۱۷۱۱ء میں شیفٹسبری نے روحانی کیمیائی عناصر کی اعلیٰ صورتوں میں ارتفاع پذیری کو انسانیت کا اساسی اصول قرار دیا۔ اس کے بعد ۱۷۹۱ء میں پی کورک تو ارتفاع کے جدید تصور کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بقول عظمت اور توانائی کا منبع پرجوش ارتفاع ہے۔ بعد ازاں شوپنہار نے اس نظریہ کی اہمیت تسلیم کی۔

جنسی نفسیات میں "ارتفاع" کا مطلب جسمانی جنسی تحریک یا جذبے کو ذہن میں لینے کا کسی اعلیٰ نفسی کارکردگی میں یوں تبدیل کرنا ہے۔ کہ جسمانی احتیاج کی حیثیت سے اس کی شدت ختم ہو جائے۔ آج کی مقبول نفسیات میں یہ نظریہ بہت مروج ہے۔ لیکن اس نظریہ کو پسند کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ عمل "ارتفاع" اپنی سیدھی سادی ابتدائی صورت میں بھی ایک ایسا عمل ہے جو بہت زیادہ توانائی کا خرچ چاہتا ہے۔ اس کی ملاماتی اور روحانی صورت کے بارے میں زبانی باتیں تو سبھی کر

سکتے ہیں۔ لیکن اس کا حصول بے حد مشکل ہے۔ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہ جسمانی تحریکوں کی حقیقی معنوں میں نفسی تبدیلی کا نام ہے۔ اسی تبدیلی کے باعث کرخت جسمانی خواہشات اس بلند درجہ پہ جا پہنچتی ہیں جہاں ان کی شدت ایسی خواہشات کی تسکین کی صورت میں ختم ہو جاتی ہے جو جسمانی ہونے کے باوجود بلحاظ نوعیت "روحانی" ہوتی ہیں۔ یہ نفسی تبدیلی ناممکن نہ ہونے کے باوجود سہل الحصول اور فوراً وقوع پذیر ہونے والی نہیں ہوتی۔ نازک احساسات اور لچکیلے اعصاب رکھنے والے اصحاب ہی میں ارتفاع کا عمل تکمیل پا سکتا ہے۔ اس لئے ہرشفیلڈ۔ جو جنسی متزادف کی اصطلاح کو ترجیح دیتا ہے بہت محتاط الفاظ میں ارتفاع کو تسلیم کرتا ہے وہ اسے بھی نہیں مانتا۔ علم و ادب میں نسبتاً اعلیٰ فن پاروں کی تخلیق کا موجب بنتی ہے وہ تو صرف مذہبی اور سخت جسمانی مشقت کرنے والے افراد میں صحیح معنوں میں ارتفاع کو تسلیم کرتا ہے۔

فرائڈ نے ارتفاع کا نظریہ تسلیم ہی نہ کیا بلکہ اس کے خیال میں ہماری جبلتوں، بالخصوص جنس کی توانائی تہذیب و تمدن کی صورت میں ارتفاع پذیر ہوئی ہے۔ اس کے خیال میں جنسی تحریکوں میں غیر معمولی طور سے لچک پائی جاتی ہے۔ یعنی وہ ہر سانچہ میں ہی نہیں ڈھالی جا سکتیں۔ بلکہ مختلف مقاصد کے حصول کے خاطر انہیں بروئے کار بھی لایا جا سکتا ہے۔ اس کے خیال میں تمام فن کاروں میں غیر معمولی ارتفاعی قوت ملتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں تحلیل نفسی کے ذریعہ سے "ارتفاع" کی جامع اور مکمل تعریف کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی اسے دیگر مشابہہ اعمال سے متمیز بھی کیا جا رہا ہے۔ مثلاً ایڈورڈ گلوور نے اس مسئلہ پر جو طویل اور مفصل بحث کی ہے۔ اس میں مابعد النفسیات سے شغف رکھنے والے اصحاب زیادہ دلچسپی لیں گے۔ (مابعد النفسیات کو نفسیات سمجھا جا سکتا ہے) اس نے اپنی بحث سے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ گو نظریہ ارتفاع الجھنوں سے خالی نہیں اور اس ضمن میں اصول و ضوابط کا وضع کرنا بھی ممکن نہیں لیکن اس اصطلاح کے استعمال سے فائدہ اٹھانا بالکل جائز ہے۔

جہاں تک ہمارے عام اور عملی مقاصد کا تعلق ہے۔ تو بلاشبہ یہ کہا جا سکتا کہ ارتفاع کے دوران توانائی جن تغیرات سے آشنا ہوتی ہے ہم ان کی نوعیت سے بے خبر رہتے ہیں۔ یہ عمل شعور کے نہاں خوانوں میں ہوتا ہے اور تمام قوت کے باوجود بھی قوت ارادی اس عمل کی تفہیم سے ناآشنا رہتی ہے۔

ارتفاع کو غیر متبدل جنسی کارکردگی کے کسی اور راستے پر چل نکلنے یا مریضانہ علامات میں تبدیل ہو جانے سے خلط ملط کرنا چاہیئے۔ ارتفاع کا بنیادی وصف یہ ہے کہ اس صورت میں تبدیلی ارفع نوعیت کی ہوتی ہے اور تمدن کے اعلیٰ مدارج کی نشاندہی کرتی ہے۔ بتدو جنسیت میں جنسی کارکردگی کی جگہ چوری لے لیتی ہے۔ اس لئے ہم اس کے مریض میں ارتفاع تسلیم نہیں کر سکتے۔ ہم اس کے مریض میں۔ تفاع تسلیم نہیں کر سکتے۔

یہاں مثال سے وضاحت کی ضرورت نہ تھی لیکن بعض اصحاب نے اس احمقانہ خیال کا اظہار کیا تھا۔ اس لئے اس کا مسترد کرنا ضروری تھا۔

تحلیل نفسی کے بعض ماہرین نے فرائڈ کے اس خیال کو کہ تمام تہذیب لیبیڈو کا ارتفاع ہے انتہا پسندانہ صورت دے رہی ہے۔ چنانچہ سوئٹزرلینڈ کے دبستان فکر سے تعلق رکھنے والے ماہرین تحلیل (میڈر نمایاں مثال ہے) کے نظریات کی رو سے ارتفاع ایک طرح کے نفسی امتزاج کا باعث بنتا ہے۔ بلکہ وہ تو ایک لحاظ سے مذہب ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دانتے کی عظیم نظم کی مانند انسانی روح جہنم اور کفارہ کے مراحل طے کرتی ہوئی جنت میں داخل ہوتی ہے۔ اور وہ عمل کا روپ دھارتے ہوئے معالج ایک ماہتما کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اطالوی نفسی معالج اساگولی میانہ روی سے کام لیتے ہوئے بے انداز جنسی توانائی اور اس کی صحت مندانہ تسکین میں شدید رکاوٹوں کی پیدا کردہ کشمکش کے باعث معرض وجود میں آنے والے ارتفاع کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ وہ تمام اعلیٰ پایہ کی نفسی کارکردگی کا باعث محض ابتدائی نوعیت کی تحریکوں کو نہیں ٹھہراتا ہے۔

تحلیل نفسی کے بلا واسطہ علاج سے قطع نظر کرتے ہوئے اس نے خود ارتفاع کو اہم قرار دیا ہے۔ اگر گراف کی ترسیم یا سائنسی آلات کی امداد سے اسے نہیں دکھایا جا سکتا۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے اہمیت ہی نہ دیں۔ وہ بجا طور سے کہتا ہے کہ حصول ارتفاع کے لئے ہمیں اس خیال سے دست بردار ہونا پڑے گا کہ جنس بہیمانہ اور شرمناک ہے اور یوں "دباؤ" ناگزیر ہو جاتا ہے۔

جنسی اشتعال شدید ہو سکتا ہے۔ لیکن اعلیٰ ہیجانی امداد ارفع روحانی کارکردگی سے اس کا رشتہ استوار کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ اس کے خیال میں اگر دلچسپیوں کا مکمل طور سے کسی تخلیقی کام کی طرف رخ موڑ دیا جائے۔ تو یہ اور بھی سہل ہوتا ہے۔ کیونکہ فن کارانہ تخلیق کا جنسی ارتفاع کے عمل سے غیر واضح مگر گہرا رابطہ ملتا ہے۔

اساگولی کے خیال میں ویگنر کا غنائیہ TRISTAN ارتفاع کی معجزاتی مثال ہے۔ یعنی کہ موسیقار کی اپنی محبوبہ متیلڈا ویسن ڈونک کے لئے ناآسودہ محبت کی آگ اور جذباتی گرم جوشی نے اس غنائیہ کی صورت میں اظہار پایا۔

اساگولی کی امداد سے ہم ارتفاع کی پابندیوں اور قیود سے واقف ہو سکتے ہیں۔ تھرموڈائنامکس (THERMODYNAMICS) کے دوسرے قاعدہ کی رو سے کسی کام کے لئے وصول شدہ تمام حرارت مشین نہیں خرچ کرتی۔ اور نہ ہی وہ ایسا کر سکتی ہے۔ اس حرارت کا معمولی سا حصہ کام میں تبدیل ہوتا ہے۔ باقی ماندہ حرارت بے کار شے کے طور پر خارج کر دی جاتی ہے۔ ارتفاع کے معاملہ میں ہم عضویت کو قوت محرکہ رکھنے والی مشین سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ جنسی توانائی کی کچھ مقدار بے کار شے کے طور پر خارج کر دی جاتی ہے۔" اس اخراج کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ (THE DIVINE COMEDY) لکھتے وقت دانتے بھی بیوی بچوں والا تھا۔

فرائڈ نے اپنے (INTRODUCTORY LECTURES) میں درست کہا ہے کہ اوسط درجہ کے انسان کو ناآسودہ لیبیڈو کی توانائی کا معمول سا بوجھ ہی برداشت کرنا پڑتا ہے لیبیڈو کی لچک اور آزادانہ حرکت ہم سب میں یکساں نہیں ہوتی۔ ارتفاع سے لیبیڈو کا کچھ حصہ اخراج پا جاتا ہے۔ یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ بہت سے افراد میں ارتفاع کی استعداد ہی محدود ہوتی ہے۔

ہمیں ارتفاع کی استعداد ہی محدود ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں ارتفاع کے امکانات، اس کی قدر اور اس کے دور رس اثرات کو ذہن نشین رکھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ ارتفاع کے عمل میں جنسی تحریک کا کچھ حصہ باقی رہ جائے گا۔

یہ باقی ماندہ حصہ یا تو صحت مندانہ مگر نسبتاً بھونڈے طریقوں سے آسودگی پائے گا۔ ورنہ پھر یہ نیوراتی منتقل کے راستہ پر نکلے گا۔

فریڈرک ڈبلیو گڈریچ رونیرا

فطری وضع حمل

سترھویں صدی سے قبل صرف عورت ہی دائی بن سکتی تھی اور مرد معالجین کا وضع حمل کے وقت عورت کے پاس جانا ناپسندیدہ ہی نہ تھا۔ بلکہ قانونی لحاظ سے ممنوع بھی تھا۔ چنانچہ (DEVILS DRUGS AND —) میں ہاورڈ ہیگرڈ نے ہمبرگ کے ڈاکٹر ورٹ کا واقعہ

بیان کیا ہے جسے ۱۵۲۲ء میں زنانہ بھیس بدل کر وضع حمل دیکھنے کی پاداش میں زندہ جلا دیا گیا تھا۔ یہ کوئی ایک صدی کی بات ہے کہ وضع حمل کے لئے مرد معالجین کا وجود تسلیم کیا گیا۔ جب مرد معالجین کی اہمیت تسلیم کر لی گئی تو وہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے تمام معالجین بچہ کی پیدائش سے وابستہ جسمانی پہلوؤں میں بہتری کی طرف توجہ کرتے ہوئے ماں اور بچہ کی کے لئے خطرات میں کمی اور ان کی بہبود میں اضافہ کے لئے سعی کناں ہو گئے۔ ان کی یہ سعی کس حد تک کامیاب ہوئی اس کا اندازہ موجودہ دور کے ان اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب بچہ پیدا کرنا کار میں سیر اتنا بھی خطرناک نہیں رہا اب یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ بچہ پیدا کرنے والی عمر کو پہنچ جانے کے بعد عورت کے لئے بچہ پیدا کرنا بہت زیادہ ہی صحت مند ہے۔

گو بچہ کی پیدائش محفوظ سے محفوظ تر بنانے کے لئے اکثر کوششیں ایک حد تک بار آور ہوئی ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں بچہ کی پیدائش سے وابستہ کیفیات خاص میں صرف حال ہی میں اضافہ کیا جا سکا ہے۔ ورنہ تو یہ تمام عمل درد و تکلیف سے مملو ہوتا تھا۔ اب بھی عورتوں کی اکثریت کے لئے حمل تکلیف اور بے آرامی کے مسلسل نو ماہ کے مترادف ہے جس کا اختتام بچہ کی پیدائش کی صورت میں ایک ایسے تجربہ پر ہوتا ہے جو اپنی بہتر صورت میں بے حد ناگوار اور بدتر صورت میں کرب و اذیت دہ ہوتا ہے۔ گو عورتیں ہمیشہ بچوں کی طلب گار ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قیام حمل سے لے کر پیدائش تک کے وقفہ کا تصور ان کے لئے سوہان روح ہوتا ہے۔ اس فن نے گذشتہ بیس برس میں جو ترقی کی اس سے اب عورتوں کے لئے حمل اور پیدائش زندگی کو معانی عطا کرنے والا آسودگی بخش تجربہ بن سکتا ہے۔

اب پیدائش کا ایک اور ہی انداز سے جائزہ لیا جاتا ہے اس کے آغاز کنندہ ڈاکٹر گرانٹلے ڈک ریڈ نے اسے فطری وضع حمل کا نام دیا ہے۔ اسے مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ عورت کو بچہ کی پیدائش کے لئے ذہنی، جسمانی اور ہیجانی لحاظ سے اس حد تک تیار کیا جائے کہ وہ اس ضمن میں اپنی امکانی قوتوں سے باخبر ہو جائے جب اس میں یہ شعور بیدار ہو گیا تو اس کے لئے بچہ کی پیدائش ایک پر لطف عمل بن جائے گا۔

رات کے ۲ بجے ہوں گے جب مسز ولیم جانسن پشت کے شدید درد سے جاگ گئی۔ پشت کے درد کے ساتھ ہی اس نے شدید قسم کی اینٹھن محسوس کی جو اس کی پشت سے شروع ہو کر پیٹ کے بالائی حصہ تک پھیل ہوئی تھی۔ اس کے دل میں جوش سا پیدا ہو رہا تھا۔ اس نے لال بتی جلا کر گھڑی دیکھی اور وقت یاد کر لیا۔ اس کا خاوند بتی جلنے پر جاگے بغیر منہ ہی میں کچھ بڑبڑایا۔ مسز جانسن نے چند لمحات کو دل ہی دل میں خاوند کو جگانے یا نہ جگانے کے بارے میں سوچا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ درد زہ ہے۔ یہ اس کا پہلا حمل تھا اس لئے وہ وثوق سے کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی۔

بچہ کی پیدائش کی متوقع تاریخ گزرے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اسے اس پر خاصی کوفت بھی ہوئی تھی۔ اس لئے اب اسے درد زہ کی ہی امید تھی۔ لیکن ساتھ ہی تکلیف اور اذیت کے تصور سے اس کا دل قدرے دہشت زدہ بھی ہو رہا تھا۔

گذشتہ ۹ ماہ سے مسز جانسن بچہ کی پیدائش کے دن کی منتظر تھی جب اسے اپنے حاملہ ہونے کا پتہ چلا تو اس کے احساسات ملے جلے تھے۔ دونوں میاں بیوی نے کئی مرتبہ اپنے کنبہ کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا تھا۔ ان کا اس پر اتفاق تھا کہ ان کا کنبہ تین بچوں پر مشتمل ہو۔ وہ بچوں کی پیدائش میں طویل وقفوں کے بھی قائل نہ تھے۔ لیکن جب شادی کے چھ ماہ بعد اسے ماہواری نہ آئی تو وہ اس پر کوئی خاص خوش نہ تھی۔ پہلی وجہ تو یہی تھی کہ ابھی تک حمل کے بارے میں یقیناً کچھ نہ کہا جا سکتا تھا۔ اس نے اپنی ایک بے تکلف سہیلی سے جو ایک بچہ کی ماں بھی تھی۔ جب ذکر کیا تو اس نے بتایا کہ اگر وہ حاملہ ہوئی تو شاید اسے مرض سحر بھی ہو۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ایک ہفتہ بعد ہی صبح اٹھتے ہی ہلکی گرانی اور متلی شروع ہو جاتی۔ اب اس نے اپنے ڈاکٹر سے ملاقات کا وقت طے کیا۔ ڈاکٹر ہی معائنہ نے اس کے شکوک کی تصدیق کر دی۔

ڈاکٹر کی دکان سے واپسی پر اس کے احساسات ملے جلے تھے۔ حاملہ ہونے پر وہ دل میں خوش تو تھی لیکن ساتھ ہی تشویش اور اندیشے بھی تھے۔ ابھی تو اس کی اور بل کی ابھی شادی ہوئے ماہ ہی تو ہوئے تھے۔ میاں بیوی کے لحاظ سے ان کا مکان ٹھیک تھا لیکن جب وہ بچے کے لئے ایک علیحدہ کمرہ کا تصور کرتی تو یہ مکان سکڑ کر بالکل چھوٹا سا ہو جاتا۔ گو بل کی آمدنی اکثر احباب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ معقول تھی لیکن نہ تو وہ پس انداز کر سکتے تھے۔ اور نہ ہی زندگی کی تمام آسائشات مہیا کرنے پر قادر تھی۔ وہ جانتی تھی۔ کہ بچہ کی پرورش کے لئے کافی سے زیادہ روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی ایک سہیلی نے ایک مرتبہ اسے ہنستے ہوئے بتایا تھا "صرف پیدائش ہی پر خرچ نہیں ہوتا۔ بلکہ پرورش بھی خرچ ہی خرچ ہے۔" وہ اس لئے بھی پریشان تھی کہ بچہ کی آمد کا بل پر کیا اثر ہوتا ہے۔"

اب اس کا طرز عمل کیا صورت اختیار کرے گا اب تک تو ان کی زندگی بڑے مزے سے گزری تھی۔ ان کی زندگی بڑے مزے سے گزری تھی۔ لیکن اب وہ دونوں کنبہ کے ایک تیسرے رکن کے ساتھ بندھے ہوں گے۔ پھر اسے ایملی کا خیال آیا جو بچوں کی پیدائش سے پہلے ان کے حلقہ میں سب سے زیادہ حسین اور شوخ تھی۔ لیکن اب ایملی کا جسم ایک گندہ بغل بی اور میری کا اسی پر اتفاق تھا کہ ایملی کا ہر وقت اپنے بچوں کا تذکرہ کرتے رہنا اب بوریت بن چکا ہے۔ کیا اس کی قسمت میں بھی ایملی بننا ہے۔ اور کیا بل بھی اس سے اکتا جائے گا۔ وہ خود کو مجبوس سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اور بل بڑے شوق سے حاملہ ہونے کا انتظار کر رہے تھے لیکن اب اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اور حاملہ ہونے کا تصور کوئی ایسا پسندیدہ اور مرغوب خاطر نہ رہا تھا۔

جب شام کو بل نے یہ خبر سن کر بے پایاں مسرت کا اظہار کیا تو میری کے سینہ سے ایک حد تک بوجھ ہٹ گیا اور وہ اپنے شکوک وقتی طور پر بھول گئی جب اس نے یہ خبر اپنی ماں کو سنائی تو اس کے ذہن میں کچھ نئے خیالات پیدا ہوئے اس کی ماں نے حیرت اور مسرت کے اولیں اظہار کے بعد اپنے تجربات سنانے شروع کئے جو بہت تکلیف دہ اور مشکل ثابت ہوئے تھے۔

دوران حمل اس کے ڈاکٹر نے اس کی بہت زیادہ دیکھ بھال کی۔ اس کی متنوع تکالیف کا وہ بغور مطالعہ کرتا۔ اسے طرح طرح کی گولیاں کھانی پڑتیں۔ اس کے کنبہ والے وہ سہیلیاں اس پر رشک کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دلجوئی کے لئے ہر ممکن کوشش سے دریغ نہ کرتیں۔

میری نے محسوس کیا کہ اس کی احباب اس ضمن میں خیر خواہوں کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اہمیت دے رہی تھیں۔ اور یہ تو اب ممکن تھا کہ وہ سہیلیاں مل بیٹھیں اور گفتگو کا رخ بچہ کی پیدائش کی طرف نہ مڑے۔ وہ ان سب سے پیدائش کے واقعات کا تذکرہ کئی کئی مرتبہ سن چکی تھی اور سبھی اسے اپنے اپنے زمانہ حمل کی تفصیلات سنا چکی تھیں۔ وہ میری کی بہت دلجوئی کرتیں لہذا اسے حمل کے امور سے آگاہ کرتی رہتی۔

مثلاً اسے اپنے ہاتھ سر سے اونچے نہ لے جانے چاہئیں۔ کیونکہ اس سے بچہ کی نالی اس کی گردن کو لپیٹ کر خطرناک نتائج کا باعث بن سکتی تھی۔

اکثر اوقات میری کا ذہن ان ہدایات کے غیر منطقی پہلو کی طرف جاتا۔ وہ وہ ہمیشہ ڈاکٹر سے استفسار کا ارادہ کرتی۔ لیکن جب وہ اس کی دکان پر جاتی تو وہاں اس قدر بھیڑ دیکھتی کہ اسے احمقانہ ثابت ہونے والے سوالات پوچھنے میں جھجک ہوتی۔ ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ جب کبھی بھی وہ اسے دیکھتا تو وہ اسے بتاتا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ وہ یہی بات معلوم کرنے کی خواہاں تھی۔

حمل کے تیسرے ماہ میں اس نے اخبار میں ماؤں کے لئے مخصوص جماعتوں کے اجراء کا حال پڑھا پہلے پہل اس نے اپنا نام وہاں درج کرنے کا سوچا لیکن جدوجہد اس ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنایا۔ اس نے

وہ کئی نئی کتابوں کا تھوڑا سا مطالعہ کیا اور ڈاکٹر نے بھی اسے حمل ہدایات پر مشتمل ایک پمفلٹ دے رکھا تھا اور اس سے وہ مطمئن تھی پھر سے یہ بھی خیال آیا کہ شاید یہ جماعتیں پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی بہبود کے لئے جاری کی گئی ہیں۔

اب جبکہ وہ بستر پر لیٹی تھی اور اینٹھن لہروں کی صورت میں ہو رہی تھی۔ تو اچانک اسے اپنی ایک سہیلی کا واقعہ یاد آیا جسے پانچ پانچ منٹ کے بعد درد اٹھتا تھا۔ وہ جب ہسپتال گئی تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر واپس کر کے بھیج دیا کہ یہ پیدائش والے درد نہیں ہیں۔ اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسے یہ کیسے علم ہو سکتا ہے کہ یہ درد اصل ہے یا نہیں۔ وہ اپنے ڈاکٹر کو بلانا چاہتی تھی۔ لیکن ابھی تو تین ہی بجے تھے۔

دن بھر کام سے چھوڑا رکھ کر اس وقت بستر سے اٹھانا اسے اچھا نہ لگا۔ ڈاکٹر نے اسے کہہ رکھا تھا کہ اگر مسلسل درد ہو، خون آئے، یا پانی بہے، تو وہ اسے فوراً بلا لے۔ وہ اٹھ کر غسل خانے میں گئی تو وہ آخری دو علامات میں سے کسی کے بھی آثار نہ تھے۔ ویسے وہ پورے وثوق سے کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ اب وہ صرف خوف زدہ ہی نہ تھی بلکہ اسے اپنی حالت پر ترس بھی آ رہا تھا۔ اس نے معذرت خواہانہ انداز سے بل کو جگایا۔ اور جب اس نے جاگ کر اس سے بھی زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تو اسے کچھ سکون ہوا۔ کچھ دیر کے بعد بل نے اسے ڈاکٹر کو فون کرنے پر رضامند کر لیا۔ ڈاکٹر کی آواز تشویش سے عاری تھی۔ اور وہ بڑے اطمینان سے بات کر رہا تھا۔ اس نے اسے دردوں کا وقفہ گنتے ہوئے بتایا کہ اگر ہر دس منٹ بعد درد ہو تو اسے ہسپتال چلے جانا چاہیے۔

ایک گھنٹہ بعد دردوں کا وقفہ یہی تھا۔ اور ان کی تکلیف اور شدت میں اضافہ ہو گیا تھا میری اب ہسپتال جانے کو تیار تھی۔ اس نے واپس بھیج دیئے جانے کا خدشہ دل سے نکال دیا تھا اب تو عورتوں کے وہ تمام واقعات اور خیالات کی خبریں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں جن میں ٹیکسی اور ہسپتال کی سیڑھیوں میں ہی بچہ کی پیدائش ہو گئی تھی۔ غالباً بل کے ذہن میں بھی ایسے ہی واقعات ہوں گے۔ کیونکہ وہ خلاف معمول بہت تیزی سے کار چلا رہا تھا۔ میری راستہ بھر تکلیف میں مبتلا رہی۔ اب درد کی شدت ناقابل برداشت تھی۔ اس نے تو یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ اس معاملہ میں بچہ نہ بنے گی اور بل کو اپنی تکلیف کا اندازہ نہ ہونے دے گی۔ لیکن درد نے تمام ارادے ختم کرا دیئے۔

بل اور میری کبھی بھی ہسپتال نہ آئے تھے اس لئے انہیں صحیح دروازہ کی تلاش میں خاصی دیر لگی۔ سب سے پہلے وہ ایک مقفل دروازے پر پہنچے۔ بل نے زور زور سے دستک دیتے ہوئے دروازہ کھلوانے کے لئے چلا چلا کر آوازیں دیں۔ مگر جب بات نہ بنی تو اگلے دروازہ پر آئے خوش قسمتی سے یہ کھلا تھا۔ وہاں انہیں ایک مردم بیزار کلرک ملا جس کے انداز و اطوار یہ ظاہر کر رہے تھے۔ کہ انہیں بے تکے وقت آنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ میری کی درد سے بہت بری حالت تھی۔ اور کلرک تھا کہ مسلسل احمقانہ قسم کے سوالات پوچھے جا رہا تھا۔ میری کہاں پیدا ہوئی۔ بل کہاں پیدا ہوا۔ وغیرہ وغیرہ حتیٰ کہ میری کی حالت ناقابل برداشت ہو گئی۔ کلرک نے بل سے ایک خاصی لمبی چوڑی رقم جمع کرانے کا مطالبہ کیا۔ اب بل گھبرا گیا کیونکہ میری کی تکلیف کی وجہ سے اس نے جس افراتفری میں لباس تبدیل کیا۔ تو وہ جیب میں بٹوا ڈالنا بھول گیا۔ اب اس بور کلرک کی مدد ایک نرس نے کی۔ اس نے بڑے سکون کا اظہار کیا۔ اور میری کو پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر ہال کی طرف لے چلی۔ اچانک ہی میری کو احساس ہوا کہ اب بل اس کے ساتھ نہ تھا۔ اس کے استفسار پر نرس نے اسے بتایا کہ بچہ کی پیدائش تک تمام مرد باہر انتظار کرتے ہیں۔ ساتھ ہی نرس نے اسے پریشان نہ ہونے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ خاوند ہمیشہ مزے سے بچ جاتے ہیں۔ یہ شاید کوئی لطیفہ تھا۔ کیونکہ نرس خود ہی مسکرا دی۔

ایسے محسوس ہوتا تھا کہ برآمدوں اور لفٹوں والا یہ سفر کبھی ختم نہ ہو گا۔ لیکن اچانک ہی یہ سفر ختم ہوا۔ اور اب میری پیدائش والی جگہ پر تھی۔ جہاں اسے ایک اور نرس کے حوالے کیا گیا جو بہت جلدی میں معلوم ہوتی تھی۔

میری کو مسز جانسن کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ اس نئی نرس نے اس کے دردوں کا دریافت کیا۔ اور کیا واقعی زیادہ تکلیف تھی۔ درد واقعی تکلیف دہ تھے۔ لیکن میری انہیں تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ نہ ہی وہ انہیں دردوں کے وقفہ کے متعلق کچھ بتا سکی۔ کیونکہ اسے گھڑی دیکھے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ نرس نے اسے ایک اور کمرہ میں لے جا کر کپڑے اتار دینے کو کہا اب بالکل ہی غیر متوقع قسم کا سلسلہ چھڑ گیا۔ وہاں کئی نرسیں تھیں جن کی مہارت میں کوئی شک نہ تھا۔ اور سبھی غیر شخصی انداز سے اس کا معائنہ کر رہی تھیں۔

بعض اوقات نرسیں اس کے بارے میں یوں گفتگو کرتیں۔ گویا وہ وہاں موجود ہی نہ تھی۔ ویسے میری بھی خود کو غائب ہی سمجھ رہی تھی۔ اس کا معائنہ کیا گیا۔ کیونکہ اس کی گفتگو میں طبی اصطلاحات اس کے لئے ناقابل فہم تھیں۔ اس کا معائنہ کیا گیا۔ تو میری سوچ رہی تھی کہ کیا وہ ٹھیک ٹھاک ہے مگر کسی نے اسے بتانے کی ضرورت نہ محسوس کی جب اس نے پوچھا کہ کیا ڈاکٹر کو اس کی موجودگی کا علم ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ اسے اطلاع پہنچا دی گئی تھی۔ اس نے کچھ گولیاں کھانے اور بوقت ضرورت انجکشن لگانے کو کہا ہے۔

میری بے آرام اور بے چین ہونے کے ساتھ ساتھ خوفزدہ بھی تھی۔ ایک نرس نے اسے بتایا کہ ابھی پیدائش کا وقت دور ہے اس لئے ابھی گولیاں دکھانا بہتر ہوگا۔ اس بات کے بعد وہ سب چلی گئیں۔ اور میری اب تنہا تھی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی درد ناقابل برداشت ہو گیا۔ جیسے ہی درد کی لہر شدید ہوتی وہ پلنگ کے سرے کو مضبوطی سے پکڑ لیتی اسے ہر دم یہی محسوس ہوتا کہ اس درد کے ساتھ بچہ پیدا ہو جائے گا۔ میری کے ذہن میں اب یہ خیال جاگزیں ہو گیا۔ کہ ضرور کوئی نہ کوئی خرابی ہے جسے وہ نہیں جاگزیں ہو گیا کہ ضرور کوئی نہ کوئی خرابی ہے۔ جسے نرسیں اس سے چھپا رہی ہیں! پھر وہ ڈاکٹر کے بارے میں سوچنے لگی کہ وہ کیسے وقت پر پہنچ سکے گا۔ جب اسے اپنی حالت مایوس کن نظر آنے لگی۔ تو اس نے گھنٹی بجا کر نرس کو بلایا جب وہ آئی تو اس نے انجکشن یا گولیوں کے لئے اسے کہا۔ جلد ہی اس کے ذہن پر دھند چھانے لگی۔ اور آنکھیں بند ہونے سے قبل میری کو ہال کے آخری سرے پر ایک کراہتی ہوئی عورت یاد تھی۔

جب اس کی دوبارہ آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک عجیب و غریب کمرہ میں پایا اسے جسم کے کچھ حصے دکھتے اور سوجے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اعضا شکنی تھی۔ اس کے ساتھ کیا کچھ بیتا اب اس کا یاد کرنا مشکل تھا۔ اسے دماغ ماؤف سا محسوس ہوتا تھا۔ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا مبہم سا احساس تھا۔ بہت تیز روشنی۔ بہت زیادہ درد۔ اور ایک آواز کہہ رہی تھی۔ سانس نیچے لو۔ سانس اوپر لو، سانس نیچے لو۔ سانس اوپر لو!

اس نے تنگ آ کر یہ سب کچھ سوچنا بند کر دیا۔ اور اپنے سر کے قریب ایک گھنٹی دبا دی فوراً ہی شگفتہ مسکراہٹ لئے ایک نرس آئی۔ مسز جانسن مبارک! بیٹا! اس کا وزن سات پونڈ اور تین اونس ہے میری کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلنے لگے۔ "دوبارہ کبھی نہیں!" لیکن فوراً ہی اسے یہ احساس ہوا کہ بحیثیت ماں اس سے کچھ اور کی توقع ہے۔

چنانچہ اس نے حسب حال کچھ کہا اور ساتھ ہی اس کے دماغ پر پھر وہی دھند سی چھا گئی۔ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں نہیں بلکہ اذیت و تکلیف کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

جب جون گرین حاملہ ہوئی تو اس کے حالات میری سے مختلف نہ تھے۔ چند ماہ کی شادی، مختصر سا گھر، خاوند کی تنخواہ پر بمشکل گزارہ، بچوں کی خواہش اور اچھے مستقبل کی تمنا! اس کا فوری ردعمل بھی کچھ میری ایسا ہی تھا۔ لیکن ثانوی ردعمل اسے یہ احساس ہوا کہ وہ جس حالت میں ہے۔ اس کے

تعاقوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے وہ کچھ بھی تو نہیں جانتی۔ اس نے جب سکول اور کالج کی تعلیم کا سوچا تو اس کے نصاب میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے وہ اپنے کلیدی کردار کی ادائیگی کے بارے میں جان سکتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے حیاتیات اور حفظان صحت کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن عمل کے نقطۂ نظر سے ان میں سے ایک چیز بھی عملی اہمیت نہ رکھتی تھی اسے ہر صبح بیمار ہوجانے پر حیرت تھی۔ اور وہ اپنے جسم کے اندرونی تغیرات کے بارے میں حصول معلومات کی خواہاں تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ ڈاکٹر کے پاس گئی تو مصروفیت کی وجہ سے اس کے لاتعداد کیا، کیوں اور کیسے پر مشتمل سوالات کے جوابات نہ دے سکا۔

گھر واپس آنے وقت وہ لائبریری میں رک گئی۔ جہاں اس نے ماں بچے اور حمل وغیرہ پر بہت سی کتابیں دیکھیں۔ اس نے ایک کتاب لی اور گھر آکر وہ اس کے دو باب ختم کر چکی تھی کہ بوب بھی یہ اہم ترین خبر سننے کو آپہنچا۔

اس کتاب نے اس کی بہت سی الجھنوں کو رفع کر دیا۔ اب اسے ڈاکٹری معائنہ کی اکثر باتوں کی بھی سمجھ آگئی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ کتاب نے اس پر سوچ کے آفاق بھی روشن کر دیئے تھے۔ پھر اس نے اپنی خوراک کی طرف توجہ دی اور یوں ایک اور کتاب زیر مطالعہ آئی۔ اب بوب بھی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے یہ بھی کتاب پڑھی اور دونوں آپس میں تبادلہ خیالات کرتے رہے جب وہ دوبارہ ڈاکٹر کے پاس گئی تو اب وہ ڈاکٹر کی باتوں اور معائنہ میں ایک ذہین انسان ایسی دلچسپی لے رہی تھی۔

کتاب نے بعض امور کے بارے میں مطمئن نہ کیا تھا۔ چنانچہ اس نے ڈاکٹر سے سوالات کئے اور ڈاکٹر کے جوابات نے انہیں اور بھی واضح کر دیا۔

جب بوب اور وہ ایک پارٹی میں گئے تو وہاں اس نے اپنی سہیلیوں کو یہ خبر سنائی۔ دن تمام ہونے تک اس کی سہیلیاں بہت سی باتیں سنا چکی تھیں۔

ایک نے بتایا کہ حمل میں دل کی جلن بچے کے گھنے بالوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ توہم پرستی ہے۔ مگر اپنے اخلاقاً اس کی تردید نہ کی۔ کیونکہ یہ سہیلی خود دو بچے پیدا کر چکی تھی۔ اور ایک پارٹی اور اتھارٹی کی حیثیت سے بات کر رہی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس نے ایسی بہت سی داستانیں سنیں۔ ایک دو موقعوں پر تو یہ اس وثوق اور اعتماد سے سنائی گئیں کہ اسے اپنی کتاب سے (جسے اس نے خرید لیا تھا۔) رجوع کر کے ان کے جھوٹ ہونے کے بیان کو یقین میں تبدیل کرنا پڑا۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ نرسنگ ایسوسی ایشن نے ماؤں کے لئے خصوصی جماعتوں کا بندوبست کر رکھا ہے۔ تو اس نے اپنا نام درج کرا کے بڑے شوق سے وہاں جانا شروع کیا۔ اسے حیرت تھی کہ ابھی تک حصول معلومات کی گنجائش تھی وہ جو کچھ سیکھ کر آتی۔

بوب کو بھی بتاتی اور بالآخر بوب نے پوچھا کہ آخر باپ بننے والے مردوں کے لئے ایسی جماعتیں کیوں نہیں شروع کی گئیں۔ جون کے خیال میں یہ ایک معقول سوال تھا۔ چنانچہ اس نے ایک مرتبہ نرس سے استفسار کیا۔ اس پر بہت سی عورتوں نے بھی اس کی تائید کی۔ چنانچہ نرسوں نے مردوں کے لئے بھی جماعت کے اجراء کا وعدہ کر لیا۔

ان جماعتوں کا ایک مقصد تو عورتوں کو ایسی ورزشیں سکھانا تھا۔ جن سے وہ ان عضلات کا استعمال سیکھ لیا جنہیں مدت مدید سے کام میں نہ لایا گیا تھا۔ نرس نے بتایا کہ یہ ورزشیں حمل و پیدائش کے وقت بھی کی جاسکتی ہیں۔ اور ہر دو مواقع میں یہ فائدہ کا باعث بنیں گے۔

کالج کے زمانہ سے ہی جون کو ورزشوں سے نفرت تھی۔ لیکن یہ ورزشیں بہت ... تھیں اور گھر کے کام کاج کے دوران انہیں بوجھ بنائے بغیر بھی کیا جاسکتا تھا۔ ان سے اسے فائدہ بھی بہت ہوا۔ کیونکہ حمل کے دوران میں اسے کمر دکھنے کی بہت کم شکایت ہوئی جب کہ ... تمام سہیلیاں کمر دکھنے کا رونا روتی رہتیں۔

ان کے معلم نے بوب اور جون سے کہا کہ بچہ کی پیدائش سے قبل ہی ہسپتال جا کر مالی امور طے کر لینے چاہئیں۔ چنانچہ وہ ہسپتال گئے، اپنی اپنی "سوانح عمریاں" لکھوائیں، زچہ وارڈ کی بعض نرسوں سے ملاقات کی اور یہ پتہ کر لیا کہ جب وہ عظیم دن آئے تو انہیں کس دروازہ سے آنا چاہئے خوش قسمتی سے انہوں نے وہ کمرے بھی دیکھ لئے جہاں درد زہ میں مبتلا عورتیں رکھی جاتی تھیں اور پھر جہاں پیدائش ہوتی تھی۔ اور پھر جہاں پیدائش ہوتی تھی۔ یہ کمرے اس کی سہیلیوں کی باتوں کے برعکس اذیت گھر نہ تھے۔ جون نے یہ سب کچھ اپنی جماعت میں سنایا اس پر باقی عورتوں نے کہا کہ کیوں نہ سبھی ہسپتال کے زچہ خانہ کا ایک چکر لگا لیں اس کا بھی بندوبست کر لیا گیا۔ گو اس کے لئے کچھ دوڑ دھوپ کی ضرورت پیش آئی کیونکہ شروع شروع میں ہسپتال والے کچھ مشکوک تھے

جب بچہ کی پیدائش کا وقت آیا تو جون آئندہ لمحات سے عہدہ برا ہونے کے لئے پر اعتماد تھی۔ ورزشیں اس کے لئے پرلطف تھیں۔ ادھر درد زہ اور حمل کے بارے میں اسے معقول معلومات حاصل تھیں۔ اسے سستانے کا طریقہ بھی آتا تھا۔ بلکہ اسے خود بھی اپنی معلومات کی وسعت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ جب ایک رات کو ایک بجے وہ جاگی تو اسے پشت کے درد اور بہت سی بے آہنگ حسیات کا شعور ہوا۔ یہ اینٹھن ایسی تھی۔ مگر یہ کوئی ایسی تکلیف دہ نہ تھی۔ جب بالآخر ہر دس منٹ کے بعد درد کی لہر اٹھنے لگی۔ تو اس نے بوب کو جگایا۔ اس وقت تک یہ باقاعدہ اینٹھن بن چکی تھی۔ لیکن اگر آپ نے جون سے پوچھا ہوتا۔ جیسے کہ بوب نے پوچھا تو اس نے یہی جواب دیا کہ ان کی تکلیف اتنی شدید نہیں جب دونوں ہسپتال جا رہے تھے۔ تو جون پرجوش تھی۔ یہ جوش اس وجہ سے تھا کہ انتظار ختم ہوا اور کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے جب وہ ہسپتال پہنچے تو کلرک نے پہلے سے تیار شدہ کارڈ ان کے حوالے کیا۔ جو نرس پہیوں والی کرسی پر اسے لینے آئی وہ ان نرسوں میں سے ایک تھی جن سے وہ پہلے مل چکی تھی۔ اور یوں ایک آشنا چہرہ اس کے لئے باعث مسرت بن گیا۔

بوب ان کے ساتھ پیدائش والے کمرہ تک گیا۔ جب جون کپڑے اتار رہی تھی تو بوب کمرہ انتظار میں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد تمام عمل دہرایا گیا۔ جس کے بارے میں جون پہلے سے ہی جانتی تھی بوب اب پھر تھوڑی دیر کے لئے اس کے کمرہ میں اس کے پاس گیا۔ جون درد کی ہر اینٹھن کے ساتھ سستانے لگی۔ اور وہ اس پر حیران تھی۔ کہ یوں سستانے سے درد میں ایک حد تک کمی اور آرام محسوس ہوتا۔ بطور تجربہ درد کی ایک لہر آنے پر وہ نہ سستائی اور اسے بہت تکلیف محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر بھی آگیا جس نے آکر معائنہ کر کے اسے صورت حال سے باخبر کیا۔ گو وہ طبی اصطلاحات استعمال کر رہا تھا۔ لیکن وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ وہ بڑی شاد تھی۔ کہ اس معاملہ میں اس سے تعاون کا سلوک کیا جا رہا تھا۔

جب ڈاکٹر دوبارہ آیا تو اب جون کے لئے اینٹھن میں سستاہٹ مشکل ہو چکی تھی۔ اس نے وہ درد کو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ محسوس کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے سکون اور سستاہٹ کے لئے کچھ ادویات تجویز کیں۔ جن سے وہ پھر افاقہ محسوس کرنے لگی۔ لیکن جلد ہی درد کی لہروں میں تیزی پیدا ہو گئی۔ اور اب جون سمجھ گئی کہ درد زہ کا ایک مرحلہ ختم ہونے کو ہے۔

ڈاکٹر نے بھی اس کے خیال کی تصدیق کی اور اسے اس کمرہ میں لے گئے۔ جسے وہ پہلے دیکھ چکی تھی۔ نرس نے اسے گیس دینی چاہی مگر جون کا دل نہ مانا۔ جب ڈاکٹر کے کہنے پر اس نے نیچے کی طرف بوجھ ڈالنا شروع کیا۔ تو اس نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا۔

کچھ دیر بعد ہی اسے ایک بوجھ کا احساس ہوا۔ اس نے گیس کے لئے کہا اور اب درد کی ہر لہر کے ساتھ ہی اس کے منہ کو گیس ماسک لگا دیا جاتا۔

ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ پیدائش میں سہولت کے لئے تھوڑا سا شگاف کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس نے پہلے ان مقامات کو سن کر دیا۔ اس لئے جون کو کچھ بھی نہ محسوس ہوا۔ بلکہ جب اس نے

شگاف کر کے جون کو بتایا تو وہ حیران ہو کر رہ گئی۔

اگلے چند منٹوں میں وہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ اس کو درد سے چھٹکارے کا احساس ہوا اور بچہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ اچانک ہی اس کا بچہ ڈاکٹر کے ہاتھوں میں تھا۔ جون کے ہیجانات میں ایک عجیب تموج اور ابھار تھا وہ اٹھ کر بچے کو اپنے ساتھ لپٹانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے سرہانے والی نرس نے اسے روکا کیونکہ چادریں جراثیم کش تھیں۔

جب ڈاکٹر نے بچہ اس کے پیٹ پر لٹایا تو وہ زور سے چیخا۔ جون نے ڈاکٹر کو نال کاٹتے دیکھا۔ اب بچہ کو پالنے میں لٹا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک مرتبہ پھر زور لگانے کو کہا اور اس نے اندر سے آنول نلی کا اخراج محسوس کیا۔ جب ڈاکٹر کے رگے شگاف میں ٹانکے لگا رہا تھا۔ تو وہ بچہ کو تلتے اور صاف ہوتے دیکھ رہی تھی۔ وہ قدرے حیران تھی۔ کہ بچہ بہت خوبصورت اور پیارا لگ رہا تھا کیونکہ اس کی ایک سہیلی کے بقول نوزائیدہ بچہ بدصورت ہوتا ہے۔ اور اس کے جسم پر جھریاں سی پڑی ہوتی ہیں۔ جب شگاف میں ٹانکے لگ گئے اور جون کو مزید پھیرنا نجس لبی کرنے کی اجازت مل گئی۔ تو نرس بچہ کا پالنا اس کے قریب لائی اور اسے اس کی گود میں دے دیا۔

بعدازاں اسے اور بچہ کو جب باہر لایا گیا اور وہ لوب کی طرف جا رہے تھے۔ تو ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ یہ کوئی فاتحانہ جلوس ہے۔ وہ خود بھی نشہ فتح سے سرشار تھی۔ اس نے بچہ کی پیدائش میں ہر ممکن امداد اور تعاون کیا تھا۔

اگر آپ نے جون سے اس وقت یا کمرہ پیدائش میں پوچھا ہوتا کہ وہ کیسے محسوس کر رہی ہے تو اس کا جواب ہوتا۔ بہت اعلیٰ اور یہی نہیں بلکہ وہ اس تجربہ کے اعادہ کے لئے بھی تیار ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ دوسری مرتبہ لڑکے کے لئے بہن پیدا ہو۔

میری جانسن اور جون گرین کے واقعات خفیقی نہیں نہ ہی اوسط۔ عورتوں کا وضع حمل اسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ نہ تو ہر عورت اوسط عورت ہوتی ہے۔ اور نہ ہی اوسط نوعیت کا وضع حمل، طبی سائنس نے اس مفروضہ سے کام لے کر خاصی الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ ان دو عورتوں کی یہ داستان کل حاملہ عورتوں کے بیانات اور ان کی دیکھ بھال کرنے والوں میں سے کچھ کے مشاہدات پر مشتمل مجموعی تصویر ہے۔ ان دونوں داستانوں میں اساسی نوعیت کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ یہ فرق کیسا ہے اور اس کی کیا وجوہات ہیں۔ ؟ آیئے ہم اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کریں۔

سطحی لحاظ سے اس بات کا باعث ان دونوں کی مختلف شخصیتوں اور طبائع میں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ یا شاید جون زیادہ ذہین بلکہ رجائیت پسند ہوتے ہوئے زندگی کے تاباں پہلو پر نظر رکھتی تھی۔ لیکن یہ کوئی معقول وجہ نہیں کیونکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ بہت سی ذہین عورتوں نے بھی میری کی مانند تکلیف سے بچے پیدا کئے۔ لیکن ذرا گہری نگاہ سے جائزہ لینے پر واضح ہو جاتا ہے کہ میری کے مقابلہ میں جون نے حمل کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے مخصوص تربیت حاصل کی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دوران حمل میری کو طبی امداد میسر تھی۔ اور ایک جدید قسم کے ہسپتال میں بہترین ساز و سامان کے ساتھ اس کا بچہ پیدا ہوا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ بلحاظ ساخت حیاتیاتی لحاظ سے ہی عورتیں بچے پیدا کرنے کے لئے موزوں ہیں۔ تو پھر انہیں اس مقصد کے لئے کسی تیاری یا تربیت کی کیا ضرورت ہے ؟

یہ بالکل درست ہے کہ ان کی جسمانی ساخت بچوں کی پیدائش کے لئے بہت موزوں ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ وظائف خود بخود ہی مکمل ہوتے رہتے ہیں۔ حمل اور پیدائش کے ضمن میں دیگر اعضاء کے علاوہ، بعض عضلات کی کارکردگی کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس جدید دور میں عورتوں کی زندگی جس نہج پر گزر رہی ہے۔ اس کے باعث وہ ان عضلات کو استعمال نہیں کرتیں۔

علاوہ ازیں کیونکہ جسم کو ذہنی اثرات سے آزاد نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے عمل سے وابستہ تمام ذہنی اور ہیجانی عوامل بھی تولیدی کردار کی ادائیگی میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں عورتیں کیونکہ تولید کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اس لئے فطرت اس مقصد کے لئے انہیں بعض امدادی ذرائع بھی بخشتی ہے۔ لیکن ان امدادی ذرائع سے پورا کام نہیں لیا جاتا۔ آپ ایک لمحہ کے لئے ایک کھلاڑی دوڑنے والے کی مثال لیں۔ وہ دوڑ کے لئے مدتوں پہلے مخصوص تربیت سے اپنے عضلات کی نشو و نما کرتا ہے۔ تاکہ بوقت ضرورت وہ اعلیٰ ترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں ایک دوڑ جیتنے کے لئے صرف جسمانی مستعدی ناکافی ثابت ہوئی ہے۔ ملاحظہ وہ بہتر دوڑ کی تیاری میں خود کو ذہنی لحاظ سے بھی تیار کرتا ہے۔ اس لئے میدان میں آتے ہی اسے امید ہوتی ہے۔ کہ وہ جسمانی، ذہنی اور ہیجانی لحاظ سے اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر سکے گا۔

یہ مثال اس لئے اور بھی پرمعنی ہو جاتی ہے کہ وضع حمل کے ایک ممتاز انگریز ماہر ڈاکٹر کیتھلین دان نے وضع حمل پر اپنے مضمون کا عنوان یہ رکھا تھا۔

"CHILDBIRTH AS AN ATHLETIC EVENT"

جب یہ واضح ہو گیا کہ جسمانی صلاحیتوں میں مشق اور تربیت سے اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ تو کیا ذہنی اور ہیجانی لحاظ سے ایسا ہونا ممکن نہیں ؟ اس لحاظ سے جدید عورت خاصے نقصان میں رہتی ہے۔ یہ امر جون اور میری کی داستانوں سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ انہیں پیدائش کے لئے ذہنی لحاظ سے تیار نہ کیا گیا تھا۔ گو دونوں کالج کی تعلیم یافتہ تھیں مگر پیدائش کے لئے عملی امداد دینے والی کوئی بات بھی نہ بتائی گئی تھی۔ یہ تو صرف گذشتہ چند سالوں کی بات ہے۔ کہ لڑکوں لڑکیوں کو کسی طرح کی جنسی تعلیم دینے کا آغاز کیا گیا۔ اور یہ بھی صرف چند علاقوں تک محدود ہے۔

یہ حقیقت تعجب خیز ہے اس کا امکان ہی نہیں بلکہ یہ اغلب ہے کہ ثانوی تعلیم کے بعد بھی بچے اپنے جسمانی وظائف کے بارے میں لاعلم ہوتے ہیں۔ اور یہ اس ملک کی حالت ہے جو اپنے نظام تعلیم کے لئے خاص شہرہ رکھتا ہے۔ اور جہاں تعلیم میں طلباء کی مستقبل کی زندگی کے لئے تیاری پر زور دیا جاتا ہے۔

اس حقیقت سے صرف سماجی علوم کے ماہر حیران نہ ہوں گے۔ کیونکہ علم اور اس کی عملی تطبیق کے درمیان جو تمدنی بعد پایا جاتا ہے۔ دیگر لوگوں کے مقابلہ میں وہ اس سے کہیں زیادہ آگاہ ہیں لڑکیوں کو تولید کے سلسلہ میں تعلیم نہیں دی جاتی اس لئے وہ اپنی ماؤں سے رجوع کرتی ہیں جو اپنی محدود معلومات کی بنا پر اچھی راہنما نہیں ثابت ہو سکتیں۔ وہ اپنی سہیلیوں سے تبادلہ خیالات کرتی ہیں۔ جن کی اپنی معلومات عوامی کہانیوں اور روایات پر مبنی ہوتی ہیں۔

یہ تمام داستانیں محض اس بنا پر صحیح تسلیم کی جاتی ہیں کہ ان کی تکذیب کے لئے کسی کے پاس ٹھوس اور علمی مواد نہیں ہوتا۔ اس کی صداقت پر شک کرنے والے حضرات کو اس زر کثیر کا خیال کرنا چاہیئے۔ جو ہر سال ادویات پر خرچ ہوتا ہے۔ اخباروں اور رسالوں میں نت نئی بیماریاں اور ان کے لئے نت نئی دواؤں کے اشتہارات چھپتے رہتے ہیں۔ فرد کو اپنے جسم کی کارکردگی اور وظائف کے بارے میں کیونکہ برائے نام سی معلومات ہیں۔ اس لئے وہ باآسانی نیم حکیموں، اشتہاروں اور توہمات کے چکر میں پھنس جاتا ہے۔

پیدائش کے ضمن میں جاہلانہ اور توہمانہ خیالات اس لئے اور بھی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں کہ یہ اس روایتی طرز عمل کے مظہر ہیں جو نسلاً بہ نسلاً منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ روایتی طور سے بچہ کی پیدائش "درد زہ" ہے جس کا مطلب ویبسٹر کی ڈکشنری کی رو سے یہ ہے۔

۱۔ صعوبت، بالخصوص، تکلیف دہ کوشش یا مشقت

۲۔ زچگی۔ دردِ وضع حمل۔

۳۔ اذیت، عذاب ناک درد۔

ایسی عورتوں کی کمی نہیں جو دردِ زہ کی اس تعریف پر صاد کہیں گی۔ اور یہ عورتیں اپنی جگہ پر بالکل درست ہوں گی لیکن اب ایسا ہونا ضروری نہیں رہا۔ دراصل کم عمری سے ہی لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کے کانوں میں اہلِ خانہ سہیلیاں، ریڈیو اخبارات یہ سب کچھ پھونکتے رہتے ہیں۔ نتیجہ خوف اور دہشت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اب ہم اس مسئلہ کے متنازعہ پہلو تک آ پہنچے ہیں۔

بعض دیگر اصحاب کی مانند میرا دعویٰ نہیں کہ دردِ زہ ذہن ہی کا مرہونِ منت ہے۔ میں تو یہاں پر اس حقیقت کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں روایات تمدنی نظریات اور پیدائش کے بارے میں تشویشناک سوچ، سبھی عوامل کارفرما ہیں۔

سوال یہ ہے کہ لاعلمی اور خوف کا پیدائش سے کیا تعلق؟ اس کے جواب میں آپ سے یہ دریافت کروں گا کیا آپ کسی ایسے وقت کا تصور کر سکتے ہیں۔ جب آپ خوفزدہ تھے۔

شاید آپ کو کسی تنہا مکان میں رات بسر کرنی پڑی ہو۔ آپ کے کمرے کو چھوڑ کر باقی سارا مکان تاریکی میں ڈوبا ہے۔ اچانک ہی ملحق والے کمرہ سے آپ ایک غیر متوقع قسم کی آواز سنتے ہیں۔ اور خوف آپ پر فوراً غلبہ پا لیتا ہے۔ دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو جاتا ہے اور چہرہ پر سرخی کی لہر بھی دوڑ سکتی ہے۔ اگر اس وقت آپ کسی آئینہ میں شکل دیکھیں۔ تو آنکھوں کی پتلیاں خوف سے پھیلی ہوئی پائیں گی۔ ہو سکتا ہے جلد پر جھریاں سی بھی پڑ جائیں، رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ معدہ میں گرانی اور دل ڈوبنے کی سی کیفیت محسوس ہو گی۔ یہ تمام کیفیات خوف کی پیدا کردہ ہیں۔ جو بعض غدودوں اور اعصابی کارکردگی کے باعث ان تمام عضوی اثرات کا اجراء کرتا ہے۔

بالآخر آپ اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہیں۔ تو یہ معلوم کر کے اطمینان ہوتا ہے کہ وہ تو بلی نے دودھ کا برتن گرا دیا تھا۔ کونے میں کوڑا اچھلا دگر پڑا تھا یا ایسی ہی اور کوئی معمولی سی بات تھی۔ اب آپ خوف کی وجہ سے لاعلم نہیں اس لئے بتدریج یہ عضوی اثرات ختم ہوتے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد ہی آپ بالکل نارمل ہو جاتی ہیں۔

یہ مثال صرف اس نکتہ کی وضاحت کے لئے بیان کی گئی ہے۔ کہ خوف کیسے جسمانی وظائف میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر اس سے وابستہ ردعمل کے تعین میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس مضمون کو پڑھنے والی بہت سی خواتین یہ کہہ اٹھیں گی۔ میں پیدائش سے خوف زدہ نہ تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے خاصی تکلیف اٹھائی۔ بھلا اس کی وضاحت کیسے ہو گی؟ بلاشبہ ایسی پیدائش سے خوف زدہ نہ ہونے والی عورتیں بھی موجود ہیں۔ میرے خیال میں یہ فرض کر لینا خلافِ عقل نہ ہو گا۔ کہ ہمارے تمدن کا پیدا کردہ روایتی اندازِ نظر خوف پر مبنی ہے۔ اس لئے بہت سی عورتیں شعوری آگاہی کے بغیر بھی پیدائش سے خوف زدہ ہو سکتی ہیں۔

تحلیل نفسی کے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ ایسی عورتیں گو اپنے خوف دبا دیتی ہیں لیکن تحت الشعور میں موجود تشویش غیر شعوری خوف ہی کی مانند عضوی اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مجھے مکمل یقین ہے۔ کہ ہر بچہ پیدا کرانے والے نے ایسی عورتیں ضرور دیکھی ہوں گی۔ جنہوں نے زمانۂ حمل میں یہی کہا کہ ہم خوف زدہ نہیں لیکن جب وقت آیا تو وہ سخت ہراساں پائی گئیں۔

دراصل ان عورتوں میں دباؤ کا عمل متحرک ملتا ہے۔ یہ عمل شعوری نہیں ہوتا۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے۔ کہ عورت اور وہ بھی حاملہ ہونے کے باعث ان کا شعور خوفزدہ کرنے والی حقیقت تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس خوفناک موقع سے راہِ فرار بھی مسدود ہے اس لئے صورت حال سے عارضی مطابقت کے لئے وہ اس خوف کو تحت الشعور میں دھکیل دیتی ہیں۔ لیکن جب پیدائش کا مرحلہ آتا ہے تو تحت الشعور کی تشویش عضوی لحاظ سے کارکردگی کا مظاہرہ شروع کر دیتی ہے۔ ایک پیچیدہ ذہنی عمل کو سیدھے سادے طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے بعض خواتین کی ذہنی کیفیت کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک مرتبہ پھر یہ واضح کر دوں کہ تمام حاملہ عورتوں کی حالت ایسی ہوتی۔ بعض حضرات کے خیال میں بہت سی یا اکثر عورتیں ایسی ہیں جن کے ذہن میں تولید سے کسی قسم کا خوف بھی وابستہ نہیں ملتا۔ نہ ہی وہ اس خوف کی تمدنی اساس کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن میں ایسے حضرات کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ دردِ زہ کی دوری کے لئے گولیوں کی ایجاد کے بعد سے ہر طبقہ میں وہ ڈاکٹر زیادہ اور معقول سمجھا جاتا ہے جو درد کی دوری کے لئے جدید ترین، در مکمل ترین طریقے استعمال کرتا ہو۔ پیدائش سے وابستہ اور کوئی خدشہ بھی ہو تو کم از کم ایک ۔ اور خالص انسانی خوف تو ضرور ہی ملتا ہے۔ اور وہ ہے درد کا خوف!

یہ ہے وہ پس منظر جس کے تحت عورتوں کی اکثریت مادریت کی طرف رجوع کرتی ہے۔ جضوری استعداد سے بے خبر یہ عورتیں ذہنی لاعلمی کے باعث ہیجانی اندیشوں میں گھری ملتی ہے۔ یہ تھی میری جانسن کی حالت! اس کے برعکس جون گرین بھی اس پس منظر کی پروردہ تھی۔ لیکن اس نے پیدائش کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے اپنے جسم کو ہر ممکن طریقہ سے بروئے کار لانے کی کوشش کی یعنی پیدائش کے بارے میں ممکن الحصول ذرائع سے معلومات حاصل کیں۔ اس سے خوف کے خاتمے کے ساتھ ساتھ اس میں ایک نئے اعتماد نے بھی جنم لیا۔ کیا جون کے لئے اس تمام سعی کی ضرورت تھی؟ کیا اس کے لئے یہ زیادہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جا کر یوں گویا ہوتی۔ "میں پیدائش اور وضع حمل کے بارے میں کچھ نہیں جاننا چاہتی۔ میں حاملہ ہوں اور احتیاطی تدابیر اور دیکھ بھال کے لئے میں صرف آپ پر انحصار کر رہی ہوں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ دورانِ حمل مختلف تکلیفوں کا علاج معالجہ ہوتا رہے۔

میرے خیال میں وضع حمل بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک ہے اس لئے اگر مجھے زیادہ سے زیادہ بے خبر رکھا جائے۔ تو میں مشکور رہوں گی۔ یا پھر کم از کم بچے اور مجھے۔ نقصان نہ پہنچنے والی حد تک ضرور ہی لاعلم رکھا جائے۔"

یہ انداز اکثر عورتوں میں ملتا ہے۔ عورتوں کی اکثریت کے بموجب اگر پیدائش اور وضع حمل اتنا ہی تکلیف دہ اور ناگوار ہے۔ تو اسے منطقی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے غیر منطقی ثابت کرنے کے لئے کئی وجوہات ہیں۔ اوّل۔ حمل کا عرصہ نو ماہ پر محیط ہوتا ہے اور اس تمام مدت میں اس سے لاعلم رہنا ناممکن ہے۔ اگر مناسب طریقہ سے خود کو حمل کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے تیار کیا جائے۔ تو بہت سی تکلیفوں اور بے آرامیوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ جن عورتوں نے اس کے لئے خود کو تیار کیا۔ انہوں نے بعد میں بتایا کہ انہوں نے زندگی بھر خود کو اتنا بہتر محسوس نہ کیا تھا۔ دوم۔ اگر نیندیاں پیدا کرنے والی شروع سے ہی استعمال نہ کی جائیں۔ تو عمل پیدائش کا کچھ مرحلہ زیادہ تکلیف اور درد کا باعث ہو گا۔
یہ ابتدائی عمل پیدائش کا کچھ مرحلہ زیادہ تکلیف اور درد کا باعث ہو گا۔ اور یہ ابتدائی مرحلہ ہو گا۔ جو کہ عام حالات میں باعث پریشانی نہیں بنتا۔

سوئم۔ درد میں کمی کے لئے جسم سن کرنے اور ادویات کے بجز نہ استعمال ہے کیونکہ جسم کے نارمل کرمو آلہ میں کچھ تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے وضع حمل کے بعد انہیں نارمل اور صحت مند حالت پر آنے میں نسبتاً زیادہ دیر لگے۔ جن عورتوں کے اپریشن ہوئے یا وضع حمل کے وقت جسم سن کئے گئے تھے۔ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں اسے سمجھ سکتی ہیں۔ بالفاظ دیگر کسی معمولی سے اپریشن کے لئے آپ یا آپ کا ڈاکٹر جسم سن کر کے کسی وسیع عمل کی ضرورت نہ محسوس کرے گا۔ مثلاً اگر آپ کی کھوپڑی پر کسی چوٹ وغیرہ سے کوئی زخم ہو تو اسے کھرچ کر صاف کرنے کے لئے وہ بے ہوش کرنے کی ضرورت نہ محسوس کرتے ہوئے ایک ایسا انجکشن لگا دے گا جس سے زخم کے ارد گرد کے حصے سن ہو جائیں گے۔

چہارم۔ ذہنی لحاظ سے تیار عورتوں کے لئے پیدائش اور حمل کا تجربہ بے حد آسودگی بخش ثابت ہوتا ہے۔ اگر پیش آنے والے سفر کو آپ تکلیف دہ اور بے آرام کرنے والا محسوس کرتی ہوں۔ تو آپ لازماً دورانِ سفر سونا پسند کریں گی۔ لیکن اس کے برعکس اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سفر ناگوار نہیں۔ اور اس کی بے آرامی شدید نہیں بلکہ محض عارضی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ ــ اس تجربہ کے گمبھیر اثرات زندگی کو ایک نئی آسودگی بخشیں گے۔ تو کیا پھر بھی آپ سونا پسند کریں گی یا جاگتے ہوئے اس تجربہ کی ایک ایک پہلو اور

اثر کو زندگی میں سرایت کرنے کو کوشاں ہوں گی؟ پہلے سے تیاری کے باعث وضع حمل کے عمل میں تعاون سے برابر کا حصہ لینے والی عورتیں پورے طور سے اس کی حامی ملیں گی

اس مضمون کو پڑھنے والے میری اور جون کے وضع حمل میں یوں تفریق پیدا کر سکتی ہیں۔ "بعض اطبا پر ہے۔ جون کی وضع حمل فطری تھی جب کہ میری کی ایسی نہ ہو سکی۔۔" اس جملے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

فطری وضع حمل کی اصطلاح نامناسب سی ہے۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے ماں اور باپ ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر بھی الجھنوں میں مبتلا رہے ہیں۔ اس سے اکثریت کے ذہن میں غیر متمدن معاشرہ کی ایک ایسی عورت کی تصویر آتی ہے جو اپنے جھونپڑے میں یا باہر جھاڑیوں کے پاس بچہ جن رہی ہے۔ یا اگر اپنے ملک کا سوچیں تو عورت گھر یا ہسپتال میں ڈاکٹر کی امداد کے بغیر خود ہی بچہ پیدا کرتی ہے وضع حمل کے بہت سے ممتاز ماہرین نے اس سلسلہ میں یہ تند احتجاج کیا ہے کہ فطری حمل کے اصول ترقی کی طرف لے جانے کی بجائے ایک قدم پیچھے کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس کے محرک اور مؤید اچھے خاصے مجرم بن جاتے ہیں۔ کوئی بھی قابل ذکر ڈاکٹر وضع حمل کے لئے دورِ جدید سے قبل کے طریق کار کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ نہ دے گا۔ گذشتہ نصف صدی میں علم الولادت نے بے انتہا اور قابل رشک ترقی کی ہے۔ اس عرصہ میں ... یہ قسم کی تکنیک سے کام لیتے ہوئے ہزاروں ماؤں اور بچوں کی زندگیوں کے چراغ گل ہونے سے بچائے جا چکے ہیں۔ وضع حمل کے علم اور فن کے یہ دو مقاصد بیان کئے جا سکتے ہیں۔ صحت مند ماں اور بچے اور مسرور ماں اور بچہ! ان مقاصد کے حصول کے لئے ماؤں کے لئے وضع حمل کا محفوظ اور آرام دہ ہونا لازمی ہے ماں کی شدید تکلیف اس مقصد کی تکذیب کر دیتی ہے۔ اگر بچہ یا ماں کے لئے وہ زیادہ نقصان دہ ثابت ہوں تو درد میں کمی کے لئے ایسی ادویات کا ایک حد تک استعمال واجب ہے۔ بگڑی حالت سنوارنے کے لئے جدید تکنیک سے کام لینا لازمی ہے۔ اگر ناخوشگوار صورت حالات پیدا ہوتی ہے۔ تو اس کے لئے ناتیار شدہ اور ہراساں قسم کی لڑکی کی بجائے پہلے سے تیار شدہ، اور سمجھدار ماں نسبتاً زیادہ بہتر طور سے تمام معاملہ سمجھ کر اپنی صلاحیتوں کے مطابق ڈاکٹروں سے تعاون کر سکتی ہے۔

اس سارے مضمون میں یہ فلسفیانہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ زندگی عورت کو جس گمبھیر تجربہ سے روشناس کراتی ہے۔ اس کے لئے اسے پہلے سے تیار ہونا چاہیئے۔ اگر ہر عورت خود کو حمل اور وضع حمل کے لئے تیار کر لے تو بچہ کی پیدائش اسے جو تسکین اور آسودگی دے گی وہ اس کی سعی کا نعم البدل ثابت ہو گی۔

اور یہی میری اور جون کے تجربات کا فرق تھا۔ یہ مثالیں انتہا پسندانہ — سفید اور سیاہ — ہیں۔ لیکن ان دونوں انتہاؤں کے درمیان خاصہ تنوع ملتا ہے۔ جون کے درد دور کرنے کے لئے کتنی گیس استعمال کی — یہ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اصل بات تو یہ ہے کہ اس نے خود کو جسمانی، ذہنی اور ہیجانی لحاظ سے کیونکہ اس مرحلہ کے لئے تیار کر رکھا تھا اس لئے وہ خود بھی وضع حمل میں متحرک کردار ادا کرتی ہے۔ اگر جون کو کم یا زیادہ طبی امداد ملی ہوتی پھر بھی اس کا تجربہ ایسا ہی آسودگی بخش ہوتا۔ اگر ایک ماں خود کو تیار کرتی ہے۔ تو خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے اس کے لئے اپنی تیاری پر کوفت یا بحیثیت ماں کبھی بھی اپنی استعداد اور صلاحیتوں پر ندامت محسوس کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو گی۔ بچہ کی پیدائش اعلیٰ ترین کارگزاری ہے اور اس کے لئے تیاری کا یہ مطلب ہو گا۔ کہ اس کارگزاری کے تمام امکانی پہلوؤں کو احاطہ میں لے لیا گیا ہے۔

تھریسے بینڈک

ماتا

اگر اولاد اور توسیع نسل سے وابستہ عادات رسوم و رواجات اور قواعد و ضوابط کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی بنا عضویاتی احتیاجات اور سماجی اثرات کے پیچیدہ اور باہمی اثر انداز عوامل پر استوار ملے گی۔ تحلیل نفسی کی تحقیقات نے اب بچہ اور والدین کے مابین ان مسلسل مدارج کی نشان دہی کر دی ہے۔ جن کے ذریعہ فرد اپنی شخصیت کو سماجی معاییر کے سانچہ میں ڈھال کر جنسی احتیاجات اور ان کے وظائف پر حاوی عضویاتی اعمال کو ان سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہیجانی پختگی کے حصول تک فرد جنسی احتیاجات کی تسکین اور تمدنی مطالبات کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی پیدا کر چکا ہوتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ ہمارے معاشرہ کی نسبت — جس میں نشوونما کی معراج انتہائی انفرادیت سمجھی جاتی ہو سادہ اور کم پیچیدہ معاشروں میں ہم آہنگی اور مفاہمت نسبتاً آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ نسائی تولیدی وظائف لڑکی میں نسبتاً زیادہ پیچیدہ اور مختلف النوع تقاضوں کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر نسائی شخصیت کی خواہشات اور تمناؤں کی مادریت کے ساتھ چپقلش ظہور پذیر ہو کر تولیدی وظائف پر اثر انداز ہو تو یہ اثر اندازی مرد کی نسبت عورت کی صورت میں زیادہ اہمیت اور معنویت اختیار کر جائے گی۔

جنسی پختگی یعنی تولیدی وظائف کی تکمیل کے لئے عضوی تکمیل ایک تدریجی عمل ہے۔ گو عنفوانِ شباب سے جنسی پختگی کی عضویاتی علامات کا ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن جنسی آلات میں پختگی کئی سالوں بعد آتی ہے۔ یہ دونوں جنسوں پر صادق آتا ہے حیونیات منویہ کی پیدائش سے پہلے لڑکے میں ایستادگی اور انزال شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کی اکثریت میں آغاز حیض کے باوجود ان کی بیضہ دانیاں بختہ بیضہ نہیں پیدا کر سکتیں۔ اسی طرح بچہ دانی ابھی حمل کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے پختگی اختیار نہیں کر پاتی۔ کہ حیض شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ وقوعہ ظہور میں آتا ہے۔ جسے عنفوانِ شباب کے عقم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وقوعہ لازماً انسانی نشوونما کا خاصہ نہیں۔ یعنی یہ اصطلاح تمدنی عوامل کی پیدا کردہ تعویق اور نشوونما میں رکاوٹ کی نشاندہی نہیں کرتی۔ بلکہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ تمام ذوات الثدی ہی کے عمل نشوونما میں اس وقوعہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۴۳ء میں ینگ اور یرکیس نے بندروں کی ذہین ترین نسل یعنی چمپانزی کے بارے میں جو مواد اکٹھا کیا اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جنسی نشوونما اور پختگی کے لئے انسانی مادہ اور بندریا ایک ایسے مدارج طے کرتی ہیں۔ رہی انسانی نشوونما تو ظاہر ہے کہ اس وقوعہ کا ان ہی معاشروں میں علم ہو سکتا تھا۔ جہاں عنفوانِ شباب میں نر اور مادہ کا آزادانہ جنسی ملاپ ہوتا ہو۔ جیسا کہ ٹروبرینڈرز میں[2]۔ جب ان لوگوں کی کوئی لڑکی حاملہ ہوتی۔ اور بعض اوقات تو آغاز حیض کے کئی سال بعد ایسا ہوتا۔ تو شادی کی رسم سے اس کی سماجی حیثیت تسلیم کر لی جاتی ہے۔ اب وہ ہر طرح کے کھیل کھیلنے والی لڑکی بالی نہیں رہ جاتی۔ بلکہ معاشرتی قوانین کی رو سے اب اس کی جگہ ماؤں میں بنتی ہے۔ یہاں کوئی بچہ ناجائز نہیں نہ یہاں مانگے اور بن مانگے بچوں کا مسئلہ ہے۔ وہاں کی نوجوان ماں اپنے طرزِ عمل اور طور طریقوں میں کوئی شعوری تبدیلی محسوس کئے بغیر ماں سے سیکھے ہوئے مادریت کے روایتی تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے۔

عنفوانِ شباب کے عقم کی اصطلاح تولیدی کردار سے وابستہ عضویاتی پختگی کے وقت اور ہم آہنگی میں نمایاں فرق کی نشان دہی کرتی ہے جتنا کہ یہ اس صورت میں بجا صحیح ہے جب فرد کی نشوونما میں جنسی پابندیوں کی پیدا کردہ نفسیاتی الجھنیں رکاوٹ نہ بھی ڈالتی ہوں۔[1]

---

[1] اس سلسلہ میں فراہم کردہ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ "دورِ خفتگی" کے فقدان کے باعث عضویاتی پختگی کا جلد عمل تکمیل نہیں پاتا۔

[2] ٹروبرینڈرز کی مثال ایسی ہی ہے۔

ہمارے معاشرہ میں فرد کو نفسی جنسی پختگی کے لئے جو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس سے ہم آشنا ہیں اس لئے ذہن میں فوراً یہ خیال آتا ہے کہ فرد کی شخصیت میں فوق الانا (والدیت اور تمدن سے وابستہ امتناعات) کی تشکیل کرنے والے عوامل ہی لازماً تولیدی سے وابستہ عضویاتی پختگی میں تاخیر پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کا باہمی رابطہ اتنا سیدھا سادہ نہیں۔

یہ درست ہے کہ ہیجانی امتناعات کے ہاتھوں عضویاتی پختگی کا عمل معرض التوا میں پڑ جاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے سب کے لئے کلیہ بنا کر یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ جتنے قوی امتناعات ہوں گے جنسی پختگی میں اتنی ہی زیادہ تاخیر ہو گی۔ اس ضمن میں جسمانی ساخت کے بنیادی اثرات فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ کیونکہ ہیجانی عوامل کی شدت کا ان ہی پر انحصار ہوتا ہے۔ اگر جنسی پختگی کی تمام متنوع صورتوں کو ایک سلسلہ کی صورت میں مرتب کیا جائے تو ایک انتہا پر وہ مثالیں ہوں گی جہاں ہیجانی عوامل مستقلاً جنسی پختگی میں رکاوٹ ڈال دیتے ہیں۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان جنسی وظائف کے توازن اور ہم آہنگی کے مختلف مدارج کی متنوع صورتوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اعمالی خلل، جنسی ردعمل کے مختلف انداز، زرخیزی اور مادریت — ان مدارج میں سے چند کے نام ہیں۔ اگر فرد کی شخصیت کے ارتقا کی روشنی میں جنسی گردش کا مطالعہ کیا جائے تو یہ پیچیدہ عمل بھی واضح ہو جاتا ہے۔

نسائی تولیدی کردار کے دو پہلوؤں — ہم بستری اور حمل — کی صورتوں میں بیضہ دانیاں دو طرح کے ہارمون پیدا کرتی ہیں۔ ایسٹروجینز جو بیضہ کی پختگی کے لئے تہیج کا کام کرتا ہے۔ اور پروجیسٹیرز جو بار آور بیضہ کے لئے بچہ دانی کو تیار کرتے ہوئے حمل کی تقویت کا باعث بنتا ہے۔ جس طرح ایک زلزلہ پیما زمین کے اندرونی تغیرات سے ہمیں واقف کراتا ہے، اسی طرح نفسی آلات کیمیائی اور کیفیاتی عضوی تغیرات سے روشناس کراتے ہیں۔ بیضہ دانیاں جو ہارمون پیدا کرتی ہیں۔ وہ حیاتیاتی مقاصد کی تکمیل کے لئے متعلقہ ہیجانات کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ ایسٹروجن کے اثرات ہیجانات میں مخالف جنسیت کا متحرک رجحان پیدا کرتے ہیں۔ یہ اختلاط کے لئے ضروری ہے۔ پروجیسٹرون کے اثرات کے باعث ہیجانات عورت کے اپنے جسم اور اس کی بہبود پر مرکوز ہو جاتے ہیں۔ ہارمونی کارکردگی ایک گردش کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ لیکن چار سے چھ دنوں پر مشتمل پروجیسٹرونی دور حالت التوا کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ دور سکون ہے۔ مخالف جنسیت پر مبنی تمام خواہشات نے جن احساسات کا لبادہ اوڑھا ہوتا ہے۔ انہیں مادریت کے تیاری کے لئے لازم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ویسے یہ ہیجانات کیوں کہ باقاعدگی سے قبولی رجحانات کے زیر اثر آتے رہتے ہیں اس لئے نتیجہ کی صورت میں نفسی توانائی کا مرکز اپنی ذات بن جاتی ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ مادریت کے لئے تیار کروانے والے اور بھی کئی واضح قسم کے عوامل مل سکتے ہیں۔ عمر، نشو و نما سے وابستہ المحتبیں، ہیجانی پختگی کی سطح ان کے ساتھ ہی خارجی حالات بھی ہیں۔ یہ سب عوامل مل کر نسائی شخصیت کو اس درجہ پر لاتے ہیں جہاں مادریت کے لئے تیاری کا اظہار خواہش حمل، خوف حمل یا گریز حمل کی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح مادریت اور بچے کی نگہداشت سے متعلقہ ہیجانات کی شدت میں بھی مختلف عورتوں میں عمر کے مختلف ادوار میں کمی بیشی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

عورت عمر کے ایک دور میں (جب وہ بچہ تھی) اپنی ماں کی توجہ اور نگہداشت کی بھوکی ہوتی ہے لیکن وہی عورت عمر کے دوسرے دور میں نگہداشت کے لئے خود بچوں کی متمنی ہوتی ہے۔ جب قرار حمل نہیں ہوتا تو پروجیسٹرون کی تیاری میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ قبل حیض ہارمونی کارکردگی زیریں سطح پر ہوتی ہے۔ اس لئے تمام عضویاتی تیاری کے رائیگاں جانے کی صورت میں ہیجانات کا نا امیدوں کا مشاہدہ اور ان سے وابستہ بیم و رجا کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ مادریت سے وابستہ ہیجانات یا تشویشوں میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد نا امیدی یا حیض ظہور پذیر ہوتا ہے۔

آغاز حیض سے لے کر اختتام حیض تک عورت ماہانہ گردش کے ساتھ تولیدی کردار کی بجا آوری کے لئے تیار ہوتی رہتی ہے۔ ادھر ایک حیض سے دوسرے حیض تک جنسی گردش میں اوسطاً معمولی سی تبدیلی ہوتی ہے۔ اسی طرح حیض کی مدت اور وقفے اور بیضیں میں بھی برائے نام تغیرات ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم تحلیل نفسی کی خوردبین میں سے اس کا تجزیہ کریں اور ہیل کے دھبوں کو دیکھیں تو حقائق کچھ اور ہی نظر آتے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام عورتوں میں جنسی گردش یکساں نوعیت کی نہیں ہوتی۔ صرف یہی نہیں کہ یہ جنسی گردش جداگانہ نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار نسائی شخصیت کی تشکیل کرنے والے عوامل پر بھی ہوتا ہے۔ جنسی گردش بھی متحرک اور توانا عناصر کے ایک سلسلہ پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر عنصر دوسرے کے لئے محرک ثابت ہوتے ہوئے اس کے انداز کو متعین کرے گا۔

جس طرح مولداتی گردش کے ارتقا میں ایسٹروجن کی پیدائش بیضین کی تکمیل اور بعد میں پروجیسٹرون والے دور کے لئے لازمی ہے۔ اسی طرح نفسی جنسی پختگی کے لئے مخالف جنسیت پر مبنی محبت عورت کو نسوانی کردار کی بجا آوری کے لئے تیار کرتی ہے۔ اسی جذبہ کے تحت وہ پیدائش کے لئے لازم عضویاتی اعمال اور مادریت کے ہیجانی مظاہر پر بھی قادر ہوتی ہے۔

جنسی گردش کا مطالعہ مندرجہ ذیل حقائق واضح کرتا ہے۔

ا۔ ہارمون بعض مخصوص ہیجانات کے لئے سامان تہیج بہم پہنچاتے ہیں۔

ب۔ نسائی شخصیت کا جن نفسیاتی عوامل پر انحصار ہوتا ہے وہی ہارمونی کارکردگی کے انداز کا تعین کرتے ہیں۔

ج۔ نفسیاتی اور ہارمونی کارکردگی ایک دوسرے پر اثر کرتی رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنسی گردش بلحاظ نوعیت دائمی اور ناقابل تغیر نہیں ہوتی۔ جنسی محرکات یا شخصیت کے دیگر تقاضوں (دانائی محرکات) سے متاثرہ ہیجانات ہارمونی اعمال پر متضاد نوعیت کے اثرات بھی ڈال سکتے ہیں ان سے جنسی گردش میں تغیرات — تیزی یا سستی — پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی اور بھی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔

اب یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سطحی مطالعہ سے بظاہر "جنسی کردار" افزائش نسل یعنی جنسیت کے حیاتیاتی معانی سے آزاد اور لاتعلق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر واضح ہو جاتا ہے کہ انسانی مادہ اور ثرادت الثدی کی مادہ میں جنس کے جسمانی پہلو آزاد اور لاتعلق نہیں۔ بلکہ یہ اس سے کہیں زیادہ نازک اور پیچیدہ معاملہ ہے۔ انسانی شخصیت اور عضویاتی عوامل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لئے عورتوں میں جنسی کردار واضح اور آشکار کردار نہیں بلکہ اس کی تشکیل میں تولیدی وظائف سے وابستہ داخلی نفسی کشمکش کے پیدا کردہ خوف، تشویش اور دیگر تمام علامات بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس لئے بالغ لڑکیوں میں ہر ہارمونی گردش سے وابستہ، ہیجانات اور نیوراتی عورتوں کے تجزیہ میں الجھنوں، کشمکش اور خوف سے دوچار ہونا ہمارے لئے باعث تعجب نہیں ہوتا۔ جب کہ پختہ اور صحت مند عورتوں میں عموماً اس تسکین اور پختہ ارادوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جنہیں ہارمونی کارکردگی کے ساتھ نفسی مطابقت جنم دیتی ہے۔

مولداتی ہارمونوں اور ان کے لئے مخصوص نفسی ردعمل کو نفسی جسمانی اکائی کا نام دیا جا سکتا ہے یہ امر ذہن نشین رہے کہ ہارمون فوری ہیجانی ردعمل ہی نہیں پیدا کرتے بلکہ ہیجانات ہارمونی پیدائش پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ گویا ہیجانات جنسی گردش کے بھی نظام اوقات میں گڑبڑ پیدا کر دیتے ہیں یہ تو ایک عام حقیقت ہے کہ ہیجانات سے حیض میں جلدی یا تاخیر ہو جاتی ہے۔ لیکن اکثریت اس حقیقت سے ناواقف ہو گی۔ حالانکہ عملی لحاظ سے یہ زیادہ اہم ہے۔ کہ ہیجانی ردعمل بھی بیضین میں تیزی یا تعویق کا باعث بن سکتا ہے۔ غیر معمولی ہیجانی تہیج سے گردش حیض کے کسی بھی دور میں بیضین پیدا کرنے والے اعمال میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ اولیں حمل یا بلا منصوبہ قیام حمل میں یہ عنصر سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

عورت کی زرخیزی اضافی ہے۔ اس میں جسمانی ساخت کی پیدا کردہ انفرادی تبدیلیاں ہی نہیں

ملتیں بلکہ پختگی جنسی قوت اور فریقین کی باہمی جنسی مطابقت کے باعث ہر عورت میں اس کی جداگانہ صورت بھی ملتی ہے اس موقع پر ہم اولیں جنسی اختلاط یا شادی کے بعد "پوری چھپے" کے جنسی تعلقات کی مخصوص اشتعال پذیری کا خصوصی تذکرہ کریں گے۔

اس اشتعال پذیری کے باعث عورتوں کو "محفوظ دور" میں بھی حاملہ ہوتے دیکھا گیا ہے۔ حالانکہ اصولی طور سے ان دنوں میں حیض کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لئے تو بعض اوقات لڑکیاں زندگی میں پہلی مرتبہ جنسی اختلاط ہی سے حاملہ ہو جاتی ہیں۔ بلکہ بعض تو مکمل دخول کے بغیر بھی حاملہ ہوتی دیکھی گئی ہیں۔ سماجی بہبود کے سبھی کارکن ایسی لڑکی کی مثال سے آشنا ہوں گے۔ جو کہتی "خیال کے زیر اثر نہ ہونے والا کبھی نہ ہوگا"۔

حمل کے تقریباً تمام مراحل طے کر جاتی ہے۔ وہ اپنی تسلی کے لئے حمل سے لاعلمی کا سہارا ڈھونڈتی ہے۔ بعض اوقات ایسی لڑکیاں دوران حمل ایک ہی نہیں بلکہ کئی حیض گنوا سکتی ہیں۔ یوں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ متضاد خواہشات کے زیر اثر کس طرح عضویاتی وظائف کٹ کر علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان عضویاتی اعمال کا ایک حصہ لڑکی کی خواہشات کے موجب حمل کو دوسروں سے ہی نہیں بلکہ اس سے بھی چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب کہ عضویاتی اعمال کا دوسرا حصہ حمل کی برقراری سے مادریت کے لئے گہری حیاتیاتی احتیاج کی تکمیل کرتا ہے۔ نفسی معالجہ کے ماہرین ایسی مثالوں سے واقف ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی اولیں اختلاط کے بعد اپنی جنسی خواہشات کے پیدا کردہ خوف کی وجہ سے ناجائز حمل کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جب بے صبری سے انتظار کئے جانے پر بھی حیض نہیں ہوتا۔ تو اس کی پریشانی اور تشویش میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے جیسے خود اس کے جسم نے بھی اس کے خلاف سازش کر لی ہو۔ کیوں کہ حمل کی کئی مصنوعی علامات یکے بعد دیگرے معرض وجود میں آتی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ حمل کے لئے اس کی شدید حیاتیاتی احتیاج بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن سماجی معاییر اس خواہش میں رخنہ اندازی کرتے ہیں جن کے نتیجہ میں وہ مستقل طور سے بانجھ بھی ہو سکتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حمل کی شعوری خواہش یا اس کی تکذیب دونوں ہی مادریت کی حیاتیاتی احتیاج کے لئے بلا واسطہ ذریعہ نہیں بن سکتیں۔ نہ ہی بیان پیچیدہ وظائف کے لئے عورت کی آمادگی یا رجحان کو ثابت کر سکتی ہیں جو ہمارے تمدن میں مادریت سے وابستہ کر لیا گیا ہے۔

یہ عورت کی حیاتیاتی خصوصیات میں سے ہے کہ اسے افزائش نسل سے وابستہ وظائف کی تکمیل کے لئے خارج میں متحرک نفسی توانائی کا رخ داخلیت کی طرف موڑنا پڑتا ہے۔ عام حالات میں یہ نفسی توانائی دخلی اور خارجی رجحانات ختم کرنے پڑتے ہیں۔ ہارمونی سطح میں اضافہ کے ساتھ ہر گردش میں عورت کی جنسی دور اور تفاعل کی صورت میں مادرانہ محبت کرنے کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ہر گردش میں بیضہ اور پروجیسٹرون کے وقت تعطل پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت خارجی رجحانات کی متحرک توانائی میں کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ لیکن حمل اور مادریت کے لئے اہم حیاتیاتی اندرونی عمل جاری رہتا ہے۔ گویا جنسی گردش کے باعث عورت مجبور ہوتی ہے کہ وہ محدود دائرہ میں ہی سہی مادریت سے وابستہ نفسی اور جسمانی کیفیات ہر ماہ محسوس کرے۔ اس میں نفسیاتی تسکین اور نفسیاتی خطرہ دونوں ہی شامل ہیں۔

اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے کہ اب ان عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو اپنی شخصیت کے بعض تقاضوں کے باعث مادریت سے وابستہ جسمانی ضروریات کے لئے مناسب ردعمل کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ وہ بھی زندگی میں اپنی مادریت کے لئے پریشان اور عدم تحفظ کے احساس کی شکار ملتی ہیں۔ ہماری مغربی تہذیب میں کیونکہ تعلیم کا مقصد نسائی شخصیت میں مردوں جیسی فعالیت بلکہ ایک حد تک مردانہ "خصائص" کا پیدا کرنا ہے اس لئے عورتوں کی اکثریت مفعولیت کو ۔ جو کہ افزائش نسل کے لئے لازم ہے ۔ اپنے لئے باعث خطر تصور کرتی ہے۔ اس لئے وہ ہر جنسی گردش کے دوران مادریت کی حیاتیاتی ضرورت کے خلاف جدوجہد کر سکتی ہیں۔ بہت سی عورتیں ہارمونی کارکردگی میں کمی کے وقت جنسی خواہشات کا پرجوش خیر مقدم کرتی ہیں۔ جب کہ [illegible] قیام حمل کو شعوری خواہش کے زیر اثر روکنے والی اکثر عورتیں بھی مرض میں مبتلا ہیں۔ جب کہ جس طرح رجحانات کے خلاف شعوری دفاع کے طور پر ایسا کرتی ہیں۔ لیکن عضویاتی ہم آہنگی کو سکون کے لئے ایک نیا آہنگ وضع کرنے کی قیمت انہیں ضرور ادا کرنی پڑتی ہے۔ کیوں کہ جبلی احتیاجات کی عدم تسکین کی پیدا کردہ پژمردگیاں ہیجانی پریشانیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیتی ہیں۔ اس سے احتیاج کی مراجعت بھی ہو سکتی ہے۔ جو بالآخر جنسی سرد مہری پر منتج ہو سکتی ہے۔ کچھ مدت کے بعد یہ بیضہ دانیوں کی کارکردگی کو متاثر کر کے بانجھ پن کو بھی جنم دے سکتی ہے۔

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں اچھی ماں بننے کا عمل خاصی پیچیدہ صورت اختیار کر چکا ہے اس کے لئے عورت میں مفعولی رجحانات ہونے چاہئیں۔ اس سے محبت کی جائے۔ اس کی نگہداشت کی جائے۔ تاکہ وہ حمل کے تقاضوں سے بطریق احسن اور خوشی سے عہدہ برا ہو سکے اس سے وہ حمل اور مادریت سے لطف اندوز ہو سکے گی۔

علاوہ ازیں اس میں توانا انا کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ اس کی انا کی توانائی ہی تو ہے۔ جو اسے مفعولیت اور تولیدی وظائف کے لئے لازمی نرگسی رجحانات کے خطرات سے بچائے گی۔ خوش قسمتی سے یہ تمام عناصر جہاں حقیقت میں باہمی اشتراک سے عمل پیرا ملتے ہیں۔ البتہ ہمیں ان کا اتنا احساس نہیں ہوتا۔ تشریح کی خاطر ہمیں مریضانہ صورت اختیار کر جانے والے عوامل کی نشان دہی کر دینی چاہیئے۔

گو حیاتیاتی لحاظ سے حمل ایک نارمل وقوعہ ہے۔ پھر بھی استثنائی صورت رکھنے کی وجہ سے اس کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے عورت کو جسمانی اور نفسیاتی توانائی کے تمام محفوظ ذخیروں سے کام لینا ہوتا ہے۔

قیام حمل کے فوراً بعد ہی سے جنین اور ماں کی ایک دوسرے پر اثر اندازی شروع ہو جاتی ہے ہارمونی اور استحالی اعمال کی شدت قرار حمل کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے ان کا اظہار مفعولی رجحانات کی شدت میں ہوتا ہے۔ ان سے یقینی قسم کا انجذابی توازن پیدا ہوتا ہے۔ جو کہ "فالتو توانائی" پیدا کر کے ماں میں نرگسیت کی نئے سرے سے جنم دہی کرتا ہے۔ اس کے زیر اثر خود کو ایک عجیب و غریب سکون سے آشنا پاتے ہوئے اور حاملہ عورت اپنے جسم سے لطف اندوز ہوتی ہے یہ لطف اندوزی شہوانی حساسات سے کچھ بڑھ کر ہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں عام حالات میں اس کے حلقہ کے افراد خصوصیت سے اس کا خاوند اور اس کی ماں اس مسرت میں برابر کے شریک ہوتے ہوئے انحصار پر مبنی اس کی ضروریات کا دھیان رکھتے ہیں۔ جب اس سے محبت کی جاتی ہے تو حاملہ عورت کی محبت اپنی ذات سے جدا ہو کر اس ذات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ جو اس کے رحم میں پل رہی ہے۔ یوں مادریت کے لئے راہ ہموار ہوتی ہے۔ لیکن جب انحصار پر مبنی اس کی ضروریات نا تکمیل شدہ رہیں تو حالات دوسری صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر خاوند کے لئے اس کے دل میں محبت نہ ہو یا وہ ماں نہ بننا چاہتی ہو تو یہ سب عوامل عمل میں پریشانیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اسی صورت میں ہر نئی تبدیلی ۔ انحصار پر مبنی ضروریات یا جسمانی تغیرات ۔ اس میں آسودگی کی بجائے پژمردگی پیدا کرتی ہے۔ ان کے نتیجہ میں جنم لینے والا خوف، تشویش یا معاندانہ احساسات مریضانہ مراجعت پر منتج ہوتے ہوئے مادریت کی نشو و نما میں ایک حد تک رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ صحت مند مادریت کے لئے ایک حد تک حیاتیاتی اور نفسی پختگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ گو گردش میں پروجیسٹرون کا دور ایک لحاظ سے ہر ماہ "دور مشق" مہیا کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس نارمل ارتقا میں رکاوٹ پیدا کرنے والے جسمانی ساخت اور ماحول سے وابستہ کئی عوامل ملتے ہیں۔

یہ ارتقائی عمل ۔ مدت حمل، زچگی اور دودھ پلانے کی صورت میں تکمیل پاتا ہے۔ مگر مشاہدات

اس امر کی توثیق کرتے ہیں۔ کہ پہلے بچہ کی صورت میں شاید ہی یہ عمل تکمیل پاتا ہو۔

مندرجہ بالا سطور سے باآسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ناجائز مادریت کو پریشانیاں ورثہ میں ملتی ہیں جب اسے اپنا حمل چھپانا پڑتا ہے تو حمل سے وابستہ تسکین اور محبت اور نگہداشت سے محروم ہو جاتی ہے وہ اپنے بچہ کو نہ تو اپنے تصورات میں جگہ دے سکتی ہے اور نہ ہی وہ اپنے مستقبل کے منصوبوں میں اسے شریک کر سکتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایسی کنواری مائیں بھی ملتی ہیں جو ہر طرح کا خوف اور تشویش بالائے طاق رکھ کر اپنے بچہ پر فخر کرتے ہوئے اس کی خواہاں ہوتی ہیں۔ لیکن اس صورت میں مادریت کے نارمل ارتقاء بغاوت کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔

اب عورت بچہ کی ماں ہی نہیں بلکہ باپ بھی بنتی ہے۔ سماجی کارکنوں کے لئے ایسی کنواری ماؤں کا وجود عنقا نہیں جن کے ہیجانی گھروندوں میں خاوند کی محبت اور نگہداشت کے راج کی بجائے شرم تشویش اور عدم تحفظ کے احساسات براجمان ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر ایسی عورتیں اپنے نشوونما پاتے بچوں کو اپنے مستقبل کی خوشیوں کی راہ کا کانٹا تصور کریں۔ تو یہ امر تعجب خیز نہ ہونا چاہیئے اور اسی لئے وہ حمل کے خلاف ہو جاتی ہیں۔

اگر ہم ہر انفرادی امثال میں محرکات کا تجزیہ کریں تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہر ممکن طریقہ سے اپنے حمل کو ختم کرنے والی ہر کنواری ماں کے ذہن میں ماضی بعید سے حمل سے کچھ ایسی لاشعوری الجھنیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ جو بالآخر حمل کے لئے تشویش اور معاندانہ احساسات کی گہرائی متعین کرنے کی موجب بنتی ہیں۔ کنواری ماؤں کے پاس تو پھر بھی کوئی نہ کوئی عقلی جواز ہوتا ہے۔ لیکن شادی شدہ عورتیں کسی عقلی جواز اور خارجی وجوہات کے بغیر محض ان لاشعوری الجھنوں کی وجہ سے حمل کے خلاف ہوتی ہیں۔

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسقاط حمل کی خواہش مریضانہ ہیجانات کی پیدا کردہ ہوتی ہے لیکن ہم اس کے برعکس صورت کو بھی — یعنی بہت زیادہ بچوں کی مائیں صحت مند ہیجانات کی پختگی کی مظہر ہوتی ہیں۔ صحیح اور درست تسلیم نہیں کر سکتے۔

سماجی کارکن ایسی عورتوں کی مثالوں سے واقف ہیں۔ جو اپنے بچوں کی مناسب نگہداشت بھی کرتے ہوئے شیر خوارگی کے زمانہ تک اچھی مائیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بچے انہیں مثبت قسم کی مادرانہ محبت نہیں دے سکتے۔

بعض اوقات ایسی عورتیں حاملہ ہونے کے بعد بڑے بچوں سے بالکل لاپرواہ ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی زرخیزی کی تسکین کی خاطر ہر سال یا ہر دوسرے سال حاملہ ہونا ہوتا ہے اس لئے نیا حمل پہلے بچوں کو ان کے لئے لاوجود کر دیتا ہے۔ اس کے لئے ہم ماحولی اثرات کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر عورتیں ہیجانی تسکین کے لئے خارجی تعلقات اور اثرات کی محتاج نہیں ہوتیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ایسی عورتوں کے لئے حمل سے وابستہ حیاتیاتی تسکین ایک ناقابل مزاحمت ترغیب ہوتی ہے۔ اور اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو کنواری مائیں مسلسل ناجائز بچے پیدا کرتی جاتی ہیں۔ وہ بھی تولیدی سے وابستہ تسکین کی بنا پر ایسا کرتی ہیں۔

اکثر صورتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ جب ایسی عورتیں اپنے بچے کسی کو متبنیٰ بنانے کے لئے دے دیتی ہیں یا انہیں لاوارث خانوں کے حوالے کرتی ہیں۔ تو وہ اس بچے سے [illegible] قسم کا بھی ہیجانی رشتہ استوار نہیں کرتیں۔ بالفاظ دیگر مادریت ان کی شخصیت کی نشوونما میں کسی قسم کا بھی کوئی کردار ادا نہیں کرتی۔ گویا اس ضمن میں کنواری یا ناکتخدائی کی صورت میں خاص دقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے اکا مسئلہ نہیں بلکہ یہ تو تمام شخصیت کی تشکیل کرنے والے عوامل جو بعد ازاں مادریت سے وابستہ نفسی جنسی نشوونما کے انداز کا تعین کرتے ہیں۔

زچگی سے جنسی رشتہ میں جو رکاوٹ پیدا ہوتی ہے وہ نوزائیدہ ہی نہیں خود ماں کے لئے بھی ایک دھچکہ ثابت ہوتی ہے۔ زچگی پیدا کرنے والے ہارمونی اور استحالی تغیرات، درد زہ اور پیدائش کا پرجوش مرحلہ — خواب آور ادویات کے بکثرت استعمال کے باوجود بھی۔ بچہ اور ماں کی ہیجانی وحدت میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ وہ عورت تو خوش قسمت ہے جس کے سینہ میں پہلے بچہ کی پہلی آواز کے ساتھ ہی محبت کا چشمہ ابل پڑتا ہے۔

پہلی مرتبہ والدین بننے والے بسا اوقات بچہ کی پیدائش پر ہیجانی خلا محسوس کرتے ہیں۔ حمل کے نو ماہ یا کچھ کم مدت تک وہ بچے سے محبت کرنے کے لئے خود کو تیار کر رہے تھے۔ لیکن پیدائش کے بعد جب انہیں اس کے لئے اپنے دل میں مخصوص نوعیت کے احساسات میں کچھ کمی ملتی ہے تو وہ اس پر تعجب کرتے ہیں۔ اکثر عورتوں کے لئے زچگی کے بعد کی پژمردگی ناامیدیوں اور خود الزامی کو اپنے جلو میں لاتی ہے۔ وہ محبت کی بجائے اپنے دل میں خلا محسوس کرتی ہیں۔ خواہ اس پژمردگی کی وجہ زچگی کے بعد کے استحالی اعمال ہوں یا صحت مند مادریت کے لئے نفسی اور جسمانی ناپختگی — بہرصورت ماں اپنے دل میں بچہ کے لئے اتنی زیادہ محبت نہیں پاتی۔ اب کنواری ماؤں کا خود ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نو ماہ تک مسلسل اپنے بچہ کے لئے اپنے حقوق کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا رہنے والی عورت کے دل میں ہیجانی خلا کتنا زیادہ نہ ہوگا۔ ویسے اپنے بچہ کے لئے محبت کی کمی یا فقدان کو وہ تعمیری لحاظ سے کارآمد بھی بنا سکتی ہے کیونکہ وہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے یا خود پر پژمردگی طاری کئے بغیر اسے بچہ کسی اور کو سونپ دینے کے لئے اپنا فیصلہ مرتب کرنے میں زیادہ سہولت رکھتی ہے۔ اس موقع پر بھی مادریت سے وابستہ اولیں واساسی ہیجانی ردعمل میں کنواری یا کتخدائی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے سامنے ایسی کنواری ماؤں کی مثالیں موجود ہیں۔ جنہوں نے نوزائیدہ کے لئے فوری طور سے شدید اور والہانہ محبت محسوس کی اور اس محبت کو دبا کر بچہ کو علیحدہ کرنے کے لئے تمام انائی اور ارادی قوت کو بروئے کار لانا پڑا۔ پھر ایسی کنواری مائیں بھی ہیں۔ جو شادی شدہ ماؤں کی مانند اپنے بچہ کے لئے فقدان احساسات کی بنا پر خود کو مجرم سمجھتی ہیں۔ اور یہ احساس اس بنا پر اور بھی زیادہ شدید ہوتا ہے کہ مجرمانہ احساسات کے لئے اب ایک عقلی جواز بھی موجود ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی کنواری مائیں جب بچہ کو خود سے جدا کرنے کے لئے ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہیں۔ تو اسی کی بنا پر اس سب سلسلہ کا غیر فطری پن ہوتا ہے۔ خصوصیت سے جب وہ اپنے بچہ کے لئے کسی طرح کی محبت محسوس نہیں کرتیں۔ یا شعوری کاوش کے باوجود بھی ایسا نہ کر سکتی ہوں۔

بچہ کے ساتھ جسمانی روابط — اسے بازوؤں میں لینا، اسے دیکھنا اور چھونا۔ ان سب سے بچہ اور ماں میں ایک وحدت جنم لیتی ہے۔ ماں کو ہارمونی کارکردگی دودھ پلانے کے لئے تیار کر رہی ہے اس لئے ہیجانی اور نفسیاتی ہر دو لحاظ سے بچہ کے ساتھ اس وحدت کے قیام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر بچہ صحت مند ہو اور اس کی چھاتیوں میں دودھ کی وافر مقدار ہو تو دودھ پلانے کا زمانہ عورت کی زندگی کے طمانیت بخش دور [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] کارکردگی پر [illegible] انداز ہو کر مولدانہ کردار [illegible] سامان تسکین مہیا ہوتا ہے۔ [illegible] موقوف ہو جاتا ہے۔ ہیجانی لحاظ سے دودھ پلانے والی عورت [illegible] محسوس کرتی ہے۔ صرف فرق اتنا ہوتا ہے۔ پہلے اسے بچہ کی پیدائش کو تصوراتی جہان کا مرکز بنا رکھا تھا۔ لیکن اب بچہ گوشت پوست کی صورت میں [illegible] گود میں ہوتا ہے۔

مادرانہ طرز عمل میں بیک وقت ہمیں معقول رجحانات ملتے ہیں۔ کیونکہ وہ اب دوسرے کے لئے کمار ہی

---

[1] چمپانزیوں کے بارے میں یارک اور بعض دیگر ماہرین کی تحقیقات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مادریت میں پختگی اور ارتقا کے لحاظ سے ہر مادہ انفرادی خصوصیت رکھتی ہے۔

ہوتی ہے۔ اس لئے استعمالی ضروریات میں اضافہ مفعولی قبولیت بڑھا دیتی ہیں۔ اسی رجحان کے فعالی پہلوؤں کا بچہ کی نگہداشت، دودھ پلانے وغیرہ کے اہتمام میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

دراصل فعالی اور مفعولی رجحانات ہی وہ محور ہے جس پر مادرانہ نشوونما گردش کرتی ہے۔ ماں بچہ کے رابطہ کی استواری میں بچہ کی نگہداشت کے تمام طریقوں سے زیادہ زوداثر دودھ پلانا ثابت ہوتا ہے۔ بچہ جب چھاتی اپنے منہ میں لیتا ہے تو ماں بچہ کو اپنی شخصیت اور ذات کا ایک حصہ تصور کرتی ہے دودھ پلانے سے جو خوشی آگیں احساسات وابستہ ہیں۔ وہ اسے "مراجعت" کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ بچہ کے ساتھ تطبیق کی صورت میں وہ خود اپنی مفعولی خواہشات کی تسکین کر سکتی ہے۔ ماں کی بچہ کے ساتھ تطبیق سے دودھ پلانے کے ہیجانی تجربات ماممتا میں بتدریج اضافہ اور استحکام کے باعث بنتے ہیں۔

اگر عورت کے تولیدی وظائف کے ہر دور سے وابستہ ہیجانی کیفیات اسی "تطبیق مراجعت" سے نمایاں ہوں۔ تو یہ حیاتیاتی لحاظ سے مفید اور کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ کیوں اس گردش میں، پروجیسٹرون کے دور کے ساتھ ہی حمل اور دودھ پلانا — سبھی عورت کی جسمانی نشوونما اور ہیجانی ارتقا کے لئے تہیج کا باعث بنتے ہیں۔ اضافہ شدہ استحالی اعمال جسمانی نشوونما کا باعث بنتے ہیں۔ اور محبت اور توانائی کا وہ فالتو ذخیرہ مہیا کرتے ہیں۔ جس سے ممتا کا چشمہ پھوٹتا ہے۔ اضافہ شدہ، استحالی اعمال کی تسکین عام طور سے قبولیت کی خواہشات میں شدت سے ہوتی ہے۔ جو بعدازاں اپنے طور سے عورت کے مفعولی انحصاری رجحانات میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔ یوں یہ حیاتیاتی اعمال مادریت سے وابستہ ہیجانات کی شدت اور حساسیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ مراجعانہ رجحانات میں اس حد تک اضافہ ہو سکتا ہے۔ کہ عورت میں دوسروں پر انحصار رکھنے کی خواہش اسے بالکل بچہ بنا کر پختہ مادرانہ کردار کی بجاآوری کے ناقابل بنا دیتی ہے۔ اگر گردش میں پروجیسٹرون دور کا تجزیہ کیا جائے۔ تو ہمیں اس چپقلش اور الجھن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو بعدازاں ایک لڑکی افزائش نسل سے وابستہ وظائف کے ضمن میں محسوس کر سکتی ہے۔ اس دور کے اور بالخصوص عنفوان شباب میں لڑکیوں کے مخصوص ہیجانات کو "جنسی مراجعت" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا اظہار طفلانہ اور انحصاری خواہشات کے اعادہ کے علاوہ اپنی ماں سے چپقلش کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔

بعض اوقات نفسی بدنی محرکات وفور اشتہا یا ضعف اشتہا کی علامات کا روپ دھار لیتے ہیں پروجیسٹرون دور میں شدت اختیار کرنے والی ہر دو ذہنی علامات یا پژمردگی کے دیگر مظاہر مادریت کے ان خطرات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جن سے بعض عورتیں دوچار ہو سکتی ہیں۔ تحلیل نفسی کا یہ تسلیم شدہ نظریہ ہے کہ ذہنی قبولیت اور رجحانات میں شامت پژمردگی کی نفسی حرکی حالت کی غماز ہوتی ہے۔ گویا مادریت کے ارتقا کے لئے جو ہیجانی کیفیات ضروری ہیں۔ وہی ماں میں پژمردگی پر مبنی ہیجانی ردعمل پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہیں۔ اور ماں ہی لاشعوری ابلاغ سے اپنے بچہ میں اس کی منتقلی کا باعث بنتی ہے۔

حمل اور زچگی کے بعد کی مختلف النوع مریضانہ ہیجانی صورتوں کا جائزہ ہماری حدود سے باہر ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پژمردگی پر مبنی ایسے نیم مریضانہ ہیجانی اجتماع ماں بچہ کے باہمی رابطہ پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم بچہ زچگی کی تسکین کی خاطر ماں بننے والی عورتوں کی مریضانہ مراجعت کی وضاحت کر چکے ہیں۔ پھر وہ عورتیں بھی ہیں جو کامل ماں بننے کے لئے تگ و دو، نشوونما، وہ پژمردگیوں کے گرداب میں گھری رہتی ہیں۔ ایسی عورتیں مکمل اور کامل مسرور بچے کی پرورش کے لئے نگہداشت اور تربیت کے تمام قوانین و ضوابط کے لئے کولہو کی بیل بنی رہتی ہیں۔ اگر بچہ ذرا بھی ضوابط کی حدود سے باہر نظر آئے تو یہ ان کی اپنی ناکامی اور شکست ہوتی ہے۔ ایسی عورتوں کے لئے مادریت بچہ سے ایک اہم رابطہ ہونے کی بجائے ایک معیار دانش کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کی پیدا کردہ پژمردگی کی کیفیات سے چھٹکارے کی خاطر یا تو حمل سے گریز کرتی ہیں۔ اور یا پھر سوچتی ہیں کہ ہم دوسرے بچے کی تربیت میں یوں ناکام نہ رہیں گی۔

طفلانہ امراض کے معالجین عموماً ماؤں کو یہ کہہ کر تسکین دیا کرتے ہیں۔ کہ اگر ہر پہلا بچہ دوسرا ہوتا تو یہ زیادہ بہتر رہتا اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں دوسرے بچہ کے لئے پریشان کم اور خود اعتماد زیادہ ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں عموماً یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ماں کے طرز عمل میں یہ فرق "تجربہ کی آموزش" پیدا کرتی ہے۔ لیکن جب مائیں دوسرے بچہ کے احساسات بیان کرتی ہیں۔ بچہ سے فوری رابطہ کا احساس، محبت کا ابال، سکون آمیز مسرت جو بچے کو چھونے سے ہی وجود میں آتی ہے۔ ان سب سے یہ باآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ مادریت حیاتیاتی پختگی کے بعد ہی ایسے ہیجانات کا باعث بنتی ہے ان ہیجانات کے اثرات لازوال ہوتے ہیں۔

بعض صورتوں میں یہ ہیجانات عورت میں عدم تحفظ پر مبنی احساسات پر غالب آنے کی قوت پیدا کرتے ہوئے پہلے بچے کے لئے ہی ممتا پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کچھ ضرورت سے زیادہ ماں بننے والی مائیں اس خوش آگیں تجربہ سے مجرمانہ احساسات کے لئے ایک جواز پیدا کر لیتی ہیں۔ وہ پہلے بچہ سے ہی الجھنیں وابستہ نہیں کرتیں۔ بلکہ آنے والے بچے بھی اس احساس سے نہیں بچ سکتے۔ ماں بچہ کے باہمی تعلقات کا مریضانہ پن یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ یہی بچے آئندہ نسل کی صورت میں ان مریضانہ رجحانات کا والدین بننے کے بعد اعادہ کرتے ہیں۔

ممتا کی نشوونما صرف بچہ کی پیدائش اور پرورش تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ تو ایک بیج کا تناور درخت بننا ہے۔ عورت کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کی بتدریج نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ لڑکی کی ماں کے ساتھ تطبیق اور گردش کے پروجیسٹرونی دور سے وابستہ ہیجانی اور استحالی کیفیات کا اعادہ اس تہیج کے لئے زرخیز مٹی ثابت ہوتے ہیں۔ اس اعادہ سے ممتا کا ارتقائی اظہار بالغ عورت کی شخصیت کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔ ممتا کی تشکیل اور عورت کی تمام شخصیت کا بچہ کی پیدائش و پرورش کی صورت میں امتحان لیا جاتا ہے۔ گو عورت میں مادریت کا جذبہ وہی ہوتا ہے۔ بلکہ اسی وجہ سے بھی — شادی شدہ کے مقابلہ میں غیر شادی شدہ کے مقابلہ میں غیر شادی شدہ ماں کے لئے مادریت اور ممتا سے حصول پختگی نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔

اس ضمن میں شادی کئی لحاظ سے تحفظ کا کام کرتی ہے۔ شادی شدہ عورت کو اپنی ممتا یعنی بچہ کے لئے جو چپقلش یا الجھن محسوس کرتی ہے۔ اس کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ آنے والا وقت، خاوند کی ہیجانی امداد اور کنبہ مل کر ان پر قابو پانے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ لیکن شادی کے زیر تحفظ نہ ہونے والی ماں کی حالت ایسی نہیں، دوسرے اس کا ہر وقت جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اور وہ خود بھی ہر وقت اپنا تجزیہ کرتی رہتی ہے۔ اگر وہ دوسروں کی نکتہ چینی برداشت نہیں کر سکتی۔ یا اپنے مجرمانہ احساسات یا نئی ذمہ داریاں اس کے لئے بوجھ ثابت ہوں۔ تو اپنے بچے کے لئے نفرت اور محبت کے مابین ڈولتے احساسات یا نئی ذمہ داریاں اس کے لئے بوجھ ثابت ہوں۔ تو اپنے بچے کے لئے نفرت و محبت اس کی ذمہ داریاں ثابت ہوں گی۔ خوش قسمتی سے شادی شدہ ماں کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا۔ مادریت کے یہ تمام تفریقی اور مختلف النوع پہلو سماجی عوامل کی زیر اثر ہوتے ہیں۔ اس لئے "کنواری ماں" کی اصطلاح سماجی مرتبہ کا تعین کرتی ہے۔ نفسی معالجہ یا طبی تشخیص کے لحاظ سے یہ کچھ بھی نہیں۔

<u>ایڈورڈ گلوور</u>

طوائف کی نفسیات

عضویاتی مرضیات کے برعکس جدید نفسی مرضیات کیونکہ متنازعہ فیہ علم ہے اس لئے خیالات و نظریات میں بہت زیادہ اختلافات ملتے ہیں۔ ہمارے لئے آغاز ہی میں یہ تسلیم کر لینا کہیں زیادہ سود مند

ہوگا کہ طوائف کا مطالعہ ہیجانی مشکلات سے مملو ہے۔ اسے ایک عام مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ علم کیمیا کا پروفیسر کسی نمک کے کیمیائی عناصر کی تشریح کرتے وقت یہ جانتا ہے کہ سامعین اس کی ہر بات خاموشی سے تسلیم کر لیں گے۔ جب کہ طوائفیت پر تقریر کرنے والے کو یہ احساس ہے کہ موضوع زیرِ بحث پر اظہارِ خیال اور اس کے نفسیاتی عوامل کی تفتیش سے پہلے ہی سامعین اظہارِ ناپسندیدگی کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ بحث زیادہ تر لاشعوری عوامل کے گرد گھومتی ہے اکثر لوگ ان سے نابلد ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو اکثریت غیر جانبداری سے کام نہیں لے پاتی۔ یہ کوئی پوسٹ مارٹم تو ہے نہیں کہ ہر چیز آنکھ کے سامنے ہو یہاں تو معاملہ ہی اور ہے۔ ذہن کا بیشتر حصہ لاشعور پر ہی مشتمل نہیں بلکہ ہم داخلی جبلتوں اور ان کے انداز کا تعین کرنے والے قوانین سے بھی نا آشنا ہوتے ہیں۔

مگر جب ہم ذہن کے بعض حصوں، قوتوں اور نظام قوانین کو لاشعوری کہنے کے ساتھ ساتھ "ذہنی" بھی قرار دیتے ہیں۔ تو اس سے عمومی الجھن میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ عموماً یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ لاشعور جو کچھ بھی ہو۔ وہ مریضانہ رجحانات کا حامل ہی نہیں بلکہ قابلِ خوف بھی ہے۔ اگر ہم جدید تحلیل نفسی کا چند صدیوں قبل کے عضویاتی علم الادویات سے موازنہ کریں تو اس الجھن کو ایک حد تک ختم کیا جا سکتا ہے۔ آج تحلیل نفسی کے ارتقا میں ہم اس مرحلہ پر ہیں۔ جب علم الادویات میں ہاروے نے دوران خون کا انکشاف کیا اور آج جسے ہم حیاتی کیمیا کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے ابھی ابتدائی اصول بھی متعین نہ ہوئے تھے۔

اب تک نفسیات دان اہم ذہنی اعضاء (شعبوں) کی حدود متعین کر چکے ہیں۔ ان ذہنی اعضاء کو مائل عمل کرنے والے توانائی کے اہم مراکز۔ (جبلتوں) کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ ساتھ ہی ان اصولوں اور قواعد کا تجزیہ بھی کیا جا چکا ہے۔ جن کے تحت یہ جبلتیں کارکردگی کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ عجیب و غریب اور نامانوس معلوم ہوتا ہے اس لئے ہم لاشعوری ذہن کی تشکیل کے عام انداز اور رکھ رکھاؤ پر مریضانہ کا لیبل چسپاں کر دیتے ہیں۔ مثلاً ہم دباؤ کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔ گویا مریضانہ علامت یا منفی رجحان ہے جب کہ یہ لاشعور کا ایک نارمل انداز ہے اور اس کے بغیر ہم لوگوں کے لئے اپنے وظائف کی انجام دہی مشکل ہو جائے۔ دباؤ مریضانہ نہیں بلکہ "غلط دباؤ" کے نتائج مریضانہ صورتِ حال جنم دیتے ہیں۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیں کہ اگر تجزیہ دیانت کرنے والے حضرات نے اسے ایک خطرناک رسولی قرار دیا ہوتا تو اس سے کتنی الجھنیں پیدا ہو جاتیں۔

میں اس امر پر اس لئے زیادہ زور دے رہا ہوں کہ طوائفیت کا جائزہ لینے سے قبل جنسی جبلتوں کی نارمل نشوونما کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں خیالات کا واضح ہونا لازمی ہے۔

فرائیڈ کی بعض اولیں تحقیقات اس سے متعلق تھیں وہ تحقیقات جنہوں نے اپنے زمانہ میں مخالفت کی آگ ہی نہ بھڑکائی بلکہ بعض لوگوں کے لئے کراہت کا موجب بھی بنیں۔ اب اس مخالفت کی شدت میں قدرے کمی ہو چکی ہے۔ کم از کم بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

فرائیڈ کے مطالعات نے جنسیت کے ضمن میں اسی اہم امر پر زور دیا کہ جنسی تحریک بلوغت کے وقت ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ بلکہ پیدائش کے وقت ہی یہ موجود ہوتی ہے۔ یہ کوئی واحد جذبہ نہیں بلکہ مختلف عناصر کے ترکیب پانے سے آخری صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ عناصر تین اور پانچ سال کی عمر کے درمیانی وقفہ میں ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں۔ لاشعوری کارکردگی کے باعث دباؤ کا عمل عمر کے اس حصہ میں انہیں دبا دیتا ہے۔ اور اس کے بعد آنے والے عمر کے حصہ کو "دورِ خفتگی" کہتے ہیں۔ جو عنفوانِ شباب تک جاری رہتا ہے حتیٰ کہ بلوغت پر بالغانہ جنسی تحریک ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔

یہ تھا مختصر الفاظ میں طفلانہ جنسیت کا نظریہ! ایک دوسرے میں مدغم ہونے والی ان تحریکوں کی مختلف انداز سے درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ درجہ بندی عموماً جسمانی لحاظ سے کی جاتی ہے۔ اس صورت میں مختلف جسمانی اعضاء سے مختلف تحریکیں وابستہ کر دی جاتی ہیں۔ بچہ کے لئے دودھ پینا منہ کے لئے استلذاذی احساسات کا باعث بھی بنتا ہے۔ اس لئے طفلانہ جنسیت کے ایک اہم ترین عنصر کو "دہنی" سے موسوم کیا جاتا ہے اسی طرح ہم "برازی" اور "مجری البول" جنسیت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان دونوں کا بول و براز کے ساتھ تعلق ہے ان میں سے ہر عنصر ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کر سکتا ہے لیکن تین برس کی عمر میں بالعموم "تناسلی" عنصر دوسروں پر فوقیت پا لیتا ہے۔

طفلانہ جنسیت کی تشکیل کرنے والے عناصر کی جنسی تحریک کے "مقاصد" کی رو سے بھی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں آزار پسندی، اذیت کوشی، نمائشیت یا جنسی نظارہ پرستی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اول الذکر دونوں صورتوں میں جنسی تحریک کے ساتھ ایذا پر مبنی لذت وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس کی فاعل صورت آزار پسندی اور مفعول صورت اذیت کوشی کہلاتی ہے۔ اس صورت میں فرد دوسروں کے ہاتھوں ایذا برداشت کرنے میں جنسی لذت حاصل کر لیتا ہے۔ فاعل اور مفعول کا یہی انداز ہمیں موخر الذکر دونوں صورتوں میں کارفرما ملتا ہے۔ کیونکہ وہ دوسروں کو اپنے تناسلی اعضاء دکھا کر جنسی لذت حاصل کرتا ہے۔ حالانکہ عموماً اس کام کے لئے پہل اسے ہی کرنا ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تحریک کے اس انداز میں جنسی تجسس کا بھی خاصا ہاتھ ہوتا ہے بلکہ بچہ کے لئے تو جنسی تجسس کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔ اور اسی لئے وہ طفلانہ جنسیت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بچہ اس کی تسکین کے لئے حسب ضرورت حواس خمسہ سے کام لیتا ہے۔

اس مرحلہ پر اس امر کی وضاحت کی جا سکتی ہے کہ جنسی نشوونما کا طوائفیت سے کیا تعلق ہے۔ آغاز میں ہی یہ واضح کر دیا جائے کہ یہ ایک عام بات ہے کہ بلوغت کے بعد سے نارمل جنسیت کی جگہ کلی یا جزوی طور سے ان مظاہر سے کام چلایا جا سکتا ہے۔ جنہیں عموماً جنسی کجروی کہا جاتا ہے اگر ان کجرویانہ افعال کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی اساس طفلانہ جنسیت کی تشکیل کرنے والے عناصر ہی بنتے ہیں۔ مثلاً اعضائے تناسل کا چوسنا یا چوسنا (دہنی کجروی) لواطت اور نمائشیت وغیرہ کو باضابطہ اور قطعی قسم کی کجروی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں جنسی معشوق سے عموماً ہم جنسیت ایسا رابطہ ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر کجروی مراجعت کا دوسرا نام ہے۔ یعنی بالغانہ جنسی کردار کی جگہ طفل جنسی کردار کو ترجیح دی جاتی ہے۔

یہ امر باعث اہمیت ہے کہ طوائفوں کی جنسی کارکردگی کا کثیر حصہ کجرویانہ افعال و حرکات پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ یا تو ان کے اپنے میلانات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ورنہ گاہک کے مطالبہ کی تسکین مقصود ہوتی ہے۔ اس لئے طوائفیت کے ضمن میں سب سے پہلے ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا طوائفیت مراجعت پر مبنی نفولیتی اور نامکمل جنسی نشوونما کی مظہر ہے۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی بالکل فطری ہے کہ کیا ان کی ذہنی نشوونما بھی نامکمل اور خام ہوتی ہے۔

جنسیت کی توجیہات کے سلسلہ میں دوسرا مرحلہ طفلانہ جنسیت کی تشکیل کرنے والے عناصر کے ارتقاء کا جائزہ ہے۔ بالفاظ دیگر ہمیں ان عناصر میں ترامیم کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس تحقیق کی کامیابی کا انحصار اس امر کے تسلیم کرنے پر ہے۔ وہ حقیقت جو کبھی شدید بحث و تمحیص کا باعث تھی ابتدائی جنسی تحریکات بالعموم خود شہوانی ہوتی ہیں۔ یعنی ان کی تسکین، کسی خارجی جنسی معشوق کے بغیر اپنی ہی ذات سے ہو سکتی ہے۔ (مثلاً حلق کے طفلانہ انداز) وہ تحریکات جو اپنی تسکین کے لئے خارجی جنسی معشوق کی طالب ہوتی ہیں۔ ان کا رخ والدین اور افرادِ کنبہ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ یہ بالکل واضح ہے مثلاً دہنی جنسیت کا معتدبہ حصہ خود بخود ہی انگوٹھا چوسنے وغیرہ کی صورت میں تسکین پا جاتا ہے۔ لیکن اصل دہنی تحریک کا مرکز والدہ کے پستان بنا دیئے جاتے ہیں۔ یہی کچھ طفلانہ تناسلی تحریک کے لئے کہا جا سکتا ہے۔ ان کا رخ بھی والدین میں سے مخالف جنس کے فرد کی طرف موڑ دیا جاتا ہے گو دونوں طرح کی تحریکات کا رخ والدین ہی کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن ان میں اساسی فرق یہ ہے کہ دہنی

تحریکات کی تسکین خارجی صورت سے ہو جاتی ہے (چھاتی چوسنا) جبکہ تناسلی تحریکات کے لئے ایسا ممکن نہیں اس لئے یہ دبا دی جاتی ہیں۔ اس صورت حال کو اصطلاح میں ایڈی پس الجھاؤ کہتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ الجھاؤ واضح صورت میں ملتا ہے لیکن زیادہ تر یہ لاشعوری ہی رہتا ہے۔ یہ امر باعث اہمیت ہے کہ ایڈی پس صورت حال باعتبار نوعیت زوجنسی ہوتی ہے۔ اس لئے والدین سے طفلانہ ہم جنسی لگاؤ کا مشاہدہ مشکل نہیں۔ یہی لگاؤ بعد ازاں آشکارہ ہم جنسیت کی نشونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اصولاً تو اس الجھاؤ کی پیدا کردہ صورت حال پانچ سال کی عمر میں نقطۂ عروج تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے ختم ہونے یا بکھر جانے کی کلی وجہ صرف وقت ہی میں نہیں تلاش کی جا سکتی۔ بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں اسے یوں سمجھئے کہ والدین کے (دانستہ یا نادانستہ) کردار کے باعث بچہ میں تشویش اور جرم کے احساسات کے پیدا کردہ ردعمل طفلانہ جنسیت کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچہ کی والدین کے لئے یہ ابتدائی جنسی تحریکات امتناعی صورت اختیار کر کے والدین کے لئے محبت کی صورت میں رونما ہوتی ہیں۔ اسی زمانہ میں دور اختفا کا آغاز ہوتا ہے۔ جو عنفوان شباب تک جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد بالغانہ تحریکات کئی لحاظ سے طفلانہ یا مراجعانہ خصائص سے مملو ہو سکتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہم جنسیت پر مبنی مگر شدت کے لحاظ سے مختلف النوع جنسی تحریکات نمایاں صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن ایسا ہر بار نہ ہو گا۔ بعض دفعہ ہے کہ بلوغت تک پہنچتے پہنچتے فرد کی جنسی تحریکات اصولی طور سے خاندان اور والدین سے کہ ہر طرح کا رشتہ منقطع کر چکی ہوتی ہیں۔ اب یہ اپنی تسکین کے لئے خاندان سے باہر جنسی معشوق کی تلاش کرتی ہیں اس موقع پر بھی طوائفوں کی نفسیات سے متعلق کچھ مشاہدات کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً بظاہر تو طوائف غیر معمولی طور پر عمر کے ابتدائی دور ہی میں اپنے خاندان سے بالکل کٹ چکی ہوتی ہے لیکن اس بظاہر واشگاف اور باغیانہ طرز عمل کی تہہ میں ہمیں ایک مضبوط قسم کی "وابستگی" ملتی ہے۔ وابستگی ایڈی پس صورت حال کا اصطلاحی نام ہے۔

اس صورت حال سے وابستہ ہیجانات نمایاں حد تک منفی روپ میں ڈھلتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہیجانات بچپن کی کثیر تعداد چپقلشوں اور حریفانہ انداز کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ باپ سے وابستہ توقعات پوری نہیں ہوتیں۔ بلکہ ماں سے تعلقات حریفانہ اور حاسدانہ نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ یہ تمام امور اس وقت اپنی صحیح اہمیت لئے ہمارے سامنے آئیں گے۔ جب ہم طوائفیت سے لاشعوری ہم جنسیت کا تجزیہ کریں گے۔

ان طفلانہ جنسی تحریکات میں جو چپقلش ملتی ہے اس کا سب سے اہم نتیجہ اس بعد یا خلیج میں ملتا ہے۔ جو طفلانہ نفسیات کی اہم ترین خصوصیات میں سے ہے۔ ایک طرف جسمانی یا جنسی (شہوانی) احتیاجات ہیں۔ اور دوسری طرف الفت اور عینی (نیوراتی) تصورات ہیں۔ جو طفلانہ الفت سے وابستہ ہیں۔ ان کی اول الذکر سے مفاہمت نہیں ہو پاتی۔ عام بالغانہ زندگی میں اس طور سے "پاک" اور "ناپاک" محبت کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے لیکن یہ دراصل لاشعوری تفریق ہوتی ہے۔ جو مستقل صورت اختیار کر کے اس خلیج کی چوڑائی میں اضافہ ہی کرتی جاتی ہے۔ امتناع کے زیر اثر خاندانی محبت کے جنسی پہلو کو بالعموم دبا دیا جاتا ہے۔ طفلانہ محبت سے وابستہ شہوانی پہلو کو ذہنی طور سے مسترد کرتے ہوئے باقی شعوری تجربات سے نہیں جدا کر دیتی ہے۔ لیکن بالغانہ جنسی تحریکات کی ظہور پذیری کے وقت اس خلیج کا پاٹنا لازمی ہے۔ ورنہ فرد کے لئے جنسی تحریکات اور الفت سے وابستہ ذہنی تصورات کو ایک ہی ہستی پر مرکوز کر دینا مشکل ہو گا۔

بعض اوقات طفلانہ الفت کی پیدا کردہ چپقلش بہت شدید ہوتی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مثلاً جنسیت کی تشکیل کرنے والے اساسی عناصر کی شدت ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان سے وابستہ نفرت و حسد شدید صورت اختیار کر جاتے ہیں یا لاشعوری پہرہ سخت ہوتا ہے۔ ان تجربات سے بالغانہ زندگی میں اس خلیج کی چوڑائی میں اضافہ ہی ہو جاتا ہے اس صورت میں بالغ فرد ایک تخیلی پیکر کی پوجا کرتا رہتا ہے۔ لیکن کسی گوشت پوست کی ہستی سے نارمل جنسی تعلقات کی استواری اس کے بس کا روگ نہیں۔ برعکس صورت میں وہ صرف گھٹیا اور حقیر افراد سے جنسی تسکین حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے گرے ہوئے افراد جن سے وہ محبت نہیں کر سکتا بلکہ بعض صورتوں میں تو وہ ان سے نفرت و کراہت بھی محسوس کرتا ہے۔ طوائفیت کا اس مسترد شدہ تخیلی اور شہوانی محبت کے پیدا کردہ مسائل و مشکلات سے گہرا تعلق ہے۔

بعض اوقات اعلیٰ کردار اور ارفع ذہنی صلاحیتوں کے حامل افراد اپنے آپ کو طوائفوں کی وابستگی سے آزاد نہیں کرا سکتے۔ کیونکہ ایسے لوگ صرف طوائفوں کے ساتھ ہی خود کو مرد محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ اپنی بیویوں کے لئے قطعی نامرد ہوتے ہیں۔ یوں طوائف نفسی مرضیاتی مطالبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم تقریباً تمام جنسی مسائل کے برعکس طوائفیت کے ضمن میں وثوق اور شدت سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ کسی جنسی مسئلہ کے بارے میں اس وقت تک صحیح فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک دونوں فریقین کے باہمی رشتہ کی نوعیت کا تعین نہ کر لیا جائے۔ ابتدائی جنسی تحریکات کی یہ تقسیم بچپن میں نارمل ردعمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ بلوغت میں بھی کم و بیش یہ نارمل ہی رہتی ہے۔ اس وقت بالغانہ جنسیت ان دبائی گئی اور ردعمل کی اولین صورتوں میں سے کئی کو اپنے کام میں لاتی ہے۔ ہم اس مستقل اور مریضانہ خلیج کی نوعیت اور اہمیت اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے۔ جب تک کہ ہم یہ تسلیم نہ کر لیں کہ یہ ایک طرح کا دفاعی طرز عمل ہے یعنی اس صورت میں باپ یا ماں سے وابستہ جنسی خواہشات کو ہٹا کر ان کا رخ دیگر افراد کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ یہ میلان والدین کی مسرور اور کامیاب ازدواجی زندگی کے پیدا کردہ حسد اور جلن سے اور بھی زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔ لڑکے کی صورت میں ماں سے وابستہ تصورات دو رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔

ایک طرف اعلیٰ تصورات ہیں دوسری طرف گھٹیا اور کمتر۔ ان ہی کے زیر اثر "اچھی اور بری" ماں کا تصور جنم لیتا ہے۔ گھٹیا اور کمتر تصورات شعوری یا لاشعوری طور سے ناپسند کئے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی تیز مزاج پسند عورت کا تصور ہے۔ جس نے کم از کم باپ کی صورت میں ایک اور عاشق سے دل لگا رکھا ہو۔ اگر گھر میں مزید بھائی بہن بھی ہوں تو رقابت کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ گویا طفلانہ منطق زیادہ تر لاشعوری ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات بچوں میں اس سے منطقی نتائج اخذ کرنے کی خاصی صلاحیت ملتی ہے اور یوں وہ اپنے "نتائج" کو ان کی انتہا تک ہی پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بچہ "طوائف" کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہوتا ہے نہ ہی وہ بالغانہ انداز میں ہی کے بارے میں سوچ سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اس کا ہیجانی نتیجہ لاشعوری یا ناقابل اظہار ہونے کے باوجود بھی اس کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے۔ بری ماں کا تصور طوائف کا تصور ہے۔ اب یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ طوائف کے بغیر نہ رہنے والا مرد دراصل اپنی طفلانہ محبت کے مرکز سے وابستہ ہوتا ہے۔ یوں کسی شعوری احساس کے ہی بغیر وہ طفلانہ ممنوع خواہشات کی بالغانہ زندگی میں تسکین حاصل کر رہا ہوتا ہے

ادھر طوائف کے ذہن میں بھی کچھ ایسے ہی مقاصد ہوتے ہیں۔ البتہ ان مقاصد میں گاہک کے مقابلہ میں زیادہ تر وسعت ملتی ہے۔ اس کا گاہک اس کے جسم کا سودا چکانے والا "اجنبی مرد" اس کے نزدیک اس کے باپ کا گھٹیا اور کمتر روپ ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ماں کی اندرونی زندگی کا نسائی کردار کے گھناؤنے پن سے ذاتی الحاق اور تحقیر کرتی ہے۔

اس موقع پر اس نکتہ چینی پر زور دینا چاہئے جو آپ کے اذہان میں بھی رونما ہو چکی ہو گی۔ کہ اس نفسی مرضیاتی صورت حال یا نارمل ردعمل کے جواب میں کسی ایک عامل کا نام نہیں لیا جا سکتا تمام ذہنی عوامل ضرورت سے زیادہ شدت کا مظاہرہ کر جاتے ہیں۔ اور طوائفیت بھی استثنائی صورت نہیں۔ مثلاً یہ بالکل واضح ہے۔ کہ جنسی معشوق کی صورت میں طوائف سے تعلقات استوار کرنے والے

مردوں کی تعداد اس کے لئے نفسیاتی لحاظ سے کسی نہ کسی دلچسپی کا باعث ہوتی ہو گی۔ یوں سمجھئے کہ طوائفیں "اکثریت" پر اعتقاد رکھتی ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آزاد جنسی تعلقات — جو کہ صرف طوائفوں ہی کی خصوصیت نہیں۔ لاشعوری دفاع کا ایک انداز ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ لاشعوری طور سے ایک کی بجائے کئی کے لئے عمل انتقال کلی طور سے دفاعی ہی ہوتا ہے نہ ہی ہم اسے صرف شہوانی تحریکات سے مخصوص قرار دے سکتے ہیں۔ عمل انتقال بنیادی طور سے مطابقت کا ایک انداز ہے۔ اگر ہم اپنی طفلانہ دلچسپیوں کا دائرہ وسیع نہیں کرتے اور انہیں دوسرے افراد پر منتقل نہیں کرتے تو ہم نارمل سماجی احساسات سے عاری رہیں گے۔ لیکن آزاد جنسی تعلقات کے لئے ایسی تحریک جس کے آگے فرد خود کو بے بس محسوس کرتا ہو صرف دفاعی انداز ہی نہیں بلکہ دبائی گئی خواہشات کی مظہر بھی ہوتی ہے۔ اس صورت میں اپنے طرز عمل سے گویا اس کی تکذیب کر دی جائے گی کہ طفلانہ الفت کا ایک اور صرف ایک ہی مرکز تھا۔ ساتھ ہی یہ اس لاشعوری تلاش و جستجو کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ جو ایک اور صرف ایک اور گم ممنوعہ محبت کے لئے ہوتا ہے —

یہاں ایک ایسے مرد کی دلچسپ مثال پیش کی جاتی ہے جس کی تمام جنسی زندگی صرف ایک فعل کے گرد گردش کناں تھی وہ معروف اور بارونق شاہراہوں پر گھومتا رہتا اور کسی اجنبی عورت کو دیکھ کر سلام کے طور پر سر سے ہیٹ اتار دیتا۔ اگر وہ بھی جواب دیتی تو یہ اس کے ساتھ ساتھ تقریباً سو گز تک چلتا جاتا اس کے بعد دوبارہ سر سے ہیٹ اتار کر اسے سلام کرتا اور اس سے رخصت ہو جاتا۔ اس موقع پر وہ منزل ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس عجیب و غریب طرز عمل کے کئی بواعث ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں اس موقع پر طوائفیت کی تشکیل کرنے والے ایک ثانوی عنصر کی مثال دینا چاہتا ہوں یعنی لاشعوری طفلانہ جنسی خواہشات کا انتقال!

پیشہ یا کردار کے لحاظ سے طوائفیت اپنانے کے لئے کئی عوامل کا نام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس موقع پر طوائفوں کے بارے میں کی گئی بلاواسطہ تحقیقات پر مبنی نتائج کا جائزہ زیادہ سود مند رہے گا۔ فی الحال جو کچھ اب تک ثابت کیا ہے اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ اول تو یہ ہے۔ کہ طوائفیت کا دیگر مسائل سے جدا کرتے ہوئے جائزہ لینا مشکل ہے یہ تو کل مسئلہ۔ انسانی معاملات میں جنسیت کے کردار کا ایک جز و ہے۔ دوم — ابتدائی طفلانہ جنسی تحریکات کا جائزہ لینے سے پیشہ ور طوائف بننے کی وجوہات جانی جا سکتی ہیں۔

سوئم — اگر مرد کی جنسی نشوونما کا جائزہ نہ لیا جائے۔ تو ہم اس مسئلہ کو سمجھ ہی نہیں سکتے

چہارم — ہمارے پاس بعض ایسے شواہد موجود ہیں۔ جن کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نارمل بالغانہ جنسی زندگی کے برعکس طوائفانہ جنسی زندگی زیادہ تر طفلانہ ہوتی ہے۔ ان کا گہرا یا نہ حرکات سے زیادہ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ بالغانہ الفت کے بحر بیکراں میں ایک الگ تھلگ جزیرہ کی صورت رکھتی ہے۔ بلکہ عمومی لحاظ سے ان میں سماجی تحریکات کا بھی ایک حد تک فقدان ملتا ہے ہم دریا کو کوزہ میں یوں بند کر سکتے ہیں۔ طوائفیت مراجعانہ خصائص کی مظہر اور جنسی نشوونما میں مریضانہ رجحانات کی نشاندہی کرتی ہے۔ الغرض یہ ایک طرح کی جنسی پسماندگی ہے!

— اور اب وہ موقع آ گیا ہے کہ ہم طوائفوں کے مخصوص گروہوں کے دانشمندانہ جائزے سے اس مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ سب سے پہلے تو تحقیقات سے ثابت شدہ یہ امر واضح کر دوں کہ بعض طوائفوں میں سے کم از کم ۷۰ فی صد ذہنی اور ہیجانی لحاظ سے ناپختہ پائی گئیں۔ اس مقصد کے لئے منتخب کی گئی طوائفوں کے انتخاب میں خامیوں اور معاشرہ میں عمومی ذہنی اور عقلی سطح کی کمی سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ امر مسلم ہے کہ طوائفوں کو عموماً ذہنی لحاظ سے خاصا پسماندہ پایا گیا ہے اسے محض اتفاق نہ سمجھنا چاہئے۔ ویسے ہمیں یہ بھی تسلیم کر لینا چاہئے کہ اس مسئلہ پر ہماری تحقیقات اور جائزے کسی طور سے بھی مکمل قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اس لئے کہ ایک "عام طوائف" کے کردار اور اہمیت کو ابھی پورے طور سے نہیں سمجھا جا سکا اور آخری نتیجہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں علم الانسان اور سماجی علوم پر مبنی کئی تحقیقات کی ضرورت ہو گی خصوصیت سے قدیم مذاہب اور غیر متمدن معاشروں میں طوائف کے ادا کردہ کردار کی اہمیت ایسے علوم سے ہی متعین کی جا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شرافت کے پردہ میں لپٹی ہوئی طوائفوں (مثلاً دولت کی بھوکی عورتوں کی نفسیات) کا مسئلہ بھی ہے۔

اس ضمن میں طوائفیت کے ساتھ ازدواجی وفاداری کا جائزہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ بارہا یہ کہا جا چکا ہے کہ یک زوجگی کی قیمت طوائفیت کی صورت میں ادا کی جاتی ہے۔ مگر ہم اس مختصر سے مضمون میں ان تمام امور پر بحث نہیں کر سکتے۔ لیکن ان تحقیقات کے نتائج خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں میرے خیال میں اس امر پر اعتماد طریقہ سے زور دیا جا سکتا ہے کہ طوائفیت ہمیں کتنی عام اور نارمل کیوں نہ معلوم ہو طوائفانہ کردار مراجعت پر مبنی رجحانات کا غماز ہے اور اسی نقطۂ نظر سے ان لوگوں کو جواب دیا جا سکتا ہے۔ جن کے خیال میں طوائفیت "لازمی شر" کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن طوائفیت کو صرف مراجعانہ کردار قرار دے دینے سے مسئلہ سلجھ نہیں جاتا۔ کیونکہ اگر صرف یہی وجہ ہو تو اسے مراجعانہ ذہنی کردار پر بھی منطبق ہونا چاہیئے اور اس کا انتہائی مثالوں سے قطع نظر — درمیانی صورت حال میں۔ — ہیجانی بوجھ سے متاثر ہونا لازمی ہے۔ نفسی مرضیات کا یہ ایک مسلمہ اور عام مشاہدہ ہے کہ ذہنی انتشار کے پیدا کرنے میں ہیجانی بوجھ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اسی سے ہم ایک اور سوال سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ بوجھ کس حد تک ہیجانی اور ذاتی ہے اور کس حد تک ماحول ان کا ذمہ دار!

مجھے طوائفیت میں عمومی نوعیت کے نفسیاتی امور کی مفصل وضاحت کے لئے کسی طور سے بھی معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اب یہ امر طے شدہ سمجھا جاتا ہے کہ مرض پیدا کرنے کے فوری بواعث سے قطع نظر بالغانہ ذہنی انتشار پر طفلانہ ذہن کی نشوونما کا مطالعہ صحیح طور سے روشنی ڈالتا ہے۔ تاہم اس نوع کا مضمون طوائفیت کے بلاواسطہ جائزوں سے استفادہ کے بغیر نامکمل رہے گا۔

اس ضمن میں سب سے پہلی مشکل یہ ہے کہ عورت کی ایسی کوئی قسم نہیں ہے جسے طوائفانہ قرار دیا جا سکے۔ یہ اصطلاح۔ اپنے مقبولِ عام ہونے کے باوجود۔ دراصل قانونی معنی رکھتی ہے تمام قانونی اصطلاحات اور ان کی تعریف سماجی معائیر کے مطابق ہوتی ہے۔ اس لئے ماہرین قانون سے یہ توقع رکھنی بے جا ہے۔ کہ انسان کردار کی خامیوں پر قانونی لیبل لگاتے وقت انہوں نے نفسیات کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا ہو گا۔ یہ ایسی خامی بدقسمتی ہے کیوں کہ سرقہ کی طرح ہی طوائفیت میں بھی تنوع کی بوقلمونی ملتی ہے۔ ویسے سرقہ ایک ایسا جرم ہے جس کا یوں بھی طوائفیت سے خاصہ قریبی تعلق ہے۔ طوائفیت کی درجہ بندی کے بغیر اس کی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں طوائفوں سے مشابہہ دیگر عورتوں کا بھی تفصیلی جائزہ لینا ہو گا۔ مثلاً جوش و خروش سے معمور نام کار عورت، دولت کی بھوکی اور محض پیسے کی خاطر شادی کرنے والی عورت!

اس سلسلہ میں "ظلم جہیز" اور شادی کے نام پر لین دین کا جائزہ لینے پر بھی مجبور ہو جاتے لیکن ہم اپنے مطالعہ کو اتنا وسیع نہ کرتے ہوئے صرف ان عورتوں تک ہی محدود ہیں۔ مغرب میں پولیس کی عدالتوں کے ریکارڈ کے سرسری جائزہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ طوائفوں کو باآسانی تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام طوائفوں کو ایسے ریکارڈ کی بناء پر صرف تین گروہوں ہی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو صرف ایسی طوائفیں ہیں جو سماجی مسئلہ کی صورت اختیار کر لینے کے باعث پولیس کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔)

اولیت سڑکوں پر گاہک پھانسنے والی "کسبیوں" کی ہے۔ ان میں سے اکثریت کے لئے یہ پیشہ ازلی حیثیت رکھتا ہے انہیں اپنی حالت کا احساس نہیں اور مایوس کن حد تک ان کا طرز عمل تجزیہ

ہوتا ہے ان میں سے اگرچہ ذہنی طور سے پسماندہ ہیں تو کچھ ذہنی انتشار کی شکار۔ بعض نے جرائم پسند افراد سے تعلقات بھی استوار کئے ہوتے ہیں۔ اکثریت شراب اور منشیات کی عادی ہی نہیں تھی۔ بلکہ اس معاملہ میں انتہا پسندی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ان میں معقول تعداد ایسی عورتوں کی ہے جنہوں نے عنفوان شباب کے ہیجانی انتشار کو اس پیشہ کا باعث قرار دیا۔ ان میں سے اکثریت پیشہ چھوڑ سکتی ہے۔ اور ایک کم تعداد اسے مستقلاً اپنائے رکھتی ہے۔

ان گھٹی ہٹی کیسوں اور ٹکھیایوں کے برعکس "نوجوان" طوائفیں ہیں۔ یہ کم عمر لڑکیاں تازہ جوانی کے نشہ میں چور اچھی خاصی ذہانت کے باوجود عیش و عشرت کے سبز باغ دیکھ کر یہ پیشہ اپنا لیتی ہیں۔ غیر ذمہ داری، باغیانہ پن، معاندانہ رویہ کے ساتھ ساتھ بعض اوقات یہ لاتعلقی اور سہل انگاری کا مظاہرہ بھی کرتی ہیں۔ ان میں سے اکثریت میں قبولیت کا مادہ ملتا ہے جس کے باعث جلد ہی یہ معمر "پیشہ وروں" کے ورغلانے سے اس راستہ پر آنکلتی ہیں۔ یہ ہمیشہ پیسے کی کمی کی شاکی رہتی ہیں۔ کبھی مستقبل کے لئے اظہار پریشانی نہیں کرتیں۔ بلکہ ہمیشہ لاپرواہی سے کام لیتی ہیں۔ لیکن ان سب خامیوں کے باوجود یہ سماجی اثرات کو جلد قبول کر لیتی ہیں۔ اس لئے موزوں اور مناسب ماحول میسر آنے پر ان کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور یہ عام گھریلو زندگی بسر کر سکتی ہیں۔

ان دو انتہاؤں کے درمیان خاصہ تنوع ملتا ہے۔ ان میں سے "خوشحال" طوائف نمایاں ہے پولیس اس کے کاروبار سے واقف ہوتی ہے۔ مگر یہ اپنی چالاکی یا کاروباری صلاحیتوں کی بنا پر عموماً پولیس کے قابو نہیں آتی۔ کرداری لچک اور غیر متوازن طبائع کے باوجود ان میں اتنی ذہانت ہوتی ہے۔ کہ یہ اپنے کاروباری امور کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔ گو ان کے ہاں دولت کی ریل پیل نظر آتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ اپنی زندگی سے غیر مطمئن ہوتی ہیں اور اس سے ان میں تلون مزاجی اور بے چینی پیدا ہو کر انہیں ہر نوع کی انتہاؤں تک لے جانے کی موجب بنتی ہے پھر "محتاط" طوائف بھی ہے۔ جو کچھ دیر رنگ رلیاں منانے کے بعد تھوڑی مدت کے لئے کسی ایک کی داشتہ بن جاتی ہے۔ ایسی عورتیں بالآخر ان مجرد عورتوں کے روپ میں ظاہر ہوتی ہیں جن کی سبھی عزت کرتے ہیں۔ اور گھریلو معاملات میں جن کے خیالات قدامت پسندی پر مبنی ہوتے ہیں۔ طوائفوں کی اس قسم سے وہ مخصوص قسم کی اقلیت جنم لیتی ہے۔ جو کبھی بھی پولیس کے قابو نہیں آتی ہے۔

المختصر، طوائفوں کی کئی طریقوں سے درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً عمر، سماجی حیثیت، کامیابی، طبائع، جنسی کردار کے متنوع طریقوں میں سے کسی خاص کی ترجیح، شہرت، ذہنی پسماندگی یا غیر معمولی پن، کس حد تک دیگر مجرمانہ حرکات کی جاتی ہیں۔ اور سب سے آخر میں ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا آخری باب۔ کیا یہ اختتام حیض کے بعد بھی مرتے دم تک ہی طوائف رہتی ہے۔ کہ یہ پیشہ وقتی اور عارضی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر طرح کی طوائف کے بارے میں ہمارے پاس مکمل نفسیاتی تحقیقات پر مبنی مواد نہیں اس لئے صرف چند تسلیم شدہ عمومی اصولوں تک ہی خود کو محدود رکھنا پڑتا ہے۔ ان عمومی اصولوں کی صداقت کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ صرف تجربہ کار طوائفوں ہی میں نہیں بلکہ ان نوجوان لڑکیوں میں بھی مریضانہ رجحانات ملتے ہیں۔ جو بعد ازاں خود تجربہ کار طوائفیں بنتی ہیں۔

تجربہ کار طوائفوں کی اکثریت میں جنسی سرد مہری ملتی ہے۔ یعنی یہ عموماً جنسی فعل سے جسمانی یا ذہنی لذت اخذ نہیں کرتیں۔ خصوصیت سے جنسی کردار کی آسودگی اور ہیجان شہوت ان کے لئے محال ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ نیم دانی بلکہ بظاہر نارمل عورتوں میں بھی کسی نہ کسی انداز سے جنسی کردار کی سرد مہری پائی جا سکتی ہے۔ گو یا طوائفوں میں جنسی سرد مہری بعض دیگر عوامل کے ساتھ مل کر اہمیت اختیار کرتی ہے۔ یہ تمام ذہنی غیر معمولی پن پر ہی صادق آتا ہے۔ کیونکہ بہت سے عوامل —

شعوری اور واضح کے ساتھ ساتھ لاشعوری۔ مل کر ذہن میں ابنارمل حالت پیدا کرتے ہیں۔ طوائفوں کی صورت میں جنسی سرد مہری کے ساتھ ساتھ ملنے والے دیگر اہم عوامل لاشعوری ہم جنسیت اور مردوں کے لئے لاشعوری معاندانہ رویہ ہیں۔ ان میں سے اول الذکر اور آشکارہ ہم جنسیت میں امتیاز کر لینا ضروری ہے۔ آشکارہ ہم جنسیت شعوری اور باضابطہ قسم کی بالغانہ جنسی کجروی ہے جبکہ لاشعوری ہم جنسیت میں شعوری ہم جنس پرستی سے کسی قسم کی دلچسپی لینے کی کوئی ضرورت نہیں اس اصطلاح کا یہ مطلب ہے کہ طفلانہ جنسیت کی تشکیل کے دور میں بچے نے جنسی تحریک کا رخ والدین میں سے مخالف جنس کی بجائے ہم جنس کی طرف موڑ دیا۔ یہ ایک طرح کا دفاعی انداز ہے۔ جو جسمانی و ذہنی خصائص کے ساتھ مل کر تمام نارمل جنسی نشوونما کی راہ میں رکاوٹ بنا رہتا ہے۔ کیونکہ طفلانہ جنسیت پر مبنی میلانات دبا دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے بالغانہ زندگی میں یا تو مخالف جنسیت سے غیر متوازن قسم کی مطابقت کی صورت میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ یا پھر یہ کرداری بوالعجبیوں اور عجیب و غریب سماجی ردعمل کی صورت اختیار کرتی ہے۔ ایسی صورتوں میں شعوری طور سے مردوں کے لئے خاصا معاندانہ رویہ پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شدید قسم کا لاشعوری حسد بھی ملتا ہے۔ یہ نر دشمنی "مرد کو باپ کا متبادل تصور کرنے کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ عہد طفلی میں باپ سے وابستہ کردہ توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ اس لئے اسے محض ایک اتفاق نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ طوائفوں کی اکثریت اپنے گاہکوں کو ناپسند ہی نہیں کرتی بلکہ بعض اوقات مرد کو اس احساس ناپسندیدگی کے ہاتھوں (لاشعوری یا شعوری) زخم بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

طوائف مردوں کو صرف لوٹتی نہیں۔ بلکہ وہ سرقہ سے بھی گریز نہیں کرتی۔ جیسے کہ ابھی بتایا گیا ہے مرد اس شعوری یا لاشعوری احساس ناپسندیدگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے گاہک اور طوائف کی جنسی زندگی میں واضح یا ڈھکے چھپے انداز سے آزار پسندی کا عنصر نمایاں ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر دونوں کے طرز عمل کی پیدا کردہ تکلیف کو مدنظر رکھیں۔ تو یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آزار پسندی کے ساتھ ساتھ لاشعوری ایذا پرستی بھی شامل ہے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ طوائف کی تشکیل میں ابتدائی جنسی زندگی سے وابستہ مجرمانہ احساسات اہم تربیتی کردار ادا کرتے ہیں۔ بلکہ شواہد تو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ طوائف کی زندگی شدید مخالف جنسی خواہشات کا اظہار نہیں کرتی بلکہ اس کا جنسی کردار تو فطری جنسیت کی تکذیب کرتا ہے۔ اور کیونکہ اس کی زندگی فطری جنسیت کے منافی ہے اس لئے طوائف کا کردار غیر متمدن اخلاق کا مظہر بن جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے بعض اصحاب کو یہ نتیجہ احمقانہ معلوم ہو لیکن سماج دشمن عناصر اور نیوراتی افراد کی صورت میں بھی اس غیر متمدن (لاشعوری) ضمیر کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اب ہم اس گروہ کی طرف آتے ہیں۔ جو ان نوجوان اور کم عمر لڑکیوں پر مشتمل ہے جو قبل از وقت طوائفیں بن جاتی ہیں۔ میں یہ واضح کر دوں کہ اس دور میں ہم صرف جنسیت پر تمام زور نہیں دے سکتے۔ بلکہ ان کے بارے میں کسی قسم کی تحقیقات سے قبل لڑکی کے تین سے پانچ سال کی عمر کے درمیان جنسی ردعمل کا مطالعہ لازمی ہو جاتا ہے بلکہ اس عمر کے لڑکوں کے جنسی ردعمل کا مطالعہ جائزہ کو مزید مکمل کر دیتا ہے۔

بعض اوقات والدین غصہ میں چھوٹی بیٹی کو "کنجری" یا "کنجنی" کہہ کر گویا اس امر کی خود ہی توثیق کر دیتے ہیں۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ عنفوان شباب میں لڑکیاں "کم عمر عورتیں" ہی نہیں بلکہ "کم عمر بچیاں" بھی ہوتی ہیں۔ بالفاظ دیگر بلوغت کا اولیں دور رجعت پسندانہ اور ترقی پسندانہ میلانات سے عبارت ہوتا ہے۔

کم عمر طوائفوں کے مطالعہ کے لئے سب سے سہل اور سودمند طریقہ مجرم بچوں کا جائزہ ہے۔ مجرم لڑکیوں کے طرز عمل کے مجموعی مطالعہ کی رو سے تو سکول سے غالباً بھاگنا، آوارہ گردی، چوری اور اسی قبیل کے دیگر افعال و حرکات کا جنسی کارکردگی سے گہرا رابطہ ثابت ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی حد سے قانونی زد میں آ

جانے والی ایسی کم عمر اور نوجوان لڑکیوں کے جنسی رجحانات کی بناء پر ان کے طوائف بننے کی پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔

اس ضمن میں یہ امر اہمیت رکھتا ہے کہ تجربہ یہ ان لڑکیوں میں وہ تمام لاشعوری عناصر ملتے ہیں جو تجربہ کار طوائفوں کی خصوصیت ہوتے ہیں۔ ان کے سطحی مظاہر میں تغیرات مل سکتے ہیں۔ مگر لاشعوری حوالوں میں ہمیشہ یکسانی ملتی ہے۔ اس کے برعکس ماحول اور معاشرے کے اثرات کی پہچان نہیں تجربہ کار سماجی کارکن کسی حد تک ان کی جانچ ٹھیک کر سکتا ہے۔ اور یہ نہ بھولئے کہ تجربہ کار طوائفیں داستان حیات سنانے میں ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیتی ہیں۔ اس لئے داستان حیات پر کسی طور سے بھی انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ کم عمری میں طوائفیت اپنانے والی عورتوں کی صورت میں اقتصادی حالات کی ثانوی اہمیت ہے۔ ان سب پر مستزاد یہ امر زیادہ اہم اور توجہ طلب ہے کہ اوائل طفلی اور بعد ازاں بچپن میں انہیں والدین اور کنبہ کی مناسب محبت میسر نہ تھی۔ تو طوائفیت کے لئے اقتصادی مشکلات نہیں۔ بچہ خود کو غیر محفوظ کرتا ہے۔ اکثر صورتوں میں بچہ کو کنبہ کی محبت بقدر ضرورت میسر نہیں آتی۔ یا اس صورت میں کہ کوئی خاندان ہوں۔

طوائفیت کی طرف لے جانے والے عوامل میں بلحاظ اہمیت دوسرے نمبر پر والدین کی غیر متوازن جنسی زندگی ہے۔ یہ امر عموماً فراموش کر دیا جاتا ہے کہ ننھے بچوں کی آنکھیں "عقابی" ہوتی ہیں۔ اور خواہ والدین اپنے اختلافات اور جھگڑے چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں۔ بچے ازدواجی اختلافات، بے وفائیوں اور جھگڑوں کو فوراً ہی محسوس کر لیتے ہیں۔ ان کے نفسیاتی اثرات والدین کی مثال کی صورت میں اتنے نہیں رونما ہوتے جتنے ان کے طرز عمل کے پیدا کردہ لاشعوری معاندانہ رویہ کی صورت میں لڑکی۔ جس نے بعد ازاں طوائف بننا ہے۔ اپنے والدین کی جنسی زندگی کی لذت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف انتقام کا اظہار بھی کرتی ہے۔ جب طوائف بننے کے بعد اس کی زندگی بے سود جنسی دفوعات کا ایک لامتناہی سلسلہ بن جاتی ہے تو وہ گویا اپنے طور سے والدین کی جنسی زندگی اور انداز الفت کا مذاق اڑاتی ہے۔ کچھ یہی حال چکلے کے چوہدری کا ہوتا ہے جو اپنے طرز عمل سے گھریلو زندگی کی گویا تحقیر کرتا ہے۔ بلکہ میرے خیال میں تو طوائفیت کا جائزہ اس وقت تک مفصل اور مکمل کہلا ہی نہیں سکتا۔ جب تک طوائف اور اس کے گاہکوں کے ساتھ ساتھ چکلے چلانے والوں ان کے چیلے چانٹوں اور دلالوں کو بھی دائرۂ تحقیقات میں شامل نہ کیا جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس ایسی قابل اعتماد تحقیقات موجود نہیں ہیں۔

ہاں! تو ہم ان کم عمر لڑکیوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ جو بعد ازاں طوائفیت کا بحیثیت پیشہ انتخاب کرتی ہیں۔ ان میں عدم تحفظ محبت میں عدم تحفظ کے نفسیاتی احساس کے ساتھ ساتھ عدم توجہ کا بدلہ لینے کی لاشعوری تحریک بھی ملتی ہے۔ اس کی کئی وجوہات میں سے جنسیت کے بارے میں معقول اور ہمدردانہ راہنمائی اور ہدایات کا فقدان نمایاں ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ والدین کے جھوٹ اور تصنع بچوں کے جنسی انحرافات کے کس حد تک ذمہ دار ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں آوارہ گردی، سکول سے بھاگنا اور چھوٹی موٹی چوریاں جنسی انحرافات کے بغیر بھی مل سکتی ہیں۔ لیکن یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ اب تمام کرداری خامیوں کا سراغ اس احساس میں مل سکتا ہے پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک عام اور جانی پہچانی حقیقت ہے کہ جو بچے میٹھا کھانے سے باز نہیں رکھ سکتے یا مٹھائی اور پیسے چرانے والے بچے یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے ذہن میں مٹھائی اور پیسے والدین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چنانچہ گویا والدین کی گمشدہ محبت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے وہ محبت جو ہم ریفوں۔ دیگر افراد کنبہ نے غصب کر لی تھی۔

یہ عوامل اس متنازعہ فیہ دفعہ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ جس پر عموماً سماجی معلمین اظہار تعجب کیا کرتے ہیں۔ تمام جرائم بشمولیت جنسی خام کرداری کے ضمن میں آنکھیں بند کر کے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ سماج

دشمن کردار کا باعث صرف اقتصادی مشکلات ہیں مثلاً عورتیں صرف پیٹ کی خاطر جسم بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ گو دنیا کے اکثر ممالک کا معیار زیست اتنا بلند نہیں لیکن ایسے ممالک میں طوائفیت کا تناسب بھی تھوڑا ہوتا ہے۔ اس عجیب مفروضہ کے خلاف شک و شبہ پیدا کرنے والے کئی شواہد ہیں۔ میں عجیب اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جنسی کردار کی خامیوں کا باعث جنسی تحریک کی خامی کو ٹھہرانا زیادہ فطری اور درست ہے۔ اقتصادی وجہ بیان کرنے والے اصحاب کی اکثریت نے "کیسوں" کی داستانوں پر یقین کر لیا ہے۔ جیسے کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ان کی داستانیں جھوٹ اور مبالغہ سے بھری ہوتی ہیں۔ اس لئے ناقابل یقین ہیں اور تجربہ کار سماجی کارکن جھوٹ کے اس پردہ میں چھپی ہوئی ہیجانی الجھنوں کو واضح کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں کم عمر بچیوں کی جنسی بے اعتدالیاں اقتصادی وجوہات سے آزاد ہوتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ عنفوان شباب میں طوائف بننے والی لڑکی دولت کے سبز خوابوں کی شکار ہوتی ہے۔ لیکن اس میں اقتصادی مشکلات کا اتنا ہاتھ نہیں ہوتا۔ جتنا دولت سے خریدی جانے والی پرمسرت اور پرتعیش زندگی کا لالچ! پیسہ اس سلسلہ میں آتا بھی ہے تو وہ محولا بالا نفسیاتی وجہ سے۔ یوں روپے پیسے محبت کے لاشعوری مظہر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ایک کنجوس مکھی چوس کی صورت میں یہ محبت شعوری روپ دھار لیتی ہے۔ تاہم یہ محبت کی ادنی قسم ہے اور جدید معاشرہ نے نفسیات سے عدم واقفیت کے باوجود بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے۔ اسی لئے تو طوائف کی محبت کو جھوٹ، تصنع پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ امر باعث دلچسپی ہوگا کہ طوائف لاشعوری طور سے روپے پیسے کو جسمانی اخراج (بول و براز) کا ہم پلہ سمجھتی ہے۔ اور طفلانہ جنسیت کی رو سے یہ بچہ کے لئے متاع بے بہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتداء میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ محبت کے طفلانہ مظاہر مبرزی اور مجری (بولی) جنسیت کے عناصر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر بالغانہ محبت کے انحرافات میں جنسی نشو و نما کے ابتدائی دور کے آثار ملیں۔ تو یہ باعث تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے اگر ژرف نگاہی سے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ طوائف اپنے جسم کی "گندے اور حقیر روپے پیسے" کی صورت میں قیمت طلب کرتی ہے۔ تو سطحی صورت سے قطع نظر نفسیاتی لحاظ سے یہ نہ تو تعجب خیز ہے اور نہ ہی غیر فطری۔ بلکہ ہمارے اس دعویٰ کے حق میں ایک اور ثبوت ہے کہ طوائف کا کردار مراجعت پر مبنی ہے۔ ماحولی اثرات کے اس مختصر سے جائزہ کے اختتام پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ طوائفیت کے محرکات میں اقتصادی اور رہائشی مشکلات کا کردار ذیلی اور ثانوی ہے۔ ماحول کے جو اثرات لڑکی کو طوائف بناتے ہیں۔ وہ بھی نفسیاتی ہیں بخصوصیت سے بچوں کی نگہداشت کا وہ طریقہ جس سے بچوں میں محبت کے لحاظ سے عدم تحفظ کے احساسات جنم لے کر اسے نارمل جنسیت کے خلاف برسرپیکار کر دیتے ہیں۔ یہ اثرات ان گھرانوں میں اور بھی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ جہاں والدین کی جنسی زندگی اور طوائفانہ کردار میں مطابقت تلاش کی جا سکتی ہو۔ اس سلسلہ میں واضح رہے کہ یہ عوامل صرف اسی صورت میں فعال کردار ادا کر پاتے ہیں۔ جب طوائف کی نفسیاتی تشکیل ان کے لئے سازگار ثابت ہو سکتی ہو۔ اور یہ نفسیاتی تشکیل خود اس کی نشو و نما کے انداز کی مرہون منت ہے۔ لیکن ہم ساخت کے پیدا کردہ اثرات بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بالفاظ دیگر طوائف کی فطری اور طبعی خصوصیات۔ لیکن بڑھتی ہوئی نفسیاتی تحقیقات ذہنی انتشار کی متنوع صورتوں میں ساخت کی خرابیوں کی اہمیت میں تقلیل کرتی جا رہی ہیں۔

طوائفیت کی نفسی مرضیات کے اس مختصر اور نامکمل سے جائزہ سے میرا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ گو نفسی مرضیات کے ماہر کی اولین دلچسپی معالجہ سے نہیں بلکہ مرض اور اس کی وجوہات سے ہوتی ہے لیکن شخصیت کے متذکرہ مریضانہ رجحانات کی درستی کے لئے جو معالجاتی طریق کار وضع کئے گئے ہیں۔ ان کا تذکرہ نہ کرنا پیشہ ورانہ کوتاہی ہوگی۔ پھر یہ مجلس مذاکرہ بھی کیونکہ طوائفوں کی اسی قسم سے بحث کر رہی ہے۔ جو معاشرہ میں تسلیم کی جاتی ہے۔ تو کیوں نہ میں بھی اسی سے آغاز کروں۔ نفسی مرضیاتی نقطۂ نظر سے چکلے برداشت کرنے کا مطلب ہے۔ کہ معاشرہ طوائف اور اس کے مسئلہ دونوں کو تسلیم اور برداشت کر رہا ہے۔ گویا معاشرہ اس مریضانہ صورت حال کی سرپرستی کرتا ہے۔ عام جو الف

کے بارے میں ہمارے خیالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اس "لازمی شر" کو ہم کسی نگاہ سے ہی کیوں نہ دیکھتے ہوں۔ مگر ہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ طوائفیت جنسی پسماندگی کی مظہر ہے جو بیشتر جگہ پر کسی حد تک سماجی پسماندگی کی نشاندہی کرتی ہے۔ قحبہ خانوں سے امراض خبیثہ میں کمی کرنے والی بات اگر صحیح ہو تو بھی لایعنی ضرور ہے جنگ کے زمانہ میں حفظان صحت کے اصولوں سے کسی ساحلی علاقہ میں ملیریا کے انسداد کی بنا پر ملیریا جنگ سے ختم کرنے کا دعوی نہیں کیا جاسکتا یا اسے جنگ کا جواز نہیں بنایا جاسکتا۔ جہاں تک جبری طوائفیت کا تعلق ہے تو یہ ان اصولوں کو پاؤں تلے روندنے کے مترادف ہے جن سے انسانی معاشرہ میں توازن اور ثبات پیدا ہوتا ہے۔

جس آسانی سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ اگر ہم اس آسانی سے یہ سمجھ بیٹھیں کہ دباؤ، پابندیوں اور امتناعات پر مبنی طریقوں سے جس طرح سماجی لحاظ سے برداشت کی جانے والی طوائفوں کو روکتے ہیں۔ اسی طرح طوائفیت کا مسئلہ بھی ختم کیا جاسکتا ہے۔ تو یہ بالکل احمقانہ طرز استدلال ہوگا اور میرے خیال میں آپ حضرات میں سے کبھی کوئی ایسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوگا۔ اگر ہم طوائفیت کو پسماندگی کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ تو یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر ممکن — سماجی اور نفسیاتی — طریقے سے یہ خامی دور کرنے کی کوشش کرے۔ معاشرہ کی مجموعی خامیوں اور نسل انسانی کو وراثت میں ملنے والی توانائی کے ردعمل کے نتائج سے انفرادی سطح پر چھوٹی موٹی انجمنوں کی صورت میں محدود ذرائع سے برسرپیکار ہونا بے سود ثابت ہوگا۔ اس مسئلہ کو تو وسیع طریقہ سے حل کرنے کی سعی کرنی ہوگی۔ گو انفرادی لحاظ سے طوائفوں کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم نفسیاتی امداد سے طوائفیت کا مسئلہ ختم نہیں کر سکتے۔ طوائفوں کی تعداد میں کمی کرنے کے لئے ہمیں آداب جنس روایات تعلیم اور قواعد و ضوابط کے تمام نظام کو تبدیل کرنا ہوگا۔ یہ صرف تصوراتی معاملہ نہیں گو تمام انسانی افعال میں جو جنسی کردار پر مبنی اعداد و شمار — واضح وجوہات کی بناء پر قطعی قابل وثوق نہیں لیکن بعض بلاواسطہ شواہد قابل توجہ ہیں۔ گذشتہ جنگ کے بعد سے دونوں جنسوں کے باہمی تعلقات کے ضمن میں خیالات، کردار اور انداز نظر میں خاصی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ ادھر سماجی اور اقتصادی لحاظ سے عورت کا مقام ایک حد تک تبدیل ہوگیا۔ مذہبی اور اخلاقی قیود میں ایک حد تک نرمی پیدا ہوگئی۔ مانع حمل تدابیر کی کامیابی میں اضافہ ناجائز بچوں کے خوف میں کمی اور جنسیت کے بارے میں جدید نفسیاتی تحقیقات سے واقفیت — ان تمام عوامل نے مل کر اب قبل از ازدواج اور غیر ازدواجی جنسی تعلقات کے لحاظ سے عوام کے اذہان میں خاصی کشادگی اور وسعت نظر پیدا کردی ہے۔ اس سے ہم باآسانی یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں۔ کہ اب پیشہ ور طوائفوں کی تعداد میں پہلے کی نسبت ایک حد تک کمی واقع ہوگئی ہے۔ یہ اپنی جگہ پر درست لیکن اس کے باوجود جنسی کردار کے ضمن میں انفرادی اور سماجی طرز عمل ابھی تک غیر عقلی خوف، تشویش اور احساس جرم سے متاثر ہوتا ہے۔ جو اپنے طور سے ہر نوع کی توہمات کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ردعمل شعوری اور لاشعوری دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ اس لئے طوائفیت سے متعلقہ قوانین اور سماجی ضوابط کسی حد تک غیر عقلی اور توہماتی ہیں۔ اگر میں یہ تجویز پیش کروں کہ اس طرز عمل میں تبدیلی کی تحریک کا آغاز حکومت کرے۔ تو میں اپنے مضمون کی حدود سے باہر ہو جاتا ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ تو اس کے دائرہ میں شادی اور طلاق سے وابستہ ضوابط بھی آجاتے ہیں۔ معاشرہ اپنے طور سے ازدواجی اخلاقیات میں تبدیلیاں کرسکتا ہے۔ شوق محبت سے عاری شادیوں کو زیادہ برداشت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ایسے موضوعات ہیں۔ جن پر علمی جوجوی بحثیں چھڑ سکتی ہیں۔

ہمیں ان عملی اقدامات سے چشم پوشی نہ کرنی چاہیئے۔ جو کوئی بھی روشن خیال معاشرہ کرسکتا ہے ان اقدامات کی درجہ بندی مقاصد کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔ انفرادی، اجتماعی، نفسیاتی، سماجی محرکات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ یوں گویا اقتصادی محرک ثانوی ضرورت بن جاتا ہے۔ لیکن میں نے اقتصادی مقصد کو یوں جداگانہ حیثیت دی کہ عوام میں یہ غلط عقیدہ مقبول ہے۔ کہ طوائفیت کا سب سے بڑا باعث اقتصادی مشکلات ہیں۔ یہ اقتصادی وجوہ اپنے طور سے بعض مخصوص نوعیت کے نفسیاتی بواعث کی پیدا کردہ ہوتی ہے اس امر کی کوئی بھی تکذیب نہ کرے گا۔ کہ ہمارے موجودہ اقتصادی نظام میں معیار زندگی میں مزید بلندی کی جا سکے۔ کہ محض آرام و آسائش کی خاطر طوائف بننے والیوں کے لئے سب سے بڑی کشش ختم ہو سکتی ہے یہ امر غور طلب ہے کہ آخری تجزیہ میں یہ ثابت کیا جا چکا ہے۔ کہ اقتصادی مشکلات نفسیاتی تناؤ کا دوسرا نام ہیں۔ ذہنی بوجھ، خواہ وہ کسی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو۔ غیر معمولی طرز عمل پیدا کرنے کی عام ترین وجوہات میں سے ایک ہے۔ اس طرز فکر کی رو سے یہ لازم ہو جاتا ہے۔ کہ ہر قسم کے تناؤ میں کمی کے لئے شدید کوشش ہی نہ کی جائے۔ بلکہ معاشرہ میں ایسی دلچسپیاں بھی موجود ہوں جو نفسیاتی مشکلات کے زمانہ میں فرد کو اپنی طرف راغب کر سکیں۔ ان طریقوں سے ہم اس مسئلہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتے کیونکہ ہر بالغ افراد کا کردار بچپن میں اخذ شدہ کرداری سانچوں کا مرہون منت ہے۔ اسی لئے طوائفیت کا مسئلہ اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے۔ جب ہم بچپن کے ان کرداری سانچوں کی ساخت میں تبدیلی کرسکیں۔ جو بالآخر کسی عورت کو یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہم کم از کم بچہ کی نشوونما اس انداز سے تو کر سکتے ہیں۔ کہ وہ بڑا ہو کر بالغانہ جنسیت کے تقاضوں سے عہدہ برا ہو سکے لیکن ایسا کرنے کے لئے بھی ہمیں بچوں کی جنسی تربیت میں انقلابی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔

یہ بالکل واضح ہے کہ والدین کو حقائق سے چشم پوشی کا طریقہ ختم کرنا ہوگا۔ اسی طرح بچوں کی جنسی تحریک کو دبانے کے اخلاقی طریقوں میں بھی تبدیلی کرنی ہوگی۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ بچوں کی تعلیم میں بھی آزاد روی اپنانی ہوگی۔ اس آزاد روی کا نقطۂ آغاز گھر بننا چاہیئے۔ لیکن والدین کو آزاد روی اختیار کرنے سے پہلے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں سے واقفیت کے لئے اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھنا ہوگا۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ گھریلو تربیت کی خامیوں کی قیمت بالغوں کے ابنارمل طرز عمل کی صورت میں ادا کی جاتی ہے۔

یہ درست ہے کہ طوائفیت کی تشکیل کرنے والے عناصر زیادہ تر داخلی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس لئے ماحول کے اثرات سے ان میں تغیر و تبدل کا امکان اتنا قوی نہیں لیکن پھر بھی اتنا مفروضہ ہے کہ ابتدائی تربیت میں خوشگوار تبدیلیوں سے نارمل اور ابنارمل کردار میں کچھ تو فرق ہو سکے گا۔ والدین اور اساتذہ کو یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیئے۔ کہ اگر بچوں کی نشوونما کے وقت ہم انہیں محبت کی مطلوبہ مقدار بہم نہیں پہنچا سکتے۔ تو ہمیں ان سے یہ توقعات بھی نہ رکھنی چاہئیں کہ وہ بڑے ہو کر وہ نارمل طریقہ سے محبت کر سکیں گے۔

جیسے کہ اس سے قبل بھی واضح کیا گیا تھا۔ طوائفوں کی انفرادی مثالوں کا علاج ہمارے مضمون کی حدود سے باہر ہے۔ لیکن پھر بھی مختصراً اس سلسلہ میں کچھ امور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ ایک عمومی اصول تو یہ ہے کہ طوائفیت پر منتج ہونے والی تمام نفسیاتی کشمکشیں ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس نقطۂ نظر کی رو سے طوائفیت جنسی انحراف کے ذیل میں آجاتی ہے۔ طوائفوں کی اصلاح کے لئے تحلیل نفسی سے لے کر القائی تک نفسی معالجہ کے کئی طریقے کامیابی سے آزمائے جا چکے ہیں۔ لیکن اعصابی خلل کی بیشتر اقسام کی مانند ان کا علاج اتنا آسان نہیں ہوتا۔

بسا اوقات علاج سے ٹھیک ہو جانے والی عورت دوبارہ طوائف بن جاتی ہے۔ تاہم نتائج مجموعیت ہمت افزا ہیں۔

ابتدائی صورتوں میں کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔ اسی طرح عنفوان شباب کے ہیجان خیز زمانہ میں مناسب راہنمائی سے کئی لڑکیاں طوائف بننے سے روکی جاسکتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کے لئے اپنائے گئے نفسیاتی طریقے اس صورت میں زیادہ ممد اور سودمند ثابت ہوتے ہیں۔ جب تربیت یافتہ سماجی کارکن اور نفسیات دان باہمی تعاون سے ماحول میں ایسے تغیرات لانے کی کوشش کرتے

ہیں۔ جن سے لڑکیوں کے لئے جذباتی اور ہیجانی لحاظ سے ایسا پس منظر مہیا ہو جاتا ہے۔ کہ بعد میں نفسیاتی طریق علاج سے وہ فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ نفسیاتی طریق علاج سے مجرمانہ طرز عمل اور طوائفیت میں جو گہرا رابطہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے ملک کے اہم نفسیاتی شفا خانوں میں برتی جانے والی ان تمام معالجاتی اور روک تھام کرنے والی تدابیر کو بروئے کار لانا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ ان نفسیاتی شفاخانوں کی طرف بالعموم اس وقت رجوع کیا جاتا ہے۔ جب وہ حقیقی زندگی میں کسی بحران یا غیر معمولی تناؤ سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس صورت میں وہ سماجی مطابقت کے لئے خدمات اور مشوروں کی طالب ہوتی ہیں۔ حالانکہ داخلی اور ذہنی بوجھ کی صورت میں ماہر نفسیات اور اس کے طریق کار لازمی اور ممد ثابت ہو سکتے ہیں۔

اختتام پر ہمیں یہ امر ذہن سے خارج نہ کر دینا چاہیئے کہ طوائف کی تعریف قانونی نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے اس لئے ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ طوائفیت میں کمی کے لئے وضع کئے گئے موجودہ قانونی ضوابط بھی کسی حد تک اسی کی نشوونما میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً جرمانہ کی سزا غیر عقلی اور احمقانہ ہے لڑکی بار بار وہی کچھ کرتی ہے جس سے پکڑے جانے کی صورت میں جرمانہ ادا کر کے وہ اپنی "جرائت رندانہ" کا ثبوت دیتی ہے۔ اسے قید کرنا عمر بھر کے لئے ایک "باعزت" پیشہ سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ پھر فیصلہ کرنے والے مجسٹریٹ عموماً طوائفوں سے اخلاقی نفرت و تحقیر کا انداز روا رکھتے ہیں۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے سزا کے بعد بھی عورت دوبارہ اس فعل کا اعادہ نہ کرے گی۔ کیونکہ ان کا کام تو قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا دہی ہے اور بس! ویسے بھی اخلاقی دباؤ علاج کا کامیاب طریقہ نہیں بلکہ اس مسئلہ سے متعلقہ حکام کو طوائفیت اور دیگر جنسی بے اعتدالیوں کو صرف شائستگی کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ قید و بند کارآمد نہیں جب بار بار سمجھانے اور تنبیہ کے بعد کوئی عورت طوائفانہ حرکات سے باز نہیں آتی۔ تو سمن بھیج کر اسے عدالت میں طلب کیا جائے یہ طلبی طوائف ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اس لئے کہ اس نے تنبیہوں کو نظر انداز کیا تھا۔ جب تک عدالتیں منطقی اور عقلی طریقوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان اخلاقی مسائل کے اصل ماخذات تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ اور ان بواعث کو دور کرنے کے لئے کچھ کرنے کو تیار نہیں اس وقت تک اخلاقی مباحث چھیڑنا محض تضیع اوقات ہے۔

لیکن ہم ایک مرتبہ ان مسائل میں الجھ گئے ہیں۔ جو نفسی معالجہ پر ہمارے اس مضمون کی حدود سے باہر ہیں۔ اس ضمن میں میں ماہرین سے بھی کچھ معروضات کرنا چاہتا ہوں۔ گو ماہرین بلاشبہ اس مسئلہ کی چھان پھٹک اچھے طریقے سے کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر ان کے اختیارات اور کچھ بھی نہیں۔

کسی لغت یا انسائیکلوپیڈیا کی مانند ماہر نفسیات سے وجوہات کے بارے میں فوری معلومات کے حصول کے لئے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا کام اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔ جس طرح استفادہ کے بعد کتاب الماری میں رکھ دی جاتی ہے۔ اس طرح ماہرین نفسیات انتظامیہ میں اپنی آمریت قائم نہیں کر سکتے۔ ایک شہری کی حیثیت سے وہ طوائفیت کے بارے میں جو نظریات بھی چاہے رکھ سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک اس مسئلہ کے حل کا تعلق ہے تو اس کے لئے اجتماعی کوشش سے سماجی ضمیر میں بیداری کی ضرورت ہے۔

ایمل نووک

عورت زندگی کے موڑ پر۔ اختتام حیض

ہم باآسانی یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ عورتوں کی اکثریت "تغیرِ حیات" کو عورت کی زندگی میں ایک نازک دور سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن اگر نازک دور سے بے حد خطرناک مراد لی جاتی ہو تو یہ قطعاً غلط ہے۔ یہ درست ہے کہ ادھیڑ عمری میں۔ اختتام حیض کے وقت۔ بعض بیماریوں مثلاً سرطان وغیرہ زیادہ تر ہوتے دیکھا گیا ہے۔ لیکن یہ مردوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے حالانکہ عمر کے اس دور میں ان کا حیض نہیں بند ہوتا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حیض کا بند ہونا یا تولیدی زندگی کا اختتام بذاتِ خود ایسے وقوعے نہیں جو دیوانگی۔ سرطان یا ایسے ہی امراض کا باعث بنتے ہوں۔ اختتام حیض ہر اس نارمل عورت کی زندگی کے ایک مخصوص دور کا عضویاتی وقوعہ ہے جو عمر کے اس دور تک پہنچنے کے لئے زندہ بچی۔

اب سوال یہ ہے کہ عمر کے کس دور میں اختتام حیض ہوتا ہے۔ اس کا دو ٹوک جواب نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس ضمن میں آغاز حیض سے بھی زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔ ہزاروں عورتوں سے فراہم شدہ اعداد و شمار کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اختتام حیض کے لئے اوسط عمر ۴۸ برس ہے۔ لیکن ۵۸ یا اس کے بعد تک بھی حیض آتا رہتا ہے۔ اسی طرح ۴۵ بلکہ چالیس برس سے پہلے بھی اختتام حیض دیکھا گیا ہے۔ سہولت کے لئے ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ نصف عورتوں کا اختتام حیض ۴۵ اور ۵۰ کے درمیان ایک چوتھائی کا ۴۵ سے پہلے اور باقی ماندہ ایک چوتھائی کا ۵۰ کے بعد ہوتا ہے۔

اس عام اصول سے قطع نظر ہمیں استثنائی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ بعض عورتوں کو غیر معمولی طور سے بہت دیر تک حیض آتا رہتا ہے۔ یا کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک مرتبہ اختتام حیض کے بعد۔ کچھ مدت گزرنے پر۔ دوبارہ اجرا حیض ہو جاتا ہے۔ ایسے وقوعات نارمل نہیں ہوتے۔ اور ایسی عورتوں کو فوراً طبی امداد حاصل کرنی چاہیئے۔

اس ضمن میں ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ جہاں ... بہت کم عمری میں۔ بیس سال سے بھی پہلے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حیض بند ہو جاتا ہے۔ اسے اختتام حیض کی قبل از وقت وقوع پذیری کہا جا سکتا ہے۔ ایسی عورتوں کی اکثریت میں غدودوں کی بے قاعدگیاں بیضہ دانیوں کی کارکردگی مجروح کر دیتی ہیں۔ گو یہ بے قاعدگیاں خطرناک نہیں ہوتیں۔ اور نہ ہی زندگی یا موت کا مسئلہ بن سکتی ہیں۔ لیکن پھر بھی ہر سمجھدار عورت کو اپنے یا اپنی بیٹی کے لئے طبی امداد کی طرف رجوع کرنے میں جھجک نہ محسوس ہونی چاہیئے۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ اختتام حیض کے دور میں کن نشانیوں اور علامات کی توقع کرنی چاہیئے۔ بلوغت کے جائزہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ آغاز حیض ان تمام وقوعات میں سے صرف ایک ہے۔ جو عمر کے اس ارتقاء پذیر دور میں عورت کے جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح اختتام حیض بھی مختلف اعضاء اور وظائف سے تعلق رکھنے والے مختلف النوع تغیرات میں سے ایک ہے۔ یہ تغیر نوعیت کا قرار دیا جا سکتا ہے۔

اختتام حیض عموماً ۴۸ برس کی عمر میں ہوتا ہے۔ لیکن جیسے کہ گذشتہ سطور میں وضاحت کی جا چکی ہے۔ اس سلسلہ میں عورتوں میں بے حد تنوع ملتا ہے۔ حیض کے وظائف دو طرح سے اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ بعض عورتوں کو ماہواری باقاعدگی سے آتی رہتی ہے۔ لیکن عمر کے کسی دور میں یہ اچانک ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر دوبارہ نہیں آتی۔ لیکن عموماً یہ اچانک نہیں بلکہ بتدریج ختم ہوتی ہے مثلاً ایک ماہواری رک گئی۔ اس کے بعد ایک یا بعض اوقات کئی ماہواریاں آتی رہیں۔ یہ سب عموماً نارمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد زیادہ طویل۔ بعض اوقات کئی ماہ کا۔ وقفہ پڑ جاتا ہے۔ ماہواری کے اجراء اور طویل وقفوں کا یہ سلسلہ سال دو سال تک چلتا رہتا ہے۔ اور پھر یہ بالکل ہی بند ہو جاتی ہے۔ عمر کے اس دور میں ماہواری کی یہ "دھوکہ دہی" بالکل نارمل سمجھی جانی چاہیئے۔

لیکن اختتام حیض میں "سیلاب خون" کے ضمن میں کیا کہا جائے۔ کیا اسے بھی نارمل سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اسے ایسا سمجھنے سے ہزاروں عورتیں اپنی جان گنوا بیٹھی ہیں۔ ہم یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ کثیر مقدار میں سیلان خون یا ماہواری کے درمیانی وقفہ میں آنے والا خون ہمیشہ کسی خرابی ہی کا باعث ہوتا ہے۔ اور عورت کے لئے کسی نہ کسی تکلیف کا پیش خیمہ۔ گو ایسی تکلیف عموماً زیادہ خطرناک نہیں

ہوتی۔ اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض صورتوں میں۔ کسی درد کے بغیر بھی ۔ یہ بالعموم سرطان کی نشانی ہوتی ہے۔

یہ زیادہ تر کسی ایسی بے قاعدگی کے باعث ہوتی ہے جس کا باآسانی علاج ہو سکتا ہو۔ مثلاً بعض اوقات بیرون کے اعضاء میں کسی طرح کی خرابی کے بغیر بھی بیضہ دانیوں کے وظائف میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ اسے وظائفی سیلان خون کہتے ہیں۔ اگر اس کا مناسب علاج کیا جائے تو ۱۰۰ فی صدی صورتوں میں اسے درست کیا جائے۔

بعض دیگر مثالوں میں کثیر خون کا مطلب کوئی رسولی بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے درمیان رحم جسے معمولی اپریشن سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی اور بھی ممکنہ وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب تک عورت کسی ماہر طبیب سے مشورہ نہ لے تو اسے ان کا کیسے علم ہو سکتا ہے؟ اس لئے اس معاملہ میں کسی قسم کا تساہل نہ برتنا چاہیئے۔

اختتام حیض کی اہم ترین علامات میں سے شدید گرمی کا محسوس ہونا ہے۔ عموماً اس کے ساتھ پسینہ بھی بکثرت آتا ہے۔ ان کا سلسلہ حیض کے اختتام سے کئی ماہ پہلے شروع ہو جاتا ہے لیکن ایسی عورتیں بھی ہیں جو اختتام کے کئی ماہ بعد تک یہ سب محسوس کرتی ہیں۔ گرمی کی یہ لہر عموماً چہرہ، گردن اور چھاتی کے بالائی حصہ کو متاثر کرتی ہے ان اعضاء کی جلد اچانک ہی سرخ ہو کر تمتما اٹھتی ہے بعض اوقات تو جلد ابلی ہوئی جھینگا مچھلی کے رنگ ایسی ہو جاتی ہے۔ عورت شدید گرمی کے ساتھ ساتھ دم گھٹنے کی کیفیت محسوس کرتی ہے۔ ان کے علاوہ بعض عورتیں تمام جلد میں گرمی اور جلن کی شکایت کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی کبھی کبھی بے حد پسینہ بھی آتا ہے۔ گرمی تو شاید برداشت ہو ہی جائے۔ مگر پسینہ سخت کوفت کا باعث بنتا ہے۔

گو یہ تمام علامات باعث کوفت ہوتی ہے لیکن اکثریت میں ان کا دوران یا شدت اتنی نہیں ہوتی۔ کہ اس سے بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے معقول عورتیں ان علامات کی عارضی نوعیت اور فطری پن کو جانتے ہوئے ان کا مذاق اڑاتی ہیں۔ یا کم از کم ان پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتیں۔ بالفاظ دیگر اختتام حیض کے عمل کے دوران ہی عورتوں کی اکثریت کو کسی طرح سے بھی طبی امداد کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ بہت کم عورتوں کے لئے یہ علامات واقعی باعث تکلیف ہوتی ہیں ان میں پندرہ بیس مرتبہ اور رات کو بھی کئی مرتبہ گرمی کی لہروں سے وہ دن رات کا سکھ چین گنوا بیٹھتی ہیں۔ ایسی صورت حال میں معالج مناسب تدابیر سے کام لیتے ہوئے آرام اور سکون دے سکتا ہے۔

اس ضمن میں عمومی اصول یہ ہے کہ اختتام حیض کے وقت عورت کی صحت جتنی بہتر اور نظام عصبی جتنا توانا ہوگا۔ اتنی ہی اسے کم تکلیف ہوگی۔ اس کے برعکس جس عورت نے بہت سے بچے جنم دیئے ہوں اور تمام عمر ان کی پرورش اور نگہداشت کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمہ داریوں اور مالی حالات کی پیدا کردہ تشویش کے چکر میں پھنس رہی ہو تو ایسی عورت کے اختتام حیض کے وقت زیادہ تکلیف اٹھانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان دونوں عمومی اصولوں میں استثنائی مثالیں مل سکتی ہیں۔

گرمی کی لہروں اور پسینہ کے ساتھ ساتھ اس وقت عورت بھی سر درد، سر کا چکرانا اور کم و بیش اعصابی اشتعال بھی محسوس کر سکتی ہے۔ ان سے اس میں چڑچڑاہٹ یا پژمردگی طاری ہو جاتی ہے لیکن عموماً یہ علامات اتنی نمایاں صورت اختیار نہیں کر جاتیں۔

بعض جاہل عورتوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے۔ کہ اختتام حیض ذہنی دیوانگی کا باعث بنتا ہے۔ لیکن یہ عقیدہ بے بنیاد اور غیر علمی ہے۔ یہ درست ہے کہ وراثتی یا طبعی رجحانات کی بنا پر ادھیڑ عمری میں دیوانگی ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔

واضح رہے کہ یہ مرد اور عورت دونوں ہی پر صادق آتا ہے۔ لیکن لوگ اس عام حقیقت کو نظر انداز کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بھی چالیس اور پچاس کی عمر کے درمیان کوئی عورت دیوانگی کا مظاہرہ کرے تو اسے بلا سوچے سمجھے "تغیر حیات" سے وابستہ کر دیا جاتا ہے جس میں یہ عقیدہ اپنی غرض ...

حقائق کے برعکس ہے۔ کبھی کبھار تو یہ پہلے سے متعین شدہ رجحانات کی تقویت کا باعث بن سکتی ہے۔ لیکن ذہنی بوجھ اور اعصابی عدم توازن یا کمزوری کا ہر دور ہی یہ سب کچھ کر سکتا ہے اس کا یہ مطلب یہ ہوا کہ بعض مخصوص عورتوں میں جب دیوانگی کے موروثی رجحانات موجود ہوں۔ تو اختتام حیض۔ وہ بھی زیادہ شدید ہونے کی صورت میں۔ پہلے سے موجود رجحانات کے لئے باعث تقویت ہو کر کمر توڑنے والا آخری تنکا بن جاتا ہے۔ یہ حقائق اس عام عقیدہ کے بالکل منافی ہیں۔ کہ اختتام حیض بذات خود ہی دیوانگی کا موجب بنتا ہے۔

میں نے یہ سب کچھ اس لئے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ کہ کئی سال پہلے کے ایک واقعہ نے مجھے یہ سبق دیا تھا۔ کہ انسانی تشویش اور نفسیاتی خوف میں سے زیادہ عام اور پریشان کن دماغی توازن ختم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ایسے غلط خیالات کی بناء پر ادھیڑ عمر کی عورتوں میں یہ اندیشہ اور بھی زیادہ شدید صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک سمجھدار معالج اگر ذہنی پریشانی کی شکار عورت کو ایسے واہموں سے نجات دلا سکے تو وہ گویا اس کے لئے قابل قدر خدمت سرانجام دیتا ہے ایسے غلط خیالات ذہن میں مضبوطی سے جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ اور بےچاری عورتیں ایسے خیالات کی بناء پر شدید دکھ اور ذہنی پریشانی کی تکلیف اٹھاتی ہیں۔ اس کے ذہن سے ایسے باطل اور گمراہ کن خیالات نکالنے کے لئے سب سے بہتر طریقہ ہے کہ سیدھے سادے الفاظ میں دیانتداری سے تمام معاملہ سمجھا دیا جائے بلکہ ایسی تسلی آمیز گفتگو کا ملاقاتوں کی صورت میں ایک سلسلہ۔ مناسب وقفہ سے۔ چھیڑ دینا زیادہ سودمند ثابت ہوتا ہے۔ اگر ایک دفعہ وہ معالج پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی پریشانیاں بتا کر ذہن کا بوجھ ہلکا کر لے تو وہ ذہنی صحت کی منزل کی طرف گامزن ہو جاتی ہے۔ ادھر معالج کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ ایسے معاملات میں ہر ممکن ہمدردی کا اظہار کرے اس کے اوہام کا مذاق اڑانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مریضہ کو تو ان کی حقیقت پر یقین ہے اس لئے ایسا طرز عمل فائدہ کی بجائے نقصان کا باعث ہوگا۔

علاوہ ازیں عمر کے اس دور میں بعض اور بھی معمولی قسم کی شکایات لاحق ہو جاتی ہیں۔ مثلاً بے خوابی قبض یا پھر کبھی کبھار دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسی علامات شاذ ہی شدید تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔ اور طبی علاج سے ان پر باآسانی قابو پایا جا سکتا ہے۔

میں نے اگر اختتام حیض سے وابستہ ان تمام علامات وعوارض کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے تو اس کا مطلب نہیں کہ تمام عورتیں ہی یہ سب کچھ محسوس کرتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عورتوں کی اکثریت اختتام حیض کے دور سے معمولی سی تکلیف کے بغیر ہی نکل جاتی ہے۔ اور انہیں کبھی طبی امداد کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

بعض عورتوں کے لئے کسی سمجھدار معالج کی معقول اور دانشمندانہ گفتگو ہی کافی ثابت ہوتی ہے مثلاً پریشانی اور ذہنی بوجھ سے کیسے بچنا چاہیئے۔ یا پھر انداز زیست کے بارے میں عمومی تجاویز بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ کچھ عورتوں کو اعصابی سکون یا جسمانی توانائی کے لئے ادویات وغیرہ کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اب باقی بہت ہی تھوڑی سی تعداد میں ایسی عورتیں رہ جاتی ہیں۔ جنہیں مخصوص نوعیت کی طبی امداد درکار ہو انہیں بیضہ دانیوں کے بعض غدودی مادے دیئے جاتے ہیں۔ ان کے مناسب استعمال سے مکمل آرام نہ ہونے پر بھی خاصا افاقہ ہو جاتا ہے۔

جب کوئی معالج اتنی سمجھ بوجھ اور ذہانت رکھتا ہو کہ وہ اپنے مشوروں کو معلوماتی رنگ دینے کے ساتھ ساتھ حفظ ماتقدم کا ذریعہ بھی بنا سکتا ہو۔ جب وہ ایسے امور کی وضاحت کے لئے وقت خرچ کرنے سے دریغ نہ کرتا ہو۔ اور جب وہ مریضہ کو مستقبل میں راہنمائی کے لئے ہدایات دیتے وقت غیر معمولی مقدار میں سیلان خون سے اہم نتائج کے بارے میں تنبیہ بھی کرتا ہو تو وہ اپنی فیس اس مد میں ... کے ... مریضہ کے لئے ایک نسخہ گھسیٹ مارتا ہو۔ کہیں زیادہ محنت اور ... سے ... ہے ... مریضہ ... اس طرح سے حاصل شدہ معلومات کو اپنے ذہنی

سکون کا ذریعہ بناتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے یہ معلومات اور ان سے پیدا کردہ ذہنی سکون ہی اس کے لئے حیات بخش ثابت ہوں اگر معالج اپنی مریضہ کا اس طریقہ سے اعتماد حاصل کر لیتا ہے تو وہ ظہور ہونے کے علاوہ اس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرتی ہے۔

معالجوں سے ادھیڑ عمر کی مریض خواتین کی اکثریت بالعموم یہ سوال پوچھا کرتی ہے کہ کیا وہ عمر کے اس حصہ میں بہت زیادہ موٹی ہو جائیں گی۔ تمام عورتوں کا تو نہیں لیکن اکثریت کا عمر کے اس دور میں کچھ وزن بڑھ جاتا ہے۔ وہ عورت جو اس سے پہلے تیلی دبلی تھی اب اس کے کولہوں کی گولائیاں بھر جاتی ہیں اور شکم پر چربی کی تہہ گہری ہو جاتی ہے۔ یوں وہ موٹی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن عورتوں کی قلیل تعداد کی صورت میں اس کثرت سے بڑھتا ہے کہ وہ واقعی موٹی ہو جاتی ہیں۔ ایک سال میں چالیس پچاس پونڈ بلکہ اس سے بھی زیادہ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کولہوں سرین اور شکم پر چربی کی تہہ پر تہیں چڑھتی جاتی ہیں۔ اور پیٹ پر تو اتنی چربی چڑھ جاتی ہے کہ وہ حاملہ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اگر اسی دوران میں ماہواری میں بے قاعدگی پیدا ہو جائے۔ تو یہ خیال اور بھی تقویت پا سکتا ہے بلکہ نسوانی امراض سے تعلق رکھنے والے معالجین کے پاس ایسی بہت سی ادھیڑ عمر کی عورتیں آتی رہتی ہیں جو ایک آدھ ماہواری نہ آنے اور پیٹ پر چربی چڑھ جانے سے خود کو حاملہ سمجھتے ہوئے معالج سے رجوع کرتی ہیں۔ تاکہ وہ یہ بتا سکے کہ وہ واقعی حاملہ ہیں یا نہیں۔

بعض اوقات وہ حاملہ ہوتی ہیں۔ اور بعض اوقات نہیں۔ لیکن جلد ہی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر فوری طور سے نہ بھی پتہ لگ سکے تو کچھ وقفہ کے بعد صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بعض عورتیں اختتام حیض کے عبوری دور میں حاملہ ہو کر سخت متعجب ہوتی ہیں۔ یہ تعجب اس وقت اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ جب اس کا سب سے چھوٹا بچہ خاصہ بڑا ہو۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے۔ کہ ایسی عورتیں مانع حمل تدابیر پر مدتوں سختی سے کاربند تھیں لیکن اس دور میں ان تدابیر سے اس بنا پر پہلو تہی برتنے لگتی ہیں۔ کہ اب قیام حمل کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔ یہ خیال عموماً خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض بیضیوں کا اخراج حیض کی مدت تک ہو سکتی ہے۔ اور اسی صورت میں بار آوری کا خطرہ کبھی بھی کم نہیں ہوتا۔ اور ادھیڑ عمری کے بہت سے حمل ایسی غلط فہمیوں کا نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس مثالوں میں گو حیض باقاعدگی سے آتا رہتا ہے۔ لیکن بیضہ دانیاں بیضیوں کا اخراج بند کر دیتی ہیں۔ اس لئے احتیاطی تدابیر کی عدم موجودگی میں بھی قیام حمل نہیں ہوتا۔ لیکن خصوصی امتحانات کے بغیر۔ کوئی معالج یا عورت یہ نہیں جان سکتی کہ اس کی بیضہ دانیاں کس حالت میں ہیں۔ اسی لئے بچوں سے بچنے والی عورتوں کو اپنے اطمینان کے لئے تولیدی زندگی کے ابتدائی دور کی مانند تولیدی زندگی کے اس اختتامی دور میں بھی مانع حمل تدابیر کو مستقلاً استعمال کرتے رہنا چاہیئے۔

اختتام حیض کے وقت بیضہ دانیوں کی کارکردگی ختم ہو جانے سے تولیدی اعضاء کے سکڑنے سے ان کا حجم گھٹ جاتا ہے۔ خود بیضہ دانیاں بھی پہلے کی نسبت بہت چھوٹی ہو جاتی ہیں۔ یہی حال بچہ دانی کا ہے جو پہلے سے گھٹ کر نصف بلکہ اس سے بھی چھوٹی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مہبل کے اندرونی حصے پتلے ہو کر بدرنگ ہو جاتے ہیں۔ ان میں ہلکی سی سوزش یا اشتعال سا بھی ہو جاتا ہے بعض اوقات ان سے رطوبت بھی بہتی ہے۔ جس سے اکثر عورتوں کو بہت کوفت ہوتی ہے پستانی غدود بھی انحطاط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گو موٹاپے کے باعث چھاتیاں بڑی بڑی نظر آتی ہیں۔

بعض اوقات چھاتیوں میں گٹھلیاں سی پڑ جاتی ہیں۔ یہ خطرناک ہیں۔ اور انہیں ہر ممکن طریقہ سے روکنا چاہیئے۔ کیونکہ اکثر ادھیڑ عمر عورتوں میں چھاتی کا سرطان ان ہی کے باعث معرض وجود میں آتا ہے۔

گو بیضہ دانیوں کی کارکردگی ختم ہونے سے اختتام حیض وقوع پذیر ہوتا ہے لیکن لوقت ضرورت فیصلہ کم عمر عورتوں کی بیضہ دانیاں نکال دینے سے بھی اختتام حیض ہو جاتا ہے۔ ایسا اختتام حیض فطری نہیں بلکہ طبی یا مصنوعی اختتام حیض ہوتا ہے یہاں اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ تقریباً ہر سمجھدار اور تجربہ کار سرجن اپریشن کرتے وقت اول تو دونوں بیضہ دانیوں میں سے کسی ایک کو بچانے کی ضرور کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو کم از کم ہر بیضہ دانی کا کچھ نہ کچھ حصہ تو ضرور ہی بچانے کی سعی کرتا ہے۔ ایسا ان عورتوں کی صورت میں کیا جاتا ہے جو ابھی بچے پیدا کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں۔ گو رحم نکالتے وقت بیضہ دانیوں کو بچانے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی یہی قاعدہ ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

موخر الذکر کی ورم والی رسولیوں کے علاج میں ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح جب سوزش پیدا کرنے والے عوارض سے بعض نالیاں تباہ ہو جائیں۔ تو بھی اس کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ یہ عورتوں کے عام عوارض میں سے ہے۔ بچہ دانی نکال دینے سے حیض نہیں آ سکتا کیونکہ سیلان خون کا منبع یہی عضو ہے۔ اگر دونوں بیضہ دانیاں موجود ہوں پھر بھی بچہ دانی کی عدم موجودگی میں حیض نہیں آ سکتا۔

اسی طرح اگر بچہ دانی موجود ہو لیکن دونوں بیضہ دانیاں نکال دی جائیں تو بھی حیض بند ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو حیض بچہ دانی سے آتا ہے لیکن بیضہ دانیاں وہ مادہ پیدا کرتی ہے۔ جن سے حیض کا اجراء ہوتا ہے۔ اس لئے کم عمر عورتوں کو بچہ دانی اور ایک یا دونوں بیضہ دانیوں کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ایک بیضہ دانی اور دوسری کے وظائف کی تکمیل کر سکتی ہے۔ بلکہ اس کا معمولی سا حصہ بھی دونوں کی کارکردگی کی نمائندگی کر سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات رسولی یا پیپ والے پھوڑے دونوں بیضہ دانیاں اتنی خراب کر دیتے ہیں کہ انہیں نکالے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

کم عمر یعنی ۲۵ اور ۳۰ سال کے درمیان کی عورتوں میں ایسے اپریشن کا مقصد اختتام حیض ہوتا ہے اسی مقصد کے حصول کے لئے اعضاء میں وہی حالت پیدا کی جاتی ہے۔ جو بیضہ دانیوں کی کارکردگی کی موقوفی پر ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے۔ کہ یوں اختتام حیض قبل از وقت اور اچانک ہوتا ہے۔ ایسا ہونے پر عورت کو یہ باور کر لینے کی کوئی ضرورت نہیں کہ اب وہ "لاجنس" ہو گئی ہے یعنی اب نہ تو اسے حیض ہوگا۔ اور نہ ہی وہ بچے پیدا کر سکے گی۔

جہاں تک موخر الذکر کا تعلق ہے۔ تو اسے اس بارے میں کوئی افسوس نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جس بیماری سے چھٹکارا پانے کے لئے بیضہ دانیاں نکالی جاتی ہیں۔ وہ عموماً حمل ناممکن بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اسی طرح اسے اپنے ذہن سے یہ خوف نکال دینا چاہیئے کہ اس کی جنسی زندگی ختم ہو گئی ہے۔

بعض اوقات اس طرح کے قبل از وقت اختتام حیض سے نارمل عمر میں ظاہر ہونے والے وقفہ کی نسبت زیادہ تکلیف دہ علامات ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن بعض صورتوں میں نارمل اختتام حیض ہی کی مانند۔ بہت کم یا برائے نام علامات کا ظہور ہوتا ہے۔ موخر الذکر صورت میں ظاہر ہونے والی علامات ہمیشہ عارضی ہوتی ہیں۔ مگر ان کے دوران کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ مہینوں کی غیر معینہ تعداد سے لے کر بعض اوقات سالوں پر محیط ہوتی ہیں۔ اختتام حیض کی علامات کے سلسلہ میں جو عمومی باتیں اس سے پہلے کی جا چکی ہیں۔ وہ ان پر بھی منطبق ہوتی ہیں۔

اگر سرجن بیضہ دانی کی کوئی صحت مندانہ نسیج بچا سکے تو اختتام حیض کی علامات یا تو وقوع پذیر ہونے سے روکی جا سکتی ہیں۔ ورنہ ان کی شدت میں خاصی کمی کی جا سکتی ہے۔ بلکہ بچہ دانی نکال لینے کے نتیجہ میں حیض کے بند ہو جانے پر بھی یہ سب کچھ ہو سکتا ہے

یہاں اس امر کی مزید وضاحت کر دی جائے کہ بیضہ دانیوں کی موجودگی اور رحم نکال دینے پر بھی عارضی نوعیت کی کچھ تکلیف ضرور ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بیضہ دانیوں اور رحم

ڈکال دیے پر بھی عارضی نوعیت کی کچھ تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیضہ دانیوں اور رحم میں پراسرار قسم کی ہم آہنگی پیدا کرنے والا کوئی تعلق ضرور ہے۔ اس لئے جب بھی ہم آہنگی کے توازن میں خرابی ہو تو کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ بیضہ دانیوں کے نکالے جانے کے برعکس ان حالات میں ظہور پذیر ہونے والی علامات بالعموم شدت میں بہت ہلکی ہوتی ہیں۔ یا بعض اوقات سرے سے ناپید ہوتی ہیں۔

آج کل ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ایکسرے یا ریڈیم کے ذریعہ حیض ختم کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب سرطان یا ورم والی رسولیوں کا شعاؤں سے علاج ہو رہا ہو تو حیض کا ختم ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر علاج کا کوئی اور طریقہ مطلوبہ حد تک کام دے سکے تو پھر کم عمر عورتوں کے لیے حیض ختم کرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بعض اوقات جریان خون کے بارے میں کچھ بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ایسی صورت میں چالیس سال تک نہ پہنچنے والی عورتوں میں اس طریقہ سے خون کا بند کرانا لازمی ہو جاتا ہے۔ اسی طریقہ میں ایکسرے اور ریڈیم کی شعاعیں بیضہ دانیوں کے حویصلات کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہیں اور ان سے نسائی ہارمونز کی پیدائش رک جاتی ہے۔

یوں بیضہ دانیوں کی کارکردگی ختم کر کے جب اختتام حیض پیدا کیا جاتا ہے تو نارمل یا طبعی اختتام حیض سے وابستہ تمام تکلیف دہ علامات ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

بلحاظ نوعیت یہ تکلیف دہ اور طویل مدت تک محیط بھی ہو سکتی ہیں۔ بعض اوقات ان کی شدت بہت کم ہوتی ہے۔ جب کہ کبھی کبھار ان کا احساس تک بھی نہیں ہونے پاتا۔ لیکن ان تمام صورتوں میں تکلیف عارضی ہوتی ہے۔ اور معالج مختلف النوع طریقوں سے مریضہ کی تکلیف میں ایک حد تک کمی کر سکتا ہے۔

اختتام حیض کی احتیاط وغیرہ کے سلسلہ میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مفروضہ خطرات کے بارے میں اکثر عورتوں کے ذہن میں غلط اور جاہلانہ خیالات جڑ پکڑ چکے ہیں۔ اس لئے اکثریت کی صورت میں سب سے اہم کام انہیں یہ سمجھانا ہے کہ اختتام حیض کیا ہے۔ اور بالخصوص اس میں کیا کچھ نہیں ہے۔ یوں عورت کی تسلی ہو جائے گی۔ اور یہ علم ہو جائے گا کہ اسے کس بات کی توقع کرنی چاہیے۔ اور کس سے خوفزدہ نہ ہونا چاہیے۔ ان مشوروں کے دوران میں یہ بھی سمجھایا جا سکتا ہے کہ اسے ہر ممکن طریقہ سے پریشانی سے بچتے ہوئے اپنے مخصوص حالات کے تحت زیادہ سے زیادہ مطمئن اور پرسکون زندگی گزارنے کی ضرورت ہے۔ بعض صورتوں میں اعصابی سکون کے لئے ادویات مزید افادہ بخش ثابت ہوتی ہیں۔

کچھ تھوڑی تعداد کی ایسی عورتیں بھی ہیں۔ جنہیں گرمی کی لہر اور پسینہ اس شدت سے آتا ہے کہ ان کا جینا اجیرن ہو جاتا ہے۔

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ علامات بیضہ دانیوں کے ایسٹروجین ہارمون میں کمی کے باعث ظاہر ہوتی ہیں۔ شفاخانوں میں استعمال کے لئے یہ ہارمون دستیاب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے استعمال سے ان علامات کو کلیتہ ختم یا ان کی شدت میں خوشگوار حد تک کمی کی جا سکتی ہے۔ یہ علاج انجکشن اور گولیوں دونوں صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کا زیادہ استعمال بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کسی معالج کے مشورے اور نگرانی کے بغیر یہ کبھی بھی استعمال نہ کرنی چاہیے۔

DEVIATION انحراف
SCHIZOPHRENIA انشقاق ذہن
FERTILIZATION بارآوری
UTERUS بچہ دانی
LABIA MAJORA بڑے لب
CLITORIS بظر
PUBERTY بلوغت
NIPPLE بھٹنی
EXTEROVERSION بیروں بینی
EXOGAMY بیرون کنبہ ازدواج
OVUM بیضہ
OVARY بیضہ دانی
OVIDUCT بیضہ دانی کی نالیاں
OVULATION بیضین
INTERSTITIAL-CELL بین رخنی خلیہ
FATHER FIXATION پدرانہ وابستگی
PATERNITY, FATHERHOOD پدریت
PATRIARCHAL پدری سربراہی
HYMEN پردہ بکارت
DEPRESSION پژمردگی
PELVIS پیڑو
IMPULSE تحریک
TABOO تحریم
INCEST تحریم محرمات
PSYCHO-ANALYSIS تحلیل نفسی
SPERM تخم
CATHERSIS تزکیہ
INCEST تزویج محرمات
VAGINISMUS تشنج المہبل

MENARCHE آغاز حیض
CASTRATION آختگی
SADISM (سادیت) آزارپسندی
PLACENTA آنول نال
EROTOGENIC-ZONES اطلاعات شہوانیت
GUILTFEELING احساس جرم
MENOPAUSE اختتام حیض
INTERCOURSE اختلاط
HYSTERIA اختناق الرحم
EXCRETION اخراج (بول وبراز)
SUBLIMATION ارتفاع
MASOCHISM (ماسوکیت) اذیت کوشی
MYTHOLOGY اساطیر
METABOLISM استحالہ
PLEASURESUCKING استلذاذی چوسنا
SECRETION افراز
SUGGESTION القا
NEUROSIS اعصابی خلل
PRIMATES اعلیٰ ذوات الثدی
PROCESSES اعمال
INHIBITION. امتناع
EGO انا
EGO IDEAL انائی معیار
DISPLACEMENT, TRANSFERENCE انتقال
EJACULATION انزال
SCHIZOID PERSONALITY انشقاقی شخصیت
ID اید
ERECTION ایستادگی
ESTROGENS ایسٹروجینز